(تذکرے اور خاکے)

از

استاذ العلما

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

(آمد: ۱۹۲۳ء وفات ۲۰۱۲ء)

ناشر

شعبہ نشر و اشاعت

مدرسہ دار العلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی ضلع مئو یوپی

9450536786-9839985670

بزمِ کہن

(تذکرے اور خاکے)

از

استاذ العلما حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی

(آمد: ۱۹۲۳ء وفات ۲۰۱۲ء)

ترتیب

محمد عرفات اعجاز اعظمی

ناشر

شعبہ نشر واشاعت

مدرسہ دار العلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی ضلع مئو یوپی

9450536786-9839985670

نام کتاب:
بزم کہن (تذکرے اور خاکے)
تصنیف:
استاذ العلما حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی
ترتیب:
محمد عرفات اعجاز اعظمی
باہتمام:
مولانا ڈاکٹر محمد رشاد صاحب قاسمی
طبع اول: ۲۰۱۷ء
صفحات: ۲۹۶
قیمت: ۲۵۰
ناشر:
شعبہ نشر واشاعت: مدرسہ دار العلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی ضلع مئو یوپی
9450536786-9839985670
برقی پتہ: arfatazmi89@gmail.com

تقسیم

☆ مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری، چھپرا، چریاکوٹ، ضلع مئو 9936029463
☆ مکتبہ ضیاء الکتب محلّہ اتراری خیرآباد ضلع مئو 9235327576
☆ مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم کرتھیا مہراج گنج 9170439388

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

حضرت مولانا جوہرؔ قاسمی کے عزیز شاگرد
اوران کے جوہر گراں مایہ کے پرتو
حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب کے
نام

فہرست مشمولات

❑❑❑

پیش لفظ

مولانا ڈاکٹر محمد عمار قاسمی صاحب
حفید رشید حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نوراللہ مرقدہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک جید عالم دین، میدان صحافت کے مرد مجاہد، حق گوئی کے پیکر، سینکڑوں ہزاروں علما کے استاذ و مربی تھے۔

میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جس ہستی کو علمی دنیا میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، میں اس نامور عالم دین مولانا جوہر قاسمی کا پوتا ہوں۔ حضرت مولانا نہ صرف میرے دادا تھے بلکہ میرے مربی و مشفق استاذ بھی تھے۔ ایک پوتا ہونے کی حیثیت سے مجھے دادا میاں کو بہت قریب سے دیکھنے اور خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ دادا میاں کی زندگی کے وہ گوشے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں، ان کا تذکرہ میں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو مجلّہ 'سراج الاسلام' کی خصوصی اشاعت بیاد حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی میں شائع ہوا ہے۔

دادا میاں کو ہم سے بچھڑے ہوئے تقریباً چار سال سے زائد ہو چکا ہے لیکن ان کی یادیں اور ان کی باتیں آج بھی ذہن میں تر و تازہ ہیں۔ دادا میاں کے آخری سفر میں شامل نہ ہونے کا ملال تاعمر رہے گا۔ دادا میاں کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو روشن و تابناک تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ عالم دین، مفسر قرآن، محدث اور بے باک قلم کے

مالک تھے۔صاحب اسلوب انشا پرداز، ماہر تعلیم ،بہترین مدبر و دانشور بھی تھے۔دادا میاں کا کمال یہ تھا کہ وہ درسیات،تصنیف وتالیف، مسند اہتمام اور مقامی وملکی تمام ذمہ داریوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے اور رکاوٹوں اور صعوبتوں کے باوجود آخری عمر تک سرگرم سفر رہے۔

دادا میاں حقیقی معنوں میں 'لا یخـاف لـومة لائم' کے مصداق تھے۔حق بولتے ،حق لکھتے اور حق گوئی کی ہمیشہ تلقین کرتے رہے۔سامنے کوئی بھی سپر پاور ہو، جسے حق سمجھا اس کا اظہار کیا۔نہ ستائش کی تمنا رکھی، نہ صلہ کی پرواہ کی اور نہ تبصروں اور طعنوں کو خاطر میں لائے۔دادا میاں ایک ایسی چٹان تھے جس نے آخری سانس تک بہت سے فتنوں کو روکے رکھا۔اللہ تعالی نے انھیں اس قدر مضبوط اعصاب عطا فرمائے تھے کہ آدمی تصور کرکے ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ملکی و ملی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے۔

دادا میاں کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا۔دہلی، گورکھ پور، مدراس،حیدرآباد، ممبئی، لکھنؤ،غرض ہندوستان کا شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں دادا میاں کے قدم مسائل کو سلجھانے کے لیے نہ پڑے ہوں۔اللہ نے دادا میاں کو ایسی اولوالعزمی، ایسی ہمت اور حوصلہ دیا تھا کہ رشک آتا تھا۔ہم جوان ہو کر تھک جاتے تھے مگر وہ عمر کے آخری پڑاؤ میں بھی عزم واستقلال کا استعارہ بنے رہے۔

دادا میاں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابر سے کسب فیض کیا تھا۔اسلاف واکابر کے سے مزاج واوصاف پائے تھے۔وہ قدسی نفوس قافلہ کے ایک فرد تھے۔دادا میاں کے مسلک میں شاہوں کو سلامی روا نہ تھی۔نہ بدلتے ہوئے موسموں اور نت نئے رنگوں میں ڈھل جانا انھیں گوارا تھا۔اکابرین دیوبند سے جو میراث انھیں ملی تھی اس میں کسی طرح کی مداہنت انھیں گوارا نہیں تھی۔آخری سانس تک جسے حق سمجھا اسے ڈنکے کی چوٹ پر بیان کیا اور جو موقف اپنایا اس پر سر اٹھا کر کھڑے رہے، جو راستہ چنا اسی پر چلتے چلے گئے۔زمانہ وحالات ان پر اثر انداز نہیں ہوسکے۔

زیر نظر کتاب ''بزم کہن'' مختلف اوقات میں دادا میاں کے قلم سے نکلے ہوئے اکابر و اسلاف اور معاصرین کی سیرت وسوانح پر مقالات کا مجموعہ ہے جو متعلقہ شخصیت کے ظاہری و باطنی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے۔اسلاف کی تاریخ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت ونصیحت،موعظت و

بصیرت کا بہترین ذریعہ اور سمت سفر کو درست کرنے میں عمدہ معاون ہوتی ہے۔اور پھر اسلاف کے حالات میں بعد میں آنے والوں کے لیے حددرجہ تاثیر اور خاص قسم کی جاذبیت اور کشش ہوتی ہے، جو ہم جیسے کم ہمتوں کے لیے ہمت وحوصلہ کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔

'بزم کہن' کا اصل مقصد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت وعظمت اور ان کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اولیاء اللہ کے واقعات کو پڑھ کر اور سن کر طبیعت میں ایک جذبۂ شوق بیدار ہوتا ہے اور ولولہ وجستجو کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمیں بھی اپنے اکابر کی طرز زندگی اختیار کرنی چاہیے۔باری سبحانہ تعالی نے اپنی مقدس کتاب قرآن کریم میں جابجا انبیا واولیا کے واقعات وحالات بیان کیے ہیں اور بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں"لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الابصار" بے شک ان واقعات میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے۔

میرے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ میری پرورش اس خاندان میں ہوئی ہے جس کا کوئی نہ کوئی فرد ہر دور میں اسلام کی حفاظت اور اسلام کی اشاعت کے ہمیشہ سربکف رہا ہے۔ سرفہرست جدامجد حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی مرید حضرت فضل رحمان گنج مرادآبادی ہیں جنھوں نے شیعوں سے مقابلہ کرکے ایوان اودھ کو ہلا کر رکھ دیا اور اسلام کا جھنڈا بلند کیا۔دادا میاں کے بڑے بھائی مولانا ضیاء الحق قاسمی جو مسلمانوں کی عزت وحرمت کی حفاظت کے لیے جیل جانے کو ترجیح دی مگر اپنے دینی فریضہ سے پیچھے نہیں ہٹے۔

دادا میاں جو شیخ الاسلام حضرت مدنی کی فوج کے سپاہی تھے، درس وتدریس، تصنیف وتالیف کے ذریعے ہزاروں افراد تیار کیے جو ہر محاذ پر اسلام کی حفاظت کو اپنا فریضہ سمجھ کر ڈٹے ہوئے ہیں۔

والد محترم مولانا ڈاکٹر محمد رشاد صاحب جو دادا میاں کی سرپرستی میں تعلیمی مشن کو آگے برھاتے ہوئے رگھولی جیسی بنجر زمین پر اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے تین ادارے قائم کیے ہیں جو آب وتاب کے ساتھ دینی وعصری علوم کو پھیلانے کا وسیلہ بن رہے ہیں اور قریب وبعید ہر جگہ کے طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کررہے ہیں۔

دادا میاں کی تحریریں مختلف رسائل و جرائد کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔ان شاءاللہ اگلے مرحلے میں ان کو یکجا کر کے کتابی شکل میں افادہ عام کے لیے شائع کیا جائے گا۔دادا میاں کی اگلی کتاب ان شاءاللہ ان کا شعری سرمایہ ''کلیات جوہؔر'' کے نام سے ہوگی۔دادا میاں کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جو بھی ممکن کوشش ہوگی ان شاءاللہ اس سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔

اخیر میں یہ خاکسار دست بدعا ہے کہ اللہ رب العزت دادا میاں کے فیوض و برکات کو عام و تام فرمائیں۔اور ان کی جملہ دینی خدمتوں اور کاوشوں کو حسن قبول سے بہرور فرمائیں۔نیز اس ناچیز کو بھی اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین

احـــب الــصـــالــحيــن ولســـت مـنهــم
لـــعـــل الـــلـــــه يــرزقــنــى صــلاحـــاً

❑❑❑

تعارف نامہ

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی (م:۲۰۱۲ء) نے ۱۹۲۳ء میں اپنے وطن رگھولی ضلع اعظم گڑھ میں آنکھیں کھولیں۔آپ کے والد کا نام مولانا امین الحق قاسمی اور جد محترم اس زمانہ کے مشہور صوفی بزرگ حاجی عبدالرحیم فضلی ہیں۔حاجی عبدالرحیم صاحب کو بیعت کا شرف حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی سے حاصل تھا اور خلافت مولانا فضل رحمان صاحب کے خلیفہ و داماد مولانا عبدالکریم صاحب پنجابی سے حاصل تھی۔حاجی صاحب نے طویل عمر پائی اور ۱۳۸۷ھ میں رگھولی میں وفات پائی۔حاجی صاحب کی زندگی عجیب تنوعات اور رنگارنگی سے معمور ہے جس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں حاجی کے تذکرہ میں ملے گی۔

مولانا جوہر قاسمی نے ابتدائی پرائمری کی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی،اس کے بعد ۱۹۳۰/۲۹ء میں فیض آباد چلے گئے جہاں ان کے جد محترم مستقل اقامت گزیں تھے۔اور کافیہ تک کی تعلیم مولانا ضرغام الدین صاحب مظفرنگری (شاگرد حضرت شیخ الہند) سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم مئو آ گئے اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء کا عرصہ یہاں گزارا۔۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں حضرت شیخ الاسلام سے بخاری شریف کا درس لیا اور سند فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد علم تفسیر کے شوق نے مہمیز کیا تو اس کے لیے اس زمانہ کے مشہور مفسر مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے در دولت پر لاہور حاضری دی اور ان سے تفسیر کا علم سیکھا۔

مولانا نے تدریس کی ابتدا جامع العلوم جین پور اعظم گڑھ سے کی اور ایک سال وہاں تدریس کے مشغلہ میں گزارا۔اس کے بعد ۱۹۴۳ء کے اخیر میں نورالعلوم بہرائچ گئے اور ۱۹۴۹ء تک وہاں رہے۔پھر ۱۹۵۰ء میں مدرسہ فرقانیہ میں بحیثیت مہتمم تشریف لے گئے اور ۱۹۶۷ء تک

وہاں رہے۔مولانا فرقانیہ میں اگرچہ مہتمم بنا کر بلائے گئے تھے مگر وہاں انھوں نے صرف اہتمام ہی نہیں کیا بلکہ درس وتدریس سے بھی سروکار رکھا اور متوسطات وعلیا کی انتہائی کتابیں ان سے متعلق رہیں۔مولانا کی زندگی کا سب سے لمبا تدریسی پڑاؤ یہی ہے۔یعنی سترہ سال۔فرقانیہ سے اٹھنے کے بعد پھر سوائے دارالعلوم گورکھ پور کے کسی مدرسہ میں اتنی لمبی مدت نہیں گزاری۔

فرقانیہ کے بعد عارضی طور پر کچھ دنوں دارالعلوم مئو میں رہے،اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں بحیثیت مہتمم مدرسہ امدادالعلوم میرٹھ گئے اور ایک سال وہاں رہے۔پھر ۱۹۶۹ء میں مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے بلائے گئے اور ۱۹۷۱ء تک امروہہ میں قیام پذیر رہے۔اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے جمعیۃ علمائے ہند سے متعلق ہوگئے۔۱۹۷۲ء میں بحیثیت صدر مدرس دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد گئے اور وہاں دوسال سے کچھ کم مدت گزاری، پھر مدرسہ انوارالعلوم مہوا بسم اللہ گونڈہ آگئے اور تھوڑی مدت یہاں گزار کر پھر سے جمعیۃ سے متعلق ہوگئے اور پھر جمعیۃ سے اٹھے تو دوبارہ مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ تشریف لے گئے۔

۱۹۸۲ء میں مولانا عبدالحلیم صاحب نے مولانا کو بحیثیت شیخ الحدیث اپنے مدرسہ ریاض العلوم گورینی بلالیا۔مولانا یہاں آٹھ سال رہے۔۱۹۹۰ء میں دارالعلوم گورکھ پور بحیثیت مہتمم آگئے اور ۲۰۰۹ء کے شروع تک یہاں رہے۔پھر کمزوری اور معذوری کی بنا پر یہاں سے سبک دوش ہوئے تو تادم واپسیں اپنے وطن رگھولی میں مقیم رہے۔فرقانیہ کے بعد دوسرا طویل المیعاد اقامتی مدرسہ مولانا کا یہی ہے۔

یہ مولانا کی زندگی کے ایک رخ کا اجمالی بیان ہے۔ورنہ حقیقت میں مولانا کی زندگی میں گوناگونی اور تنوع بہت ہے۔قدرت کی طرف سے مولانا کو ایسا عالی دماغ ودیعت ہوا تھا جو بیک وقت کئی جہتوں میں کام کرتا تھا۔

فراغت کے بعد کچھ دنوں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں رہ کر تصوف وسلوک کا مشغلہ رکھا اور ذکر الٰہی کی لذت کشید کی۔اس کے بعد اپنے استاذ ومرشد کے حکم سے عملی میدان میں اترے تو تدریس کے ساتھ ملی مسائل سے بھی دلچسپی رکھی، دلچسپی کیا معنی مرشد کی وصیت کی وجہ سے اسے ایک فریضہ کی طرح انجام دیتے رہے۔ملک وملت کی بہی خواہی اور بہتری کے لیے برسر

اقتدار طبقہ کے معتوب بھی ہوئے اور سلاخوں کے پیچھے بھی رہے۔تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والے خوں ریز فسادات کو خود انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بحیثیت مسلمان اسے جھیلا بھی تھا۔اس لیے تقسیم کے بعد مسلمانوں پر جب بھی کڑا وقت آیا اور ملت کی ناؤ کو بھنور میں دیکھا تو تڑپ گئے اور صرف زبانی بیان بازی نہیں کی بلکہ عملی میدان میں اتر کر جو ہوسکا کیا۔تن من دھن سب کی بازی لگادی، گرفتاری دی، احتجاج کیا، جیل گئے، حکومت کے معتوب بنے مگر مرشد کے سونپے ہوئے فریضے سے پیچھے نہیں ہٹے۔

مولانا کو ابتدا ہی سے جمعیۃ علمائے ہند سے جذباتی تعلق تھا۔کیوں کہ وہ ان کے مرشد کی لگائی ہوئی پود اور ان کے اکابر کے خون سے سینچا ہوا درخت تھا۔مولانا اس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور مخلص کارکن تھے۔جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے مولانا نے بہت سی ملی خدمات انجام دیں مگر چوں کہ مخلص و بے ریا تھے، اس لیے نام ونمود کے چکر میں نہیں پڑے۔۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں صدر جمعیۃ سے فکری ونظریاتی اختلاف ہوا، جس کی بنا پر انھیں اور ان کے کچھ ساتھیوں کو جمعیۃ سے علاحدہ کر دیا گیا۔اس کے بعد مولانا سید احمد ہاشمی صاحب کے ساتھ مل کر ملی جمعیۃ قائم کی اور اس کے تحت کام کرنا شروع کر دیا مگر یہ تنظیم بہت جلد اپنے دن پورے کر کے ختم ہوگئی۔

۱۹۹۲ء میں مرکزی جمعیۃ قائم ہوئی تو مولانا تاحیات اس کے تیسرے صدر رہے اور اس کے پلیٹ فارم سے ملی وقومی خدمات انجام دیتے رہے۔غرض یہ کہ اپنی حیات کے کسی حصہ میں اپنے استاذ حضرت شیخ الاسلام کے سپرد کیے ہوئے فریضے سے غافل نہیں ہوئے اور نہ ہی اس کی ادائیگی میں کبھی کسل مندی سے کام لیا۔

مولانا کی قومی خدمت کا ایک وسیلہ ان کا قلم بھی ہے۔انھوں نے نظم ونثر دونوں ذریعے سے ملک وقوم کی رہنمائی کی کوشش کی۔قدرت نے ان کو بہترین قلم اور عمدہ انداز بیان سے نوازا تھا۔ان کا قلم ان کی بہت بڑی طاقت تھا۔جہاں عمل کی ضرورت تھی وہاں عمل سے اور جہاں قلم کی ضرورت تھی وہاں قلم سے باطل کا مقابلہ کیا اور اس پر چرکے لگائے۔ان کی قلمی فتوحات میں بیشتر سیاسی اور اصلاحی نوعیت کے مضامین ومقالات ہیں۔متعدد علمی ومناظراتی مقالات بھی لکھے ہیں جو کہ خاصے کی چیز ہیں۔ان کی اشاعت یقیناً مفید ثابت ہوگی۔

دینی صحافت کے میدان میں بھی مولانا کی گراں قدر خدمات ہیں۔ان کے مضامین و مقالات تقسیم وطن سے قبل اوراس کے بعد بھی بہت سے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کی ادارت میں جب ہفتہ وار''انصار'' بہرائچ سے نکلنا شروع ہوا تو مولانا کے کئی ایک مضامین کو قاضی صاحب نے اس میں شائع کیا۔اس کے علاوہ ابوسعید بزمی صاحب کے زیرادارت شائع ہونے والے رسالے سہ روزہ''مدینہ'' بجنور میں بھی مولانا نے لکھا ہے۔ ریاض العلوم گورینی کا ماہ نامہ نقش اول'' الریاض'' اورنقش ثانی ''ریاض الجنۃ'' کی تقریباً ساری ادارتی ذمہ داریاں ابتدا میں مولانا ہی کے سرتھیں اورایک زمانہ تک اداریہ اوردرس قرآن کا مستقل کالم مولانا ہی کے قلم سے نکلتا رہاہے۔اس کے علاوہ متعدد علمی مضامین اس میں شائع ہوئے اوروفیات کا کالم بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔گویا کہ ریاض الجنۃ کومعیاراوراعتبار کی منزل تک پہنچانے میں بہت کچھ مولانا کی کاوشوں کا دخل ہے۔

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں آپ کا نام شامل ہے۔اس کے زیر انتظام شائع ہونے والا رسالہ''ترجمان دارالعلوم'' کی ادارت بھی آپ سے متعلق تھی۔ایک زمانہ تک اس کے اداریے آپ ہی کے قلم سے ہوتے تھے۔اس میں آپ کے بہت سے مضامین و مقالات شائع ہوئے۔دارالعلوم دیوبند کے دوسالہ طالب علمی کے دور کے احوال''دارالعلوم میں دوسال'' کے عنوان سے متعدد قسطوں میں شائع ہوئے۔وفیاتی کالم اور اداریے میں بہت سے ماتمی مضامین بھی لکھے،جواس کتاب میں شامل ہیں۔

دارالعلوم گورکھ پورآنے کے بعدایک رسالہ''دانشور'' کے نام سے نکالا جس کے ابتدائی کئی شمارے''علم ودانش'' کے نام سے شائع ہوئے پھر بعد میں اس کو دانشور کا مستقل نام دے دیا گیا۔۲۰۰۰ء کے بعد کی آپ کی بیشترقلمی فتوحات اسی میں شائع ہوئی ہیں۔اس رسالہ کا پوراانحصار مولانا ہی کی ذات پرتھا۔جب تک آپ کا قلم چلتا رہارسالہ کی سانس بھی چلتی رہی،جب دارالعلوم سے آپ سبک دوش ہوئےتو رسالہ بھی مرحوم ہوگیا۔

....

یہ کتاب مولانا کے قلم سے مختلف شخصیات پر نکلے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔مولانا کو

شخصیت نگاری اور تذکرہ نویسی سے خاصا شغف تھا۔ معروف، کم معروف اور گمنام ہر طبقہ کے لوگوں کا تذکرہ مولانا نے لکھا ہے اور لکھ کر انہیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

مولانا کی تذکرہ نویسی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جب وہ کسی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو بغیر کسی تکلف وتصنع کے اور بغیر کسی زیب داستان کے بلا کم وکاست لکھتے چلے جاتے تھے۔ زیر تذکرہ شخصیت سے متعلق یادیں جس ترتیب سے لوح ذہن پر ابھرتیں اسی فطری ترتیب سے قرطاس پر بکھیرتے چلے جاتے۔ بعض خاکے پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مولانا نے لکھنے کے بعد نظر ثانی کی بھی زحمت نہیں کی کہ مبادا تحریر کے فطری بہاؤ پر کوئی خراب اثر پڑ جائے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ مولانا صرف اپنی یادیں شخصیت سے متعلق رقم نہیں کرتے بلکہ اس شخصیت کی ترجیحات ورجحانات کو اور مختصر لفظوں میں متعلقہ شخصیت کی پوری زندگی کا نچوڑ پیش کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال تقریباً ہر خاکہ اور تذکرہ میں آپ کو ملے گی۔

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے بیشتر خاکے تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اپنے قبیلے کی ریت کے مطابق مولانا نے بھی کسی شخصیت پر اسی وقت قلم اٹھایا جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ مگر یہ بات مسلم ہے کہ مولانا متعلقہ ذات کا ہو بہو رنگ ونقش کاغذ پر کچھ اس طرح مرتسم کر دیتے ہیں کہ وہ شخصیت قاری کو چلتی پھرتی اور متحرک محسوس ہونے لگتی ہے۔

کتاب کے ابتدائی چند تذکرے جو اکابر اہل علم وتقوی سے متعلق ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں۔ خاص طور سے حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کا تذکرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دونوں تذکروں میں تحریک دارالعلوم کی روح سمیٹ کر رکھ دی ہے۔ حاجی عبدالرحیم فضلی صاحب کا تذکرہ 'دانشور' میں بالاقساط دو سال تک شائع ہوتا رہا ہے، شاید اسی وجہ سے اس میں کہیں کہیں تکرار در آیا ہے مگر اس سے قطع نظر یہ تذکرہ بھی بہت زوردار ہے۔ خاص طور سے فکر ونظر اور عقل ونقل سے متعلق بحثیں خاصی جاندار ہیں۔ کرامات اولیا، الہام، نسبت اور تعویذات ودعا جس کا انکار آج کل فیشن بن چکا ہے، ان چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اور نقل سے مدلل کر کے ذہن سے بہت قریب کر دیا ہے، جو یقیناً مولانا کے ذہن رسا کا کمال اور زبان وبیان پر ان کی غیر معمولی قدرت کی بین شہادت ہے۔

یہ کتاب مولانا کے تاثراتی خاکوں کا مرقع ہے۔ابتدائی چند مضامین کے علاوہ سارے مضامین وفیاتی تاثراتی ہیں۔ جومختلف مواقع سے مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں، جنھیں جمع کر کے کتاب کی صورت دی گئی ہے۔جس رسالہ یا کتاب سے جومضمون لیا گیا ہے اس کا حوالہ مع سنہ اشاعت اخیر میں درج کر دیا گیا ہے۔

مضامین کے جمع کرنے میں بہت سے قابل قدر لوگوں کا تعاون مجھے حاصل رہا ہے جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔سب سے پہلا شکریہ مولانا کے حفید رشید مولانا ڈاکٹر محمد عمار صاحب کا جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں خاصی دلچسپی لی اور تعاون کیا۔مضامین کی فراہمی میں مولانا محمد اشہد اعظمی صاحب اور مولانا صبیح الحسن گورکھ پوری صاحب نے خاصی معاونت کی۔ بندہ ان کا از حد شکر گزار ہے۔مولانا قمر الحسن صاحب قاسمی، برادر کبیر مولانا محمد عامر اعظمی صاحب اور مولانا محمد راشد اعظمی صاحب کا بھی شکریہ ضروری ہے کہ ان کا تعاون ہر موقع پر مجھے حاصل رہا ہے۔اللہ تعالی ان حضرات کو جزائے خیر دے اور اپنی بارگاہ سے ان کو بہترین اجر سے نوازے۔

محمد عرفات اعجاز اعظمی

۱۵/۲/۲۰۱۷ء

❑❑❑

عالم اسلام کا مایۂ ناز سپوت
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

اسلامی ہند کی ہزار سالہ تاریخ میں علما، صوفیا، مدبر، رہنما اور بادشاہ ایک سے ایک آئے، اور اپنی یادگاریں چھوڑ کر چلے گئے مگر جس ذات گرامی نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''ازالۃ الخفاء'' جیسی یادگاریں چھوڑی ہوں، تاریخ میں ایسا کوئی نہیں گزرا۔

'حجۃ اللہ البالغۃ' ایک کتاب ہی نہیں بلکہ عالمی رہنمائی اور حکمت ودانائی پیدا کرنے کی ایک تحریک ہے اور عقل وحکمت کا ایک ادارہ ہے۔

'حجۃ اللہ' میں شاہ صاحب نے ارسطو اور ابن سینا کی طرح حکمت وفلسفہ کو تجربہ اور عقل تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اسے قرآن کی روشنی میں، پیغمبر اسلام ﷺ کے علوم اور صحابہ کی زندگی میں تپا کر کندن کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کتاب روحانیت اور مادیت کا ایسا آمیزہ بن گئی ہے جو انسانیت کی پیاس بھی بجھا سکتی ہے، عصر حاضر کو مطمئن بھی کر سکتی ہے اور اسلامی علوم وفنون کی کسوٹی پر کھری اتر سکتی ہے۔

'حجۃ اللہ' ایک زندۂ جاوید کتاب ہے، کیوں کہ اس میں یونانیوں کا وہ فلسفہ اور وہ منطق نہیں ہے جس سے بت پرستی اور وہم پرستی کی آج تک بو آ رہی ہے۔ اس لیے زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا گیا، یونانیوں کا تخیل اور فن اپنی قیمت کھوتا گیا اور کھوتا چلا جائے گا۔ لیکن 'حجۃ اللہ' اسلام کے فطری اصولوں، قرآن کے ٹھوس دلائل اور پیغمبر اسلام کے الہامی نکات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے جب تک آسمان کا سایہ ہے، انسان کی فطرت ہے اور علم ونظر کی جستجو ہے 'حجۃ اللہ' باقی رہے گی۔ کیوں کہ شاہ صاحب نے اس میں نہ صرف دلائل دیے ہیں بلکہ استدلال کے دروازے کھول دیے ہیں اور حکمت وبالغ نظری کے پھوٹتے ہوئے سوتوں کا ایسا سراغ دیا ہے، جہاں اہل نظر

ہمیشہ پہنچتے رہیں گے۔ چنانچہ ان ہی راہوں پر چل کر شاہ عبدالعزیز، مولانا اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا آزاد جیسے نادرۂ روزگار افراد نے اس میں اضافے بھی کیے ہیں اور عصری تقاضوں کے مطابق نئے نئے زاویوں سے بحث بھی اٹھائی ہے، قرآن کے عجائبات کی نقاب کشائی بھی کی ہے اور یہ سب دَین 'حجۃ اللہ البالغۃ' کی ہے۔

اگر کوئی اکیڈمی شاہ صاحب کے ان کارناموں کو بنیاد بنا کر برصغیر اور عربی ممالک کے فکر وفن والے اہل علم کی کاوشوں کا جائزہ لے تو اسے محسوس ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کا فن ابھی زندہ ہے، ترقی کر رہا ہے اور ہمیشہ ترقی کرتا چلا جائے گا، مگر کتنی ترقی کہاں کہاں ہوئی؟ یہ اکیڈمی متعین کرے گی۔

حضرت شاہ صاحب کے دور میں دہلی اور دوسرے مقامات پر شیعہ اور ایرانیوں کے اثرات بہت تھے، جس کی وجہ سے عقائد واعمال متاثر ہو رہے تھے۔ شاہ صاحب نے عقائد کی تصحیح اور اسے خرافات سے نکالنے کی جو منفرد کوشش کی ہے، اس کا نام ''ازالۃ الخفاء عن خلاصۃ الخلفاء'' ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے خلافت راشدہ کو قرآن وسنت سے جس طرح ثابت کیا ہے، اسے پڑھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اس امت کا اول بھی اچھا ہے اور آخر بھی۔ اس میں قرآن فہمی، واقعات کی ترتیب اور فطری استدلال کے ایسے نادر نمونے یادگار چھوڑے ہیں کہ دشمن بھی پڑھے گا تو اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ اکبر!

'ازالۃ الخفاء' نے شیعوں کے فتنے پر اور ان کی تشکیک پر ایسا بند ھ باندھا تھا کہ ابھی تک اسے کوئی عبور نہیں کر سکا۔ پھر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے، اور دار المبلغین قائم کر کے مولانا عبدالشکور صاحب نے لکھنؤ سے مکمل کر دیا ہے، اور اب ان کے بعض گوشوں کو تکفیر تک لے جانے کا کام مولانا محمد منظور نعمانی نے شروع کیا ہے۔ دیکھنا ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے اور اسے امت کہاں تک قبول کرتی ہے۔

شاہ صاحب نے ایک جدت اور بھی کی ہے، اور خوب کی ہے کہ قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ پھر ان کے صاحبزادوں نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمہ کو لوگ اردو میں الہامی ترجمہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں اس وقت کے محاورے، اس وقت کی

زبان اورالفاظ کی مدد سے قرآن کے مفہوم کو عام کرنے میں جو کمال دکھایا ہے اسے حضرت شیخ الہند کی نکتہ رس زبان سے سننا چاہیے اور داد دینی چاہیے۔

حضرت شاہ صاحب عربی سے فارسی کر کے اور ان کے صاحبزادوں نے اس کو اردو میں کر کے قرآن تک پہنچنے میں جتنی رکاوٹیں تھیں، وہ سب دور کر دی ہیں، اور ان کے بعد علمائے کرام نے اس پر حاشیے اور شروح کے ذریعہ سونے پر سہاگہ لگا دیا ہے۔ آج کل وہی کام ہندی میں بھی ہونے لگا ہے۔ انگریزی کے تراجم بھی بازار میں آ گئے ہیں اور آج پورا ہندوستان اردو تراجم سے گونج رہا ہے۔ کیوں کہ پھر بڑی سے بڑی شخصیتوں نے بھی اس پر قلم اٹھایا ہے اور خدا کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ آج ان میں سب سے معتبر شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند کے تراجم ہیں۔ اور سب سے مفصل اور مشرح حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا ترجمہ اور ان کی تفسیر ہے۔ بعض بحث طلب کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو عصر حاضر کی زبان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ دوسرے تمام تراجم سے اہم ہے، مگر ان سب کا ثواب حضرت شاہ صاحب کے اعمال نامے میں لکھا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے ہندوستان میں عوام وخواص تک قرآن پہنچانے کی ابتدا کی ہے۔ اللہ نے ان کے خلوص کو قبول فرما کر اسے عام کر دیا ہے، اور اپنے دین کو وسعت بخشی۔

شاہ صاحب کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے پڑھائے ہوئے شاگردوں کا سلسلہ خود ان کے خاندان کے اندر سے چلا کہ اس نے شاہ صاحب کے علم واستدلال کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس میں سے سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم دیوبند کا ہے، جس نے نہ صرف حضرت شاہ صاحب کے علوم و فنون کو بلکہ ان کے شاگردوں کی طرح حدیث وقرآن اور فقہ کے ماہرین کی ایک ٹیم تیار کر دی اور سو برس تک وہ برابر کرتا رہا۔ اس لیے شاہ صاحب کا فن، ان کا امتیاز، ان کے علوم اور تدابیر کو نہ صرف کاغذ پر، نہ صرف ریشمی رومال پر، نہ صرف تقریروں میں محفوظ کر لیا گیا بلکہ بہت سی زندۂ جاوید شخصیتوں کے فکر وفن میں سمو کر انھیں زندۂ جاوید بنا دیا گیا، جس سے سارا عالم فیض اٹھا رہا ہے اور سیراب ہو رہا ہے۔ اس طرح شاہ صاحب کا خلوص، ان کا علم اور ان کی فکر، تینوں کے ایسے ایسے وارثین پیدا ہوتے رہے اور کم و بیش آج بھی پیدا ہو رہے ہیں جو ان کی فہرست اور امت کی رہنمائی کے نادر نمونے ہیں۔

❑❑❑ ماخذ: 'دینی مدارس' نئی دہلی، شاہ ولی اللہ نمبر۔۱۹۹۴ء

الامام محمد قاسم نانوتوی
عبقریت کے نقوش

عبقریت کی ابتداء:

الامام محمد قاسم رحمہ اللہ نے گھر پر تعلیم پائی، دہلی جا کر عربک کالج میں تکمیل کی، پھر دورہ حدیث کے لیے شاہ ولی اللہ کی درسگاہ میں حاضر ہو کر حدیث، فقہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے، پھر حضرت حاجی امداداللہ سے باطنی علوم کی اجازت حاصل کی۔ اس طرح ظاہری اور باطنی علوم سے فارغ ہو کر میرٹھ میں قیام کر کے وہاں بخاری پر حواشی لکھے، اور امام بخاری کی 'کتاب الملل' کا جواب دیا جو آج بھی بخاری کے ساتھ منسلک ہے۔ اس میں امام بخاری نے امام ابوحنیفہ کا محاسبہ کیا ہے، تو ان کے اعتراضوں کا محدثانہ جوابات دیے ہیں۔ یہ ہے عبقریت کی ابتدا! اس کا نام ہے 'دفع الوسواس عما قال بعض الناس'۔

حوصلہ مندی:

۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحب کے یہاں علما وفضلا، رؤسا اور زمین داروں کی میٹنگ ہوئی کہ انگریزوں سے جنگ کی جائے، یا ہم خاموش رہیں؟ اکثر رؤسا نے فرمایا کہ ہمارے پاس نہ اسلحہ ہیں، نہ فوجی طاقت، نہ کوئی بڑی تنظیم، اس لیے ہمیں برطانیہ سے جنگ نہیں کرنی چاہئے، مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے سوال کیا کہ 'کیا ہم لوگ اصحاب بدر سے بھی کمزور ہیں؟' اس پر مجمع میں سناٹا چھا گیا اور آخر طے ہو گیا کہ شاملی کے محاذ پر جنگ کی جائے، اور اس کے مولانا محمد قاسم صاحب کمانڈر ہوں گے اور امیر المومنین حضرت حاجی امداداللہ صاحب ہوں گے۔

سنگین ماحول

انیسویں صدی میں کئی اہم کام ہوئے اور حضرت نانوتوی کے سامنے ہوئے۔

۱) ۱۸۵۷ء کا غدر جس میں ایک طرف انگریزی فوج تھی، دوسری طرف ہندوستان کے عوام وخواص۔اس لیے دونوں میں بڑے زور کی جنگ ہوئی، اس جنگ کا انگریزوں نے غدر نام رکھ دیا، اور ہندوستانیوں نے انقلاب سمجھا۔

زبردست انتقام:

۲) اس جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے ایک طرف ملک پر قبضہ کرلیا، دوسری طرف ہندوستانی علما سے سخت ترین انتقام لیا، ان کو جیل بھیجا گیا، کالے پانی روانہ کرایا گیا، ان کا قتل عام کیا گیا، حتیٰ کہ بڑے بڑے درختوں پر رسیاں باندھ کر علما، فضلا، بزرگان دین اور دانشور لٹکا دیے گئے، اوران کی لاشیں جب درختوں پر رقص کرنے لگتیں تو انگریز کھڑے ہوکر تالیاں بجاتے تھے اور تمام ہندوستانی دم بخود رہ جاتے تھے۔

مولانا محمد قاسم نے دہلی سے میرٹھ تک کے تمام مناظر خود دیکھے اور جھیلے۔اسی کے ساتھ مسلمانوں کی بے بسی، خاموشی، ناتوانی اور کس مپرسی کو مسلسل دیکھتے رہے، اوران کا خون کھولتا رہا مگر دیکھتے اور سوچتے رہے۔

۳) جب برطانیہ نے بربریت کا ننگا ناچ کر کے دل ٹھنڈا کرلیا، اوراس پورے علاقے سے علما اور بزرگوں کا صفایا کرلیا تو اس نے غداری کی معافی کا اعلان کردیا، اورآپ کے رفقا نے کسی گمنام جگہ سے مدرسہ کا انتظام شروع کردیا۔

مسلمانوں کی اس بے بسی میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا، جب مولانا نے دیکھا کہ برطانوی حکومت نے آریہ سماج کے لیڈروں کو اور عیسائی مشنریوں کو بلا بلا کر میدان میں اتار دیا ہے کہ علما سے آبادیاں خالی ہوگئی ہیں، اب باقی مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بیزار کردیا جائے، اور عیسائی مشنریوں کے ذریعہ سب کو عیسائی بنالیا جائے۔اس لیے قرآن خرید خرید کر جلا دیا جائے۔

اتنے سنگین ماحول میں انگریز سے جنگ کرنا، میدان مقابلہ یا تبدیلی کی بات سوچنا یا اس

کے لیے کوئی چھاؤنی قائم کرنا، اپنی جان، آبرو اور خاندان سے ہاتھ دھو لینا تھا، مگر حضرت الامام نے کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر مقابلہ کے میدان میں قدم رکھ دیا، اور مقابلہ کرنے والے افراد تیار کرنا شروع کر دیے، مگر دہلی و میرٹھ میں نہیں۔ کیوں کہ وہ فیروز شاہ کوٹلہ کی طرح توپ دم کر دیا جائے۔

چھاؤنی کی ابتداء:

چنانچہ ۱۸۶۶ء میں مدرسہ قائم ہوا، اور ۱۸۷۰ء تک اسی مدرسہ سے سپاہی اور رضا کار تیار کر لیے گئے۔ اس کی پہلی صف میں مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا احمد حسن محدث امروہوی جیسے جاں باز، دانش ور، فقیہ اور مجاہد تھے، پھر مسلسل یہ تعداد بڑھتی گئی۔

سنگین اختلاف رائے:

حاجی عابد حسین صاحب نے چھتے کی مسجد میں اسلامی مدرسہ کی ابتدا کی تو صرف ایک لڑکا محمود حسن تھا، وہ مختصر المعانی وغیرہ پڑھتا تھا، مگر اس کی ابتدا ہوتے ہی علما، رؤسا اور زمین داروں کے بچے آتے چلے گئے، تو چھتے کی مسجد ناکافی ہوگئی۔ مشورے ہوئے کہ مدرسے کے اس پھیلاؤ کے پیش نظر اسے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ حاجی عابد صاحب کی رائے تھی کہ ہمارا قصبہ چھوٹا ہے، اس لیے اس کی حیثیت کے مطابق جامع مسجد کے حجروں میں منتقل کر دیا جائے۔

عظیم دار العلوم:

حضرت مولانا کی پختہ رائے تھی کہ شہر کے کنارے جو تالاب ہے، وہاں زمین خرید کر مدرسہ بنایا جائے۔ دونوں حضرات اپنی اپنی رائے میں مخلص تھے، اس لیے تالاب کے کنارے مدرسہ کی بنیاد رکھ دی گئی، تب بھی حضرت حاجی صاحب غصہ میں شریک نہ ہو سکے کہ یہ اہل قصبہ کی ہمت وحیثیت سے بہت بڑا کام کبھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن حضرت مولانا کی روحانیت مطمئن تھی کہ خدا ہماری ضرور مدد کرے گا، اور ہم اسلام کے رضا کار علما پورے ملک میں پھیلا سکیں گے۔ اس لیے بنیاد رکھنے کے بعد خود حاجی صاحب کے گھر تشریف لے گئے، اور ان کی منت سماجت کر کے ساتھ لائے، اور نودرہ کی وہ عمارت بن کر تیار ہوگئی جس کی خواب میں بشارت ہوئی تھی۔

اس طرح حضرت حاجی صاحب نے جس مدرسہ کی شروعات کی تھی، اس کو حضرت

نانوتوی نے دارالعلوم کا تصور دیا، نظام دیا اور اپنے خون سے سینچ کر ایشیا کا سب سے بڑا مدرسہ بنادیا ''دارالعلوم دیوبند''۔

الہامی مقامات:

ان کو دراصل اس مقام کی تلاش تھی جس مقام سے حضرت سید احمد شہید نے ایمان و اسلام کی خوشبو سونگھی تھی، اور مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی نے اسلام و ایمان کا نور دیکھا تھا، جب وہ دہلی سے قید کر کے گوالیار کی طرف جا رہے تھے اور ان کا نور باطن رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ مقام سہارن پور والی سڑک کے کنارے ان علما کا منتظر تھا۔

اس طرح حضرت الامام کی عبقریت سر اٹھا کر چلنے لگی، اور دو تین سالوں میں بڑے بڑے کمانڈر پیدا ہونے لگے جو خالد بن ولید کی طرح بے باک اور صلاح الدین ایوبی کی طرح دور اندیش تھے۔

تعلیم کا موضوع

مردم سازی کا طریقہ:

دارالعلوم کے نصاب تعلیم کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ حضرت الامام نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے حضرات نے تعلیم کا موضوع رکھا ہے نائب رسول بنانا۔ اس لیے ان علما نے عربک کالج دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ایسا نصاب مرتب کیا جس سے نیابت رسول دینے کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا جا سکے۔

انداز درس:

اس کے لیے انھوں نے عربی قاعدہ، عربی زبان، فقہ، اصول فقہ کے ساتھ فقہ حدیث اور فقہ قرآن کی تعلیم بھی دی، اور اس طرح دی کہ امام بخاری، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام طحاوی، حافظ ابن حجر اور حافظ عینی سے دلائل مانگے، ان پر درسگاہ میں تنقید سنی، اور تنقید کی، حتیٰ کہ حنفی ہونے کے باوجود امام محمد، امام ابو یوسف اور امام ابوحنیفہ کے دلائل پر سیر حاصل بحث کی، اور امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک کی ترجیحات پر غور کیا، اور بھر پور کیا، اور اس طرح کیا کہ درسی

تقریریں، تفقہ فی الحدیث کی اہم کتابیں بن گئیں، جیسے 'فیض الباری'، 'عرف الشذی'، 'درس بخاری' وغیرہ۔

آزادی گفتار:

طریقہ تعلیم کی اس ہمہ گیری اور آزادی گفتار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ کو سمجھنے یا حل کرنے یا مسترد کرنے میں زندگی بھر ان کو کوئی جھجک نہیں ہوئی۔ وہ بڑے بڑے عہدے دار سے کبھی نہیں جھجکے، حتیٰ کہ انھوں نے لوکل حکام یا صوبائی عہدے داروں، یا مرکزی حکومت کے تیور اگر کہیں غلط دیکھ لیے تو اس پر احتجاج ضرور کیا ہے، اور آواز ضرور بلند کی ہے، خواہ جیل جانا پڑا، یا گھر بار اجاڑ دیے گئے۔

اس طرح حضرت نانوتوی نے اور ان کے شاگردوں نے طلبہ کی ذہنی تربیت کر کے اور ان کو معقولات پڑھا کر شہری زندگی میں جب داخل کر دیا تو وہ ہر سطح کے لوگوں میں کام کرنے کے اہل ثابت ہوئے، اور ان کا فاضل دیوبند ہونا ان کی عزت کا سبب بن گیا۔ آج قاسمی ہونا محترم امتیاز ہے۔

تعلیم کا محور:

تو فقہِ حدیث و فقہِ قرآن کو تعلیم و تربیت کا محور بنا کر حضرت نانوتوی نے اپنی درسگاہ کا رنگ ڈھنگ بدل دیا، وضع قطع بدل ڈالی، فکر و نظر کے انداز بدل دیے، زندگی کے مقاصد معین کرا دیے۔ چنانچہ دارالعلوم ندوہ نے ادب عربی کو محور بنایا تو وہاں سے ادیب، شاعر اور مورخ ضرور پیدا ہوئے، مگر مفسر، محدث اور فقیہ نہیں پیدا ہوئے۔ اسی طرح جس درسگاہ کا جو محور تھا، اس نے اسی قسم کے رضا کار ڈھالے، تو ان کے محور کا اثر ضرور رہا، خواہ علی گڈھ یا بورڈ کے امتحانات یا مدرسہ عالیہ وغیرہ کا کورس۔ اس لیے کہیں سے وہ ہستیاں نہیں اٹھ سکیں جو درس قرآن، درس حدیث، درس فقہ میں ان کی ہمسری کر سکیں، کیوں کہ ان کا محور بدل دیا گیا۔

مجتہدانہ فکر و نظر:

حضرت نانوتوی نے قدیم طرز پر تعلیم پائی تھی، اور معقولات کی تمام کتابیں پڑھ لی تھیں،

لیکن صدرا، شمس بازغہ اور میبذی سے وہ مطمئن نہیں تھے، حتیٰ کہ یونانی فلسفہ کی خامیوں کی وجہ سے وہ ایک نیا علم کلام مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں عقلی تقاضے پورے ہوں، اور یونانی فلسفے کی کمزوریوں کی وجہ سے متکلمین کو جو دشواریاں پیش آتی تھیں، ان کے سامنے نہ آئیں۔ مثلاً فلاسفہ زمانے کو قدیم کہتے ہیں، لیکن حضرت نانوتوی صرف خدا کو قدیم کہتے ہیں اور اس کی تمام مخلوقات کو حادث تسلیم کیا ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ’’زمانہ کسی آسمان کی حرکت یا کسی کا کوئی محرک ہونا چاہیے جو مادہ کو حرکت دے، پھر وہ مادہ ضروری ہے، جو مرکب کرے، وہ سمت ضروری ہے جدھر حرکت ہو، اور وہ مسافت لازم ہے جس پر حرکت کی جائے۔ اور جو اتنی قوتوں اور چیزوں کی محتاج ہے، وہ قدیم نہیں ہوسکتا‘‘

اس طرح مادہ کی توجیہ حکما نے کی ہے کہ ہیولیٰ اور صورت جسمیہ سے مرکب ہے، مگر حضرت نانوتوی نے ان کے تمام دلائل رد کردیے، اور اجزائے فردہ کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے ساتھ اجزائے فردہ کو باطل کرنے والے تمام دلائل کی بخیہ ادھیڑ ڈالی ہے، کیوں کہ ’’مـزقـنـاھـم کـل ممزق‘‘ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

مہمل فلسفہ:

یونانی فلسفہ دراصل بت پرستوں کا فلسفہ ہے، اس لیے وہ خدا کسی ایسے واجب الوجود کو تسلیم کرتا ہے جو مہمل ہو، اس میں ان صفات کا گزر نہ ہو، جن کو قرآن نے ہر ورق پر ثابت کیا ہے، اور اہل اللہ، وحی، الہام اور کرامت کے ذریعہ اس خدا سے براہ راست رابطہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے تصور میں جو خدا ہے، وہ تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے، ہر وقت، ہر آن حیّ وقیوم ہے، فعّال لما یرید ہے، اپنے علم، ارادے، توانائی میں بے مثل ہے، اور اس کا وجود ہی تمام کائنات کی اصل ہے، اور وہی ان کی صفات کی جڑ اور بنیاد ہے۔

تو حضرت نانوتوی نے یونانی فلسفہ کو باطل قرار دے کر ثابت کردیا ہے کہ اسلام یونانی فلسفہ کا محتاج نہیں ہے، اور ہم اسلامی تصورات کو اس فلسفے کے بغیر سمجھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام کا

خود اپنا ایک فلسفہ ہے، جو روح اور مادہ دونوں کو تسلیم کرتا ہے، اور دونوں کو خدا کی مخلوق محسوس کرتا ہے۔

نیا فلسفہ:

آپ نے تثلیث کو باطل کیا ہے، آواگوان کو غلط کہہ کر قیمات ثابت کی ہے، ہیولیٰ باطل کر کے اجزائے فردہ ثابت کیا ہے۔ احاطۂ خداوندی کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ جیسے روح پورے جسم پر محیط ہے، اس سے کہیں بہتر صورت میں خدا کائنات کو محیط ہے، اور اپنی تمام صفات کے ساتھ ہر جز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، تو ہر وقت ہر لمحہ ہر قسم کے تصرفات اور تبدیلیاں کرنے کا مختار ہے۔

حضرت نانوتوی نے کئی کتابیں لکھ کر ایک میگزین تیار کر دی ہے، جو ہمیشہ کے لیے دلائل کا خزانہ ثابت ہوگی۔

علمی امتیاز و تخصص

تعلیمی امتیاز:

دیوبند کا نصاب تعلیم درس نظامیہ کے انداز کا ہے، اس میں جزوی تبدیلیاں کر کے جاری کر دیا گیا ہے۔ اس میں حضرت نانوتوی کی خواہش تھی کہ طلبہ کو سنسکرت بھی پڑھائی جائے، تو برادران وطن کے مذہب سے براہ راست کا رابطہ ہو مگر لوگوں نے توجہ نہیں فرمائی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو آج علما وہ کام کرتے کہ ہندوستان کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔

ایسے میں ہمارے نصاب میں جدید معلومات اور بدلے ہوئے فلسفے کے ضروری حصے اگر شامل کیے جائیں، اور اس کا قیام دورۂ حدیث کے بعد بطور تخصص رکھا جائے تو اسلامی علوم کے ساتھ مناسب امتزاج ہوسکتا ہے، اور بڑے فائدے محسوس ہوں گے۔

عقل و نقل:

اسلامی روایات میں عدی بن حاتم کا قصہ ثابت کرتا ہے کہ فجر کے وقت خط ابیض اور خط اسود سے ظاہری معنی مراد لیے جاسکتے ہیں، مگر حضور کے سامنے جب اسے پیش کیا گیا تو آپ مسکرا دیے، کیوں کہ اس سے حقیقت نہیں مجازی معنی مراد تھے، جس میں عقلی تقاضے پورے ہوتے تھے،

سادگی کام نہیں آسکی۔

تو حدیث وقرآن کوصرف ظاہری معنی پرمحمول کرنا بھی ایک طریقۂ علم ہے لیکن حضرت ابن عباس، حضرت عمر، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے ذی رائے حضرات کے نزدیک یہی اصل ہے کہ قرآن وحدیث کوعقلی تقاضوں اوراشاروں سے سمجھا جائے، اورزندگی کی پوری فقہ مرتب کردی جائے، اورمرتب کی گئی۔

اجتہاد:

چنانچہ دیوبند میں حدیث، قرآن اوراس کے تمام اجزا کوعقلی تقاضوں کے ساتھ پڑھاتے ہیں، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ نے عقل کووسعت دے کر ہر بات کوعقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دین کو زندہ کردیا ہے، اور پوری وسعت وترقی سے کام کے مواقع فراہم کردیے ہیں۔

اہل ظاہر سے آگے:

دیوبند کے اس طریق کارکواہل ظاہر پسندنہیں کرتے، مگرصحابہ کرام کے ایک بڑے گروہ نے قرآن وحدیث کی تشریح، توجیہ، تحقیق کے عموم کے لیے عقل کواستعمال کیا ہے۔اس لیے اہل دیوبند بھی استعمال کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علمائے دیوبند کے فتاویٰ کواکٹھا کردیا جائے تو پورا کتب خانہ بن جاوے گا، اوروہ زندگی کے تمام مسائل حل کردیں گے۔

دعوت وتبلیغ کا عالمی انداز:

حضرت نانوتوی کی چھاؤنی میں سے مولانا محمد الیاس صاحب نکلے، اورانھوں نے دہلی میں تبلیغ کی بنیاد ڈال دی، اوراس کے لیے چھ اصول اورمخصوص طریق کار اورمحدود دائرہ مقرر کرکے کام شروع کیا تواس کا اندازفقیرانہ رکھا، تاکہ پورا ملک اسے قبول کرسکے۔چنانچہ مولانا محمد الیاس کی بے پناہ محنت والے دعوتی کام کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا تو وہ اس قدر زوداثر، اتنا آسان اوراس حدتک وسیع ہوگیا کہ آج ساری دنیامیں پھیل گیاہے اورجنگلوں، پہاڑوں، جزیروں کے مسلمانوں کواسلام کی بنیادی باتیں سکھاتا چلا جاتا ہے۔

۱) وہ لوگوں کوان کے گھروں سے دوسرے شہروں اورملکوں میں لے جاتے ہیں اورسفر کے

درمیان نماز، روزہ، تہجد، خدمت اور دین داری عملی طور سے پیدا کراتے ہیں، جس سے زندگی بدلنی شروع ہوجاتی ہے۔

۲) غریب اور امیر اپنا خرچ کرنے لگے، اور اپنا سامان سفر خود لے کر سفر کرنے لگے، اور پروگرام کے مطابق تعلیم، درس، گشت اور ایمان کی متعین باتیں سیکھنے اور سکھانے لگے۔

۳) وہ کسی اتفاقی مجمع کو مخاطب نہیں کرتے، بلکہ خود گھر گھر جا کر بلا لاتے ہیں، اور ان کو تھوڑی دیر دین و ایمان کی ضروری باتیں سکھا دیتے ہیں، اور ایسا جذبہ دکھا دیتے ہیں کہ آدمی احسان مند ہوتا ہے، کسی پر احسان نہیں کرتا۔

۴) حضرت مدنی اس تبلیغ کی بڑی سرپرستی فرماتے تھے، اور ان کے اہم اہم مریدین اور شاگرد اس کام کو اپنا مقصود بنا کر انجام دیتے ہیں۔

اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ حضرت نانوتوی کی چھاؤنی میں دین کا درد، اسلام اور ایمان کی لگن اور مسلمانوں کی خدمت اور ان کی استقامت کے لیے جد و جہد کا جذبہ بہت تھا، تو پوری چھاؤنی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اور دینی حمیت کی وجہ سے علاقے کا علاقہ متاثر ہوتا چلا گیا۔

احسانی کیفیت کا سلسلۂ دراز:

دارالعلوم کی بنیادی ہستیاں دو ہیں، اول حضرت نانوتوی، دوم حضرت گنگوہی۔ ان دونوں حضرات نے اپنے شاگردوں اور مریدوں نیز تعلقات رکھنے والوں میں پورے اہتمام سے دو چیزیں ضرورتوں کی حد تک پھیلائیں۔ اول علوم اسلامیہ اور ان کے ساتھ علوم عصریہ کی تعلیم۔ دوسرے علوم طبعیہ اور ان کے ساتھ ذکر اللہ کی باضابطہ تربیت۔ پھر احسانی کیفیت کے ساتھ تصوف کی خرافات سے پرہیز۔ چنانچہ دارالعلوم میں کام کرنے والے تمام اساتذہ اور ملازمین، اس کیفیت کے لیے انھیں میں سے کسی نہ کسی بزرگ سے ضرور بیعت ہوتے تھے، ورنہ خود حاجی امداداللہ صاحب سے تعلق ہوتا تھا۔ اسی لیے ہمارے زمانے تک مشہور تھا کہ 'دارالعلوم کا دربان بھی صاحب نسبت ہوتا ہے'، اور ہم لوگ محسوس کرتے تھے کہ سچ ہے۔

علوم ظاہری و باطنی دونوں کی ضرورت اور تعلیم کا سلسلہ شاہ ولی اللہ کا طریقہ کار تھا کہ انھوں نے علمی اور روحانی طور پر دونوں سلسلوں کو سیکھا، اور دونوں کو جوڑ کر شاہ عبدالعزیز، شاہ

اسحاق، شاہ عبدالقادر جیسے حضرات پیدا کردیے جو پورے ملک کے لیے نمونہ تھے۔ اسی طرح ان کے نقش قدم پر چل کر ان دونوں بزرگوں نے دارالعلوم کی چھاؤنی سے حضرت تھانوی اور حضرت مدنی جیسے منفرد علما کو احسانی تربیت دے کر معلوم نہیں کتنے مرد کامل ڈھال دیے، پھر ان حضرات نے بھی اپنے مقامات پر خانقاہیں جمادیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی کی خانقاہ سے مولانا محمد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری لکھنوی جیسے دیدہ ور افراد ایمان کامل لے کر نکلے اور حضرت مدنی کی خانقاہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان سینکڑوں خانقاہیں آباد ہوتی چلی گئیں۔

اہل علم اور اہل دل کی ان عرفانی خانقاہوں سے ایمان کامل لے کر جب اہل فن نکلے تو انھوں نے تین اہم کام کیے۔

۱) اول یہ کہ پورے برصغیر میں ان بزرگوں نے احسانی کیفیات کو تازہ کیا اور تصوف کی غلط روی کی اصلاح کی۔ چنانچہ شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے عرس میں جو بدعتیں تھیں، یا اجمیر، کچھوچھہ، رودولی وغیرہ میں میلہ، عرس اور ان جیسے مراسم میں جو حق تھا، اسے قبول کیا اور جو غلط یا بدعت یا حرام تھا اسے ترک کردیا، جیسے تھانہ بھون، جلال آباد، رائے پور۔

پھر ڈھول، تاشہ، ناچ، رنگ، سماع، گاگر، تعزیہ اور میلے یا عرس کو بدعت کہا، بزرگوں سے براہ راست حاجت روائی کی درخواست کرنے کو شرک کی ایک قسم قرار دیا، سجدہ اور رکوع کو نماز کے بجائے قبروں پر حرام قرار دیا، چادر، طواف اور چالیسواں وغیرہ کو ترک کردیا۔

لیکن مردوں کو سلام کرنا، ان کے لیے قرآن پڑھ کر بخشنا، ان سے اہل دل کا فیض اٹھانا، کل بھی صحیح تھا، آج بھی صحیح ہے۔ اس طرح دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوتا چلا گیا، اگر چہ اہل بریلی نے اس کو اولیاء اللہ کا انکار کہہ کر اہل حق کو کافر بنا کر گروہ بندی کی مگر قرآن وحدیث سے ثابت نہیں کرسکے۔

لیکن کچھ لوگ خود تصوف اور علم باطن کے خلاف ہیں اور کسی قیمت پر تصوف کو احسان کی کوئی قسم ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کے لیے بھی ہمارے ان بزرگوں نے لمحہ فکریہ عطا کیا کہ اصل تصوف منصوص ہے، کیوں کہ کثرت ذکر اللہ مسنون ہے، اور اس سے قرب الی اللہ کا راستہ احسان تک جاتا ہے۔

۲)	دوم یہ کہ جس طرح حدیث جبرئیل نے احسان کو اسلام اور ایمان کی طرح دین کا تیسرا عنصر متعین کیا ہے، اس طرح احسان کی کیفیت حاصل کرا کے ایمان کامل کا آغاز کر دیا گیا۔ اور جب ایمان کامل ہو گیا تو حدیث کے مطابق انسان کے اندر ستر شعبے کام کرنے لگتے ہیں، ان میں سے شرم وحیا بھی ایک شعبہ ہے۔ اس طرح احسان نے پہلے اللہ اور رسول کی محبت کو عام کر دیا، اس کے بعد ایمانی غیرت کو پروان چڑھا دیا۔ یہی غیرت ایمانی عہد صحابہ میں نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے حضور ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور تمام صحابہ سے فرمایا تھا کہ "**اینقص الدین وانا حی**" وہاں یہ جذبہ نہیں تھا کہ بلکہ ایمانی غیرت کی للکار تھی۔ اور جب بھی یہ للکار کسی کے دل سے پیدا ہونے لگتی ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس علاقہ میں اسلام وایمان زندہ ہو جاوے گا۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بڑی تعداد زندہ تھی، مگر دم بخود تھی، سب پر سکتہ طاری تھا، سب کی ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔ یہی وہ مقام ہے جب کسی آبادی پر موت طاری ہو جاتی ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے، دماغ فیل ہونے لگتا ہے۔ مگر ہمارے ان بزرگوں نے عین اسی مایوسی کے عالم میں آریہ سماج کے دیا نند سرسوتی کو للکارا، پادری فنڈر کو للکارا اور اتنا للکارا کہ حکومت کے ان دونوں بازوں میں اڑنے کی سکت نہیں رہ گئی اور مسلمانوں میں جان آتی چلی گئی، حتیٰ کہ حضرت شیخ الہند نے برطانیہ پر حملہ آور ہو کر ہندوستانیوں کو زندگی کی حرارت بخش دی۔

یہ للکار کس کی تھی؟ اس ایمانی غیرت کی تھی جو ایمان کامل سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نے دیوبند کو مرکز بنا کر اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک، ہر فتنے، ہر لیڈر اور ہر کتاب کا نہ صرف مقابلہ کیا، بلکہ ان کو اتنا للکارا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہی ایمانی غیرت تھی جس نے مولانا محمود حسن دیوبندی میں اتنا زور پیدا کرایا کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف کابل حکومت، ترکی حکومت اور عربوں کو یکجا کر دیا تھا، اور ریشمی رومال تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے حیرت ناک کارنامے انجام دے ڈالے۔ کیوں کہ غیرت ایمانی جب ابھر جاتی ہے تو بے پناہ ہو جاتی ہے، بلکہ طوفان بن جاتی ہے۔

یہی ایمانی غیرت تھی جس نے حضرت مدنی کو مدینہ طیبہ سے اٹھا کر مالٹا پہنچا دیا، اسی

ایمانی غیرت کا مظاہرہ تھا جب تحریک خلافت کے لیے کراچی میں اجلاس تھااوراس میں تمام مرکزی لیڈروں کی ہمتیں چھوٹ گئی تھیں، مگر حضرت شیخ مدنی نے اس کی پکار پر فوراً لبیک کہہ کر ہندوستان کا بھرم رکھ لیا تھا۔اور محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ 'مولانا! آج آپ نے ہندوستانیوں کی عزت رکھ لی۔' پھر یہی وہ ایمانی غیرت تھی جب مدح صحابہ پر ۱۹۳۷ء میں پنتھ کی کانگریس سرکار نے پابندی لگادی تھی تو حضرت مدنی نے لکھنؤ پہنچ کراس کو للکارا تھا،اور ایک مہینہ تک ستیہ گرہ چلا کر پنتھ سرکار کو مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنا حکم واپس لے اور مدح صحابہ کی اجازت دے۔اور وہ پانچ دنوں کے لیے دے دی گئی۔

۳) تیسرا کام جذبۂ احسان نے یہ کیا کہ جب کثرت ذکر یا کثرت عبادت یا صحبت صالحین کی برکت سے ایمان کامل ہوجاتا ہے تو بندہ اپنے خدا سے بہت قریب ہوجاتا ہے۔پھر خدا کہتا ہے کہ 'میرا بندہ میرے کانوں سے سنتا ہے، میری آنکھوں سے دیکھتا ہے اوراس کے سارے کام میری بخشش وکرم سے مکمل ہوجاتے ہیں۔' (بخاری)

احسان کا سب سے عجیب مقام یہ ہے کہ بندہ کا خدا سے زندہ تعلق ہوجاتا ہے، وہ الہام کے ذریعہ خدا سے ہدایت حاصل کرتا ہے، خدااس کی دعائیں قبول کرتا ہے، اوراس کے ارادوں کو کامیاب کرتا ہے۔اس لیے جب اس کی راہ میں دشواریاں آجاتی ہیں تو ان سے خوف نہیں کھاتا، اور خدااس کی مدد کرکے دشواریوں کو حل کرادیتا ہے۔ **وھو معکم اینما کنتم**

آپ حضرت نانوتوی کی پوری تحریک پر غور کریں تو محسوس کریں گے کہ دیوبند کو تحریک اور پھر تحریک کو چھاؤنی بنانے میں سب سے نمایاں کردار اسی ''ایمانی غیرت'' کا ہے۔حضرت نانوتوی سے شروع ہوا،اور سو برس تک آکر ختم ہوگیا۔چنانچہ بابری مسجد میں بت رکھا گیا تو حضرت مدنی اپنا سامان لے کر دہلی آگئے کہ فیض آباد جاکر سول نافرمانی کروں گا،مگر مولانا حفظ الرحمان صاحب کی مصلحت اندیشی اور نئی حکومت کی رعایت کی وجہ سے ان کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔پھر اس کے دروازے کھول دیے گئے،اور حتیٰ کہ بی جے پی اور کانگریس دونوں سرکاروں کی فرقہ پرستی سے وہ ڈھادی گئی،مگر کسی مرد مومن کے کان پر جوں نہیں رینگی۔

انوکھا محاذِ جنگ:

انگریز نے ۱۸۵۷ء کا خونی انتقام علمائے کرام سے لیا، مگر اس کے ختم ہوتے ہی علما نے مدرسہ اسلامی قائم کر کے زبردست محاذ کھول دیا، اور اسے سن کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے بھی مکہ سے کہلا بھیجا تھا کہ ہمیں اس مدرسہ کا بڑا انتظار تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان سے حرمین تک کے اہل فکر متفق تھے کہ برطانوی اسلام دشمن کا جواب دینے کے لیے علما پیدا کیے جائیں، اور یہ موت کا سناٹا ختم کرنے کے لیے کیا جائے۔

چنانچہ یہ مدرسہ متوسطات سے شروع ہوا، اور صرف تین سال بعد یہاں علما کی کھیپ نکلنا شروع ہوگئی۔ پہلی کھیپ میں مولانا محمود حسن اور مولانا فخر الحسن نے دار العلوم کے بجائے حضرت مولانا محمد قاسم سے براہ راست بخاری، ترمذی، مسلم اور ابوداؤد پڑھی، اور نہ صرف میرٹھ میں کتاب پڑھی بلکہ چلتے پھرتے شہروں دیہاتوں میں پڑھتے رہے، اور حضرت نانوتوی کے ہم قدم دعوت و تبلیغ اور بحث و مناظرہ کی فضاؤں میں پرورش پاتے رہے۔ اس لیے سب لوگ ایک سال میں دورۂ حدیث پڑھ کر نکل گئے، اور یہ دونوں شیر دو سالوں کی تربیت کے بعد چھاؤنی سے باہر آئے تو یہی محدث محمود حسن تھے، جنھوں نے دیوبند میں صدر مدرسی کی، اور یہی سپہ سالار تھے جنھوں نے دیوبند کو مرکز بنا کر تمام سرحدی علاقوں میں ہتھیار تقسیم کرا دیے اور کابل سے ترکی تک ریشمی رومال تحریک کا جال بچھا دیا، حتیٰ کہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت خلافت ترکیہ کو برطانیہ عظمیٰ کے خلاف محاذ جنگ بنانے والوں میں شامل کر دیا تھا۔ پھر یہی مرد مجاہد تھے جن کے شاگرد مولانا حسین احمد نے مدینہ چھوڑ کر مالٹا کی سنگین قسم کی جیل کو ترجیح دی تھی اور جب وہاں سے چھوٹ کر بمبئی پہنچے تو وہاں انھیں ''شیخ الہند'' کا عوامی خطاب دیا گیا، اور یہی مجاہد اعظم تھے جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں دہلی آ کر جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم کو انگریز کے خلاف سرد جنگ کرنے والا محاذ جنگ بنا دیا تھا، اور علی گڑھ پہنچ کر حریت پسند گروہ کو جمع کر کے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی تھی، اور علمائے ہند کے ساتھ گریجویٹ نوجوانوں کو شریک کار ہونے کے لیے آواز دی تھی، اور اسے جنگ آزادی کے لیے اچھا موڑ سمجھا تھا۔

قومی یکجہتی:

یہ تھے مولانا محمد قاسم کے تربیت یافتہ پہلے سپاہی جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر برطانوی سامراج کو پہلی ٹکر دی تھی، اور ایک بین الاقوامی محاذ جنگ کھول کر اس میں ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی، اور راجہ مہندر پرتاپ کو ساتھ لے کر ہندو مسلم اتحاد کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔

چھاؤنی کے سالار:

یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم کے متعلق فرمایا تھا کہ 'دارالعلوم تو میرے سامنے قائم ہوا، حضرت الاستاد نے اسے صرف تعلیم گاہ نہیں بنایا تھا بلکہ ایک چھاؤنی قائم کی تھی'۔ (سوانح قاسمی)

یہ شہادت اس بطل حریت کی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی تھے، اور حضرت نانوتوی کی چھاؤنی کے پہلے کمانڈر بھی، اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے شیخ الہند بھی، حتیٰ کہ دیوبند کی خانقاہ کے شیخ المشائخ بھی۔ دیوبند کے دارالمصنفین کے صاحب قلم بھی، علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام حضرت مدنی کے مربی اور استاد بھی۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصل بہار پر

تحریک کی ابتدا:

حضرت نانوتوی نے دیوبند کو مرکز بنا کر ایک طرف مرادآباد اور گلاوٹھی میں اسی نمونے کے مدرسے قائم کیے، اور لوگوں کے سپرد کر دیا کہ چلاؤ بھی اور نمونے کے انسان بھی بناؤ۔ اس طرح انھوں نے دارالعلوم کو تحریک بنا دیا تھا۔

مسلسل جدوجہد:

پھر حضرت شیخ الہند کا دور آیا تو انھوں نے مدارس اسلامیہ کا جال بچھا دیا۔ سرحد سے لے کر آسام اور برما تک لوگوں کو اساتذہ دیے، نظام دیا، نصاب تعلیم دیا، اصول تربیت دیے اور آزادی کی امنگ بھی دی۔ پھر اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے مذہب کے زندہ رکھنے، اسے طاقت ور کرنے، آزاد کرنے کے لیے سر کھپانے اور جاں بازی کے گر بتائے، اور مل جل کر آگے بڑھنے کا

حوصلہ بھی دیا، سلیقہ بھی۔

انداز کار:

اس طرح حضرت نانوتوی کا دارالعلوم ایک تحریک بنتا چلا گیا، تعلیمی تحریک، تہذیبی تحریک، اسلامی تحریک، سیاسی تحریک اور احسانی تحریک۔ پھر یہی تحریک چھاؤنی بن کر ہر علاقے، ہر صوبے اور تمام ممالک اسلامیہ میں قائم ہوتی چلی گئی۔ یہی چھاؤنی کہیں دارالعلوم تھی، کہیں جمعیۃ علمائے ہند، کہیں امارت شرعیہ، کہیں مجلس احرار، کہیں تحریک خلافت، کہیں ریشمی رومال۔

زندہ چھاؤنیاں:

اور آج بھی ملی کونسل، مرکزی جمعیۃ علمائے ہند، علماء کونسل اسی طرح کام کر رہی ہیں جیسے ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ علمائے ہند کام کرتی تھی، اور اس کا ڈھانچہ آج بھی قائم ہے۔ کاش اس میں کوئی مولانا سجاد کی طرح قربانی کی بے لاگ روح پھونک دیتا۔

جنگ کے ہتھیار:

دارالعلوم کو مرکز بنا کر جس طرح حضرت نانوتوی نے بلکہ ان کے کردار، ان کی جدوجہد، اور جاں بازی نے اسے چھاؤنی بنا دیا تھا، اسی طرح شیخ الہند کی تحریکات ان کی جاں سپاریاں اور سر سے کفن باندھ کر سفر، اور مالٹا کا سفر اور ریشمی رومال والی جدوجہد نے نہ صرف دارالعلوم کو چھاؤنی بنائے رکھا، بلکہ پورے برصغیر میں جگہ جگہ چھاؤنیاں قائم کر دیں اور پوری حوصلہ مندی سے ان کی سرپرستی فرماتے رہے۔

جمعیۃ الانصار:

مثلاً (۱) حضرت نے مولانا سندھی کو بلا کر فضلائے دیوبند کی جمعیۃ بنوائی، اور اسے مراد آباد تک کا سفر کرا دیا، پھر میرٹھ بھی لائے تھے۔

ترجمہ قرآن:

۲) مولانا عبیداللہ سندھی کو دہلی بھیج کر دارالمعارف قائم کرایا اور مسجد فتح پوری میں قرآن کے ترجمہ کے ذریعہ اہل دہلی میں آزادی کی روح پھونک دی، جہاں قرآن کی قومی وسیاسی وملی سرگرمیوں کو سننے کے لیے حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری آ کر درس لیا کرتے تھے۔

اس لیے وہ ایک اسلامی چھاؤنی بنتی جارہی تھی۔

یہی دارالمعارف تھا کہ جب وائسرائے کی نظر میں بغاوت کا مرکز بن گیا تو برطانوی ڈپلومیسی نے اسے بند کرادیا، اورشیخ الہند نے مولانا سندھی کو کابل بھیج دیا، جہاں انھوں نے ایک بین الاقوامی چھاؤنی قائم کردی۔

۳) شیخ الہند کے بعدان کی چھاؤنی کے لوگوں نے مختلف محاذوں پر کام شروع کردیا۔علامہ انورشاہ کشمیری، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری اور مولانا محمد یوسف بنوری نے قادیانیوں کے خلاف محاذ جنگ کھول دیا، حتیٰ کہ ان کو خارج از اسلام قرار دے کر فتنے کا سر کچل دیا۔

رد بدعت:

۴) مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا معظم علی بجنوری، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ارشاداحمد فیض آبادی نے اہل بدعت کو للکارا، اورامت کے سامنے ان کی کمزوریاں کھول کر رکھ دیں جس سے پورا ملک واقف ہوگیا اور سنت و بدعت میں امتیاز پیدا ہوگیا۔

سیاسی چھاؤنی:

۵) حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ شاہ جہاں پوری، مولانا احمد سعید دہلوی خان عبدالغفار صاحب، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا محمد قاسم شاہ جہاں پوری، مولانا منت اللہ بہاری، مولانا سجاد صاحب، مولانا حکیم محمد زماں صاحب، مولانا محمد میاں صاحب جیسے ہزاروں افراد جمعیۃ علمائے ہند، احرار، امارت شرعیہ جیسے مختلف پلیٹ فارموں سے سیاست کے میدان میں آئے تو ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء تک لڑتے ہی رہ گئے۔کبھی جیل، کبھی ریل، کبھی سزا، کبھی قرقی، کبھی لاٹھی چارج، کبھی گولیوں کا سامنا کرنا پڑا تو کراچی، قصہ خوانی بازار اور جلیان والا باغ ان کی یادگاریں بن گئیں۔

سد سکندری:

اس طرح حضرت نانوتوی کی دینی حمیت اوراسلامی غیرت نے پہلے دارالعلوم کو تحریک بنایا، پھر اسے چھاؤنی کا رنگ دے کر اور جہاں تہاں دشمنان اسلام سے مقابلہ کرکے ایسی سد

سکندری قائم کردی کہ اسے کوئی عبور نہیں کرسکا۔اس لیے بحمداللہ برصغیر کو اسپین بنانے کا کوئی حوصلہ نہیں کرسکا۔

بحمداللہ آج تک وہ سد سکندری قائم ہے،اوراگر وہ چھاؤنیاں حضرت نانوتوی کے انداز سے کام کرتی رہیں تو کل بھی کوئی مائی کا لال اس روحانی ہمالیہ کو عبور نہیں کرسکے گا۔

❑❑❑

ماخذ:'دانشور' گورکھ پور۔۲۰۰۰ء

قطب عالم شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی

میں ہردوئی سے کانپور جارہا تھا، راستے میں ملاؤں آیا تو یاد آیا کہ قطب عالم شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی کا تعلق اسی قصبے سے تھا۔ ساتھیوں نے خوش خبری دی کہ گنج مراد آباد بھی راستے ہی میں ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔

حاضری:

گنج مراد آباد ایک معمولی قصبہ ہے، معمولی بازار ہے، معمولی عمارتیں اور سیدھے سادے لوگ۔ اتر کر مولانا کو پوچھا تو کسی کو معلوم نہیں تھا۔ بابا کو پوچھا تو بتایا گیا کہ قصبے سے باہر ان کی درگاہ ہے، وہاں ایک بڑی مسجد ہے، بابری مسجد کی طرح تین گنبد والی۔ سامنے چند مزارات ہیں، بائیں رہائشی کمرے ہیں اور سب بالکل ہی سنسان۔ وہاں جاکر جہاں اس ولی کامل نے برسہا برس عبادت کی تھی وہاں ہم نے بھی دو رکعت نماز پڑھی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ قبریں کئی ہیں۔ کون کس کی ہے؟ اتنے میں آہٹ سی معلوم ہوئی، گھر کی کوئی خاتون تھیں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے مزار کی کنجی لاکر دیدی اور بتایا کہ بیچ کی قبر حضرت مولانا کی ہے۔ حاضری دی سورہ یس پڑھی، ایصال ثواب کیا مگر ان کی عظمت واحترام اور روحانیت سے دل کانپ رہا تھا۔

درس بخاری:

صحن مسجد میں آئے تو بہت سے واقعات یاد آتے چلے گئے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں شیخ وقت درس بخاری دیتے تھے اور اس شان سے کہ علما کی پوری جماعت میں کوئی کسی کو مولوی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی اس مولوی کو چپت رسید کردیتے جو بے سمجھے بوجھے کسی کو مولوی کہہ دیتا تھا اور سارا مجمع دم بخود رہتا تھا۔ مولوی کے معنی ''مولا والا'' بتاتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی کے اچھے شاگردوں میں تھے۔حدیث سے ذوق تھا اس لیے ظہر بعد درس دیا کرتے تھے۔ اور جدمحترم حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی کو فیض آباد میں دیکھا کہ وہ ظہر بعد پابندی سے بخاری کا ایک دو ورق پڑھا کرتے تھے صرف تبرکاً۔ پھر کتاب کو جزدان میں بند کر کے رکھ دیتے تھے اور دوسری کتاب پڑھتے تھے۔

حدیث کی مقبولیت:

دادامیاں سے سنا تھا کہ حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ’آدمی جب حدیث پڑھتا ہے تو اللہ تعالی اس کا منہ چوم لیتے ہیں۔‘ یہ بات اس طرح وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو مقبولیت کی معراج حاصل ہو۔اور غالباً مولانا کے حالات گواہی دیتے ہیں کہ وہ شیخ وقت اور مقبولیت کے اعلی مدارج پر تھے۔اسی لیے ہاتھ اٹھا کر جو دعا فرماتے تھے اسی طرح ہو بھی جاتا تھا۔

میں نے دادامیاں سے سنا تھا کہ حضرت مدنی کے والد محترم جو قریب کے قصبے بانگرمئو میں مدرس تھے۔وہ اپنے بچوں کو لے کر مولانا کی خدمت میں آئے تو شیخ وقت نے فرمایا کہ ان بچوں کو گنگوہ پہنچادو، میں وہاں حدیث کا نور دیکھتا ہوں۔اور سید حبیب اللہ صاحب فیض آبادی نے بچوں کو گنگوہ پہنچا دیا۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو ان کی توجہات عالیہ نے دیوبند گنگوہ اور مدینہ طیبہ کی خدمت سے شیخ العرب والعجم بنادیا (رحمہ اللہ تعالی) اتنی دوررس تھی نگاہ ان کی۔

گفتار مولانا:

صحن کے باہر وہ جگہ دیکھی جہاں کھڑے ہو کر انگریز گورنر لاٹوش نے حضرت مولانا سے عرض کیا تھا کہ ’دعا کیجیے ہماری حکومت ہمیشہ رہے۔‘ تو حضرت شیخ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، یہ درخواست سن کر اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ’سلطنت کسی کے باوا کی نہیں ہے، خدا کی ہے۔جب تک انصاف کرو گے قائم رہو گے، جب انصاف چھوڑ دو گے مٹا دیے جاؤ گے۔‘ اللہ اکبر

ذرا دیکھئے تو انگریز گورنر کھڑا ہے اور اس سے اتنی سخت بات کون کہہ رہا ہے۔ایک ایسا درویش جسے خدا نے قلندری تیور عطا کیے تھے۔ پھر لاٹوش نے بچے کے لیے دعا کی درخواست کی اور آپ نے دعا فرمادی اور اس کی بیوی کو دوکان سے لڈو منگا کر عطا فرمایے۔ پھر تو صاحب اولاد بھی ہو گیا گورنر۔

الٹی دعا:

میں مسجد کے صحن میں ٹہلتا رہا اور ماضی کے جھروکے سے حضرت مولانا کا دربار دیکھتا چلا گیا۔

یہی وہ صحن مسجد ہے جہاں غالبًا ۱۸۹۰ء میں دادا میاں نے بحیثیت تحصیل دار حاضری دی تھی اور حضرت مولانا سے تمام لوگوں کی طرح دعا کی درخواست کی کہ 'دعا کر دیجیے میں انچارج تحصیل دار ہوں، مستقل تحصیل دار ہو جاؤں۔' اور حضرت مولانا نے حسب معمول فرمایا کہ سب لوگ دعا کرو۔ سب نے ہاتھ اٹھا دیے تو فرمایا ''اے اللہ! منشی عبدالرحیم کو کبھی تحصیل دار نہ بنائیو۔''

دادا میاں کہتے تھے کہ میں دعا سن کر حیران رہ گیا۔ میں جناب ڈپٹی وجیہہ الدین صاحب کے ساتھ گیا تھا، وہ بھی حیران ہو گئے کہ شیخ نے الٹی دعا کیسے کر دی؟ کیوں کر دی؟ کیا مصلحت تھی؟ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے پوچھ سکے کہ آپ نے ایسی الٹی دعا کیوں کر دی؟ مگر اس دعا نے منشی عبدالرحیم کی کایا پلٹ دی۔ ہم نے فیض آباد میں ان کو اس وقت دیکھا ہے جب پولیس لائن کی مسجد میں بڑے سے بڑا عہدیدار آ کر دعا کرواتا تھا۔ چنانچہ سید صدیق حسن اور مسعود علی صاحب کمشنر فیض آباد کو دیکھا ہے، وہ آتے تھے اور چٹائی پر بیٹھ کر مراقبہ کرتے تھے اور ذکر اللہ کی لذت اٹھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

نور ایمان:

میں نے مسجد کی بائیں طرف اس کمرے کو تلاش کیا مگر وہ نئی عمارت میں چھپ گیا ہے، ملا نہیں۔ جہاں حضرت مولانا قیام فرماتے تھے۔ دادا میاں کہتے تھے کہ 'ایک مرتبہ طبیعت بہت الجھ گئی تو آپ کے ساتھ آپ کے کمرے میں چلا گیا۔' آپ نے پوچھا 'کیسے آئے؟' میں نے کہا کہ 'دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں، نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔'

مولانا اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا کہ 'بیٹھ جاؤ۔' میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ فرمایا 'آنکھیں بند کر لو'، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں فرمایا کہ 'کھول دو آنکھیں۔' میں نے کھول دیں آنکھیں اور پھر چلا آیا۔ فرمایا کہ 'وہ دن تھا اور آج کا دن ہے کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کوئی شبہہ نہیں ہوا اور مطمئن رہا اور جو وہاں سے نکلا تو میرا دل روشن تھا۔ میں اس کی روشنی میں دور دور کی چیزیں دیکھ لیتا تھا مگر وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔' شاید اسی طرح کی کوئی

نورانیت ہوگی جس کو پیغمبر اعظم ﷺ نے فرمایا:

فراست مومن:

''اتقوا من فراسة المومن فانه ينظر بنور الله'' یعنی قلب مومن جب ایمان و یقین کی کیفیت سے منور ہو جاتا ہے تو اس میں فراست ایمان پیدا ہو جاتی ہے جس سے عام لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔اسی لیے ان کا لحاظ کرنے کی تاکید فرمائی ہے ''اتقوا من فراسة المومن'' اس مقام پر سمجھ میں آتا ہے کہ جب آدمی کا دل و دماغ مطمئن نہ ہو تو کیا کرے؟ کتاب پڑھے؟ نماز پڑھے؟ قرآن یاد کرے؟ اہل اللہ کہتے ہیں کہ'احسان کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے یہ کوئی چیز کارآمد نہیں۔اگر کارآمد ہے تو شیخ کامل کی محبت، کسی صاحب دل سے بیعت اور ذکراللہ کی مشغولیت۔یہاں تک کہ اس کا دل خدا کی محبت سے معمور ہو جائے۔'اسی محبت سے احسان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے حدیث جبریل میں حضور ﷺ نے بتایا ہے اور اہل اللہ نے اس کو عملی شکل دیدی ہے۔اور اسی محبت کے لیے ارشاد ہے کہ'' تمہارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک خدا اور رسول کی محبت ہر چیز سے زیادہ نہ ہو جائے حتی کہ جان مال اور اولاد سے بھی۔'' اور اس محبت کے صرف دو طریقے ہیں۔

اول انبیا یا اولیاء اللہ کی صحبت۔دوسرا طریقہ ہے ذکراللہ کی کثرت، تا آنکہ محبت پیدا ہو جائے۔اس محبت سے فراست پیدا ہوتی، اس سے نور ایمان پیدا ہوتا ہے اور اسی سے محبوبیت جنم لیتی ہے جس کی خوش خبری قرآن نے دی ہے:''قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونی يحببكم الله''

درگاہ والے:

جب ہم وہاں سے واپس ہونے لگے تو دروازہ پر آواز دے کر بلایا گیا تو کوئی پردہ نشیں عورت دروازے تک آ گئیں، ان کو کنجی حوالے کی گئی اور میں نے مساۃ سے پوچھا کہ'مولانا فضل الرحمان کہاں رہتے ہیں؟' اس نے کہا کہ'یہی ان کا گھر ہے پھر بتایا کہ وہ کسی تقریب میں سیتاپور گئے ہیں۔' میں نے کہا کہ'آویں تو ان سے کہنا افضال صاحب آئے تھے، امروہہ میں آپ کو پڑھایا تھا، سلام کہہ گئے ہیں۔'

میں نے اس لڑکے کو دارالعلوم چلہ امروہہ میں بخاری شریف کا درس دیا تھا۔لڑکا بہت

ہونہار اور قابل قدر تھا۔ آج بھی اس نے وہاں علم وعمل کی روشنی پھیلا رکھی ہے، اس لیے دوسری درگاہوں کی طرح وہاں خرافات نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ماشاءاللہ

شانِ الٰہی:

آج درگاہ کا سناٹا دیکھ کر اور کل اس دربار کا ہجوم سن کر باور کرنا پڑتا ہے کہ علم، فن اور مہارت پر کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ کل انہیں بزرگ سے بڑا سے بڑا عالم بزرگ آکر فیض حاصل کرتا تھا، آج چڑیا پر نہیں مارتی۔ یہ خدا کی مرضی پر ہے جسے چاہے علم سے نوازے، جسے چاہے فن دیدے اور جس سے چاہے لے لے تو واپس نہ دے۔ **له الخلق و الامر**

حضرت مولانا کے تقدس، علمیت اور احتیاط اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ غیر مقلدین کے نواب صدیق حسن صاحب اور وحید الزماں حیدرآبادی جیسے علم وفن کے ستون اور تقلید کے دشمن بھی مولانا فضل الرحمان کی روحانیت، علم وعمل اور اخلاص ومحبت کو سرمایہ آخرت سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت مولانا سے بیعت ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری جیسا عالم فاضل بھی ناز کرتا تھا کہ انھوں نے حضرت مولانا کی صحبت اٹھائی ہے۔

وسعت قلب:

مولانا کی وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ اور نور ایمان اس قدر روشن تھا کہ ایک عالم سے فرمادیا کہ 'میاں! اذان دیدو' وہ جانے لگے تو کشمکش میں تھے کہ احناف کی طرح اذان دوں یا غیر مقلدین کی طرح۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ 'جیسی چاہے اذان دیدو، اذان ہوجائے گی' اس پر وہ بہت پشیمان ہوئے اور اس مسجد میں ہمیشہ جیسی اذان ہوتی تھی اسی طرح کی اذان دیدی۔

قدر گوہر:

دادا میاں کہتے تھے کہ حضرت مولانا کے یہاں ایک پنجابی عالم آئے اور بیعت ہوگئے۔ مولانا نے ان کو خلافت عطا کردی اور ان کے حالات سے اس قدر خوش اور مطمئن تھے کہ خود اپنی لخت جگر کی ان سے شادی کردی۔ سبحان اللہ! مگر یہ بات گھر والوں اور خاندان والوں کو بہت گراں ہوئی۔ اس لیے حضرت کے صاحبزادے احمد میاں بہت سخت سست کہا کرتے تھے کہ معلوم نہیں کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ مگر حضرت نے اس کو خلافت دیدی۔ اس بے چارے کو معلوم نہیں کہ "قدر

گوہر شاہ داند یا بداند جوہری‘ چنانچہ مولانا کے وصال کے بعد دادا میاں بہت پریشان رہے اور سالوں پریشان رہے۔آخر ان سے خواب میں بتایا گیا کہ تم حضرت مولانا کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب کے یہاں جاؤ۔جدمحترم گنج مرادآباد پہنچے اور سالوں کے بعد پہنچے تو حضرت مولانا کا سارا خاندان مولانا عبدالکریم صاحب سے بیزار تھا مگر جدمحترم خواب کی بشارت کے مطابق مولانا عبدالکریم صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا’’ آؤ عبدالرحیم تم نے بڑاانتظار کرایا۔‘‘

چنانچہ کچھ مہینے ساتھ رکھا،تزکیہ قلب اور مراقبہ میں جو کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کرائی پھر خلافت عطا کی اور رخصت کیا۔

نور ایمان:

رخصت کرتے وقت مولانا نے دو باتیں فرمائیں۔پہلی بات یہ کہ فیض آباد جا کر کام کرنا ہے۔چنانچہ وہ حکم کے مطابق فیض آباد پہلی بار آئے اور غالباً ۱۹۱۴ء میں آئے اور پہلے سرائے کی مسجد میں قیام کیا پھر پولیس لائن کے پاس ایک ویران مسجد کو آباد کر کے وہاں مقیم ہو گئے اور ۵۲ر برس وہیں رہ گئے۔فیض آباد، گونڈہ،بستی، بہرائچ، بارہ بنکی،سلطان پور، پرتاب گڑھ وغیرہ کے ہزاروں افراد کی اصلاح دین ہوتی رہی اور بڑے بڑے معرکے سر کرنے پڑے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ تم کو کام تو کرنا ہے فیض آباد لیکن تمہاری قبر پورب کے کسی ضلع میں ہے۔چنانچہ جب ضعف زیادہ ہو گیا تو ہم لوگ اعظم گڑھ گھوسی کے قریب رگھولی اپنے وطن لے آئے اور ۱۹۵۷ء میں وہیں انتقال فرمایا۔اس طرح حضرت مولانا کے خلیفہ نے جو دو پیشین گوئیاں فرمائی تھیں وہ دونوں صحیح ثابت ہوئیں لیکن خاندان والوں کو کبھی اطمینان نہیں ہوا کہ یہ بھی کوئی ہستی ہے،قابل قدر ہستی۔اور مولانا کو بھی شکایت نہیں ہوئی کہ شیخ زادے ہیں،ان کا احترام ضروری ہے۔یہ تھی حضرت مولانا کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ باطنی کے نتائج اور نمونے۔

❑❑❑

ماخذ:مجلّہ’سراج الاسلام‘مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نمبر۔۲۰۱۶ء

شیخ الہند کی انفرادیت

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

دیوبند میں ملا محمود مرحوم نے محرم ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۸ء میں جس بچے محمود حسن کی بسم اللہ کرا کے مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، کسے معلوم تھا کہ یہ بچہ بنیادی پتھر ہے جو اپنے سینے پر علم وعمل کی ایسی شاندار عمارتیں اٹھائے گا۔ مگر زمانے کو یاد ہے کہ وہ بچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس بن گیا اور پھر بمبئی میں اسے ہندوستان کے تمام سیاست دانوں اور رہنماؤں نے 'شیخ الہند' کا عوامی لقب دیا۔ آیئے! ہم تلاش کریں کہ آپ کی انفرادیت کے وہ عناصر کیا کیا تھے؟ جنھوں نے آپ کی ہستی کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

حضرت شیخ الہند کی انفرادیت کے چار نمونے ہمارے سامنے ہیں، وہ اس کے گواہ ہیں کہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ کیوں کہ دنیا میں روزانہ تقریباً ۲/ لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں مگر منفرد صلاحیتیں قدرت کبھی کبھار پیدا کرتی ہے۔ پھر ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو سازگار ماحول، بہتر سرپرست اور حالات کے زبردست جھونکے اچھال کر کسی علمی یا سیاسی یا تجرباتی سطح پر پہنچا دیتے ہیں، اور وہاں وہ اپنا مقام بنا لیتے ہیں، جیسے مولانا محمد علی جوہر، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا حفظ الرحمٰن اور مسز اندرا گاندھی۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو اس کا ماحول نہیں پیدا کرتا بلکہ قدرت اس میں اتنی توانائی دیتی ہے کہ وہ اپنی ہستی کا تانا بانا خود مرتب کرتا ہے، یا اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے اسباب خود مہیا کرتا ہے۔ پھر جس طرف وہ نکل جاتا ہے، اس کی انفرادیت اسے ممتاز کر دیتی ہے اور زمانہ

اسے دیکھتا رہ جاتا ہے، جیسے سیلاب کا پانی اپنا راستہ خود بنا تا ہے، اور راستے کی رکاوٹیں ہٹ کر اس کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم، امام الہند مولانا آزاد اور بابائے قوم مہاتما گاندھی ایسے ہی لوگ تھے۔ اور اگر آپ حالات کا تجزیہ کریں گے تو حضرت شیخ الہند اسی صف اول میں نظر آویں گے جسے قدرت صدیوں میں پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ آپ کی ہستی میں انفرادیت کے چار پہلو ایسے ہیں جنھیں آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۱) بچپن میں اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے خود سازی۔

۲) درس کے ذریعہ طلبہ کی مردم سازی۔

۳) ریشمی رومال تحریک آزادی ہند۔

۴) سیاسی کارکنوں کے لیے آپ کی قیمتی وصیتیں۔

۱) تکمیل شخصیت:

حضرت مولانا محمود حسن مدرسہ دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم ہیں، اس لیے ان کی جو قیمت ہے، وہ معلوم ہے۔ لیکن جب وہ اپنی طالب علمی کی آخری منزل میں پہنچے، اس وقت دیوبند کا مدرسہ دارالعلوم بن چکا تھا۔ چنانچہ وہاں پہلی جماعت نے ۱۲۷۹ھ میں دورۂ حدیث پڑھا ہے اور وہاں کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا علم و فضل مسلم ہے۔ اور دوسرے اساتذہ کرام بھی تھے، اس کے باوجود مولانا نے دورۂ حدیث کے لیے دیوبند سے میرٹھ جا کر وہاں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ سے حدیث پڑھی، جہاں حضرت مولانا ایک مطبع میں کتابوں کی تصحیح فرمایا کرتے تھے، اور اس زمانہ میں آپ نے امام بخاری کی ان تنقیدوں کا معرکۃ الآرا جواب مرتب فرمایا تھا جو امام اعظم رحمہ اللہ کے خلاف انھوں نے کی ہیں، اور وہ پوری کتاب میں بکھری پڑی ہیں۔ ایسی مایہ ناز ہستی سے حدیث پڑھنا طے کیا اور اس کے لیے گھر چھوڑ کر وہاں قیام فرمایا اور سفر حضر میں ساتھ رہ کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ پھر دارالعلوم میں جو دورۂ حدیث ایک سال میں ہوتا ہے، حضرت شیخ نے وہ علم دو سالوں میں حاصل کیا۔ اس طرح ایک خود کار مشین کی طرح انھوں نے اپنا راستہ خود طے فرمایا، اور یہی نہیں بلکہ عربی ادب

حاصل کرنے کے لیےانھوں نے دیو بند سے باہر جاکراس کی تکمیل فرمائی۔

طالب علمی کے دور میں معراج کمال حاصل کرنے کی یہ فکراور یہ اقدام بتا رہا تھا کہ یہ اس طالب علم کوایک دن زمانہ ساز بننا ہے،اور بحمد للہ وہ بن کر رہا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

۲)مردم سازی:

حضرت شیخ الہند ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم کے معین المدرس مقرر ہوئے،لیکن چند ہی سالوں میں مجلس شوریٰ کی جوہر شناسی نے آپ کو ۱۳۰۸ھ میں صدر المدرسین بنا دیا،اورآپ ۱۳۳۴ھ تک ۲۵/ برس اس منصب پر فائز رہے،مگر دارالعلوم میں اس سے پہلے اوراس کے بعد صدرالمدرسین آئے،اورتمام مدارس میں صدرالمدرسین رہتے ہیں،لیکن جوامتیاز آپ کے درس کو حاصل ہوا،اور جونئی سوجھ بوجھ آپ کے طلبہ میں پیدا ہوئی،اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔سوال یہ ہے کہ وہ امتیاز کیا تھا؟اور کیوں تھا؟اس کے جواب کے لیے چندواقعات پیش کرتا ہوں،اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی درسی خصوصیات کیا کیا تھیں؟اوروہ بتاتی ہیں کہ اگر آج انھیں اپنایا جائےتو آج بھی ان بنجروں سے ہیرے نکل سکتے ہیں۔

الف) آپ کے درس میں حکیم الامت حضرت تھانوی،علامہ مفتی کفایت اللہ،علامہ انورشاہ کشمیری،رئیس الاحرار مولانا عبیداللہ سندھی،شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی،امام تبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی،مولانا عزیرگل صاحب،مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ایسےایسے رجال کار تھےجن کی ذکاوت،علمیت اورحکمتوں پرہم لوگ آج بھی سر دھنتے ہیں،مگرایسےایسےاصحاب فن عمر بھرحضرت شیخ الہند کی شاگردی پرفخر کرتے تھے،اوران کےعلم وفن کی بصیرت اوردرسی امتیاز سے نہ صرف مطمئن تھے بلکہ ان کے عاشق تھے۔اور یہ عشق کسی طالب علم میں جب ہی پیدا ہوتا ہے، جب اس نےطلبہ کی ذہانت کواپنی برتر ذکاوت سے دبا دیا ہو۔اوران کی شخصیت کی تکمیل میں ان کی بھرپور مدد کی ہو،ورنہ ذہین بچے بڑے بڑوں کوخاطر میں نہیں لاتے اور جب تک ان سے کوئی اپنا لوہا نہ منوالے،وہ قائل نہیں ہوتے۔اور جو اگر قائل ہوگئےتو عمر بھر کے لیے عاشق ہوجاتے ہیں،

جیسے حضرت شیخ الاسلام، حضرت علامہ ابراہیم اور شیخ الادب سے جن لوگوں نے پڑھا ہے، وہ عمر بھر ان کی شخصیت، ان کی فن کاری کو اپنا رہنما تسلیم کرتے رہیں گے، اور انھیں دعا دیتے رہیں گے۔

ناپختہ کار مربی:

یہ بات نہیں تھی کہ ایسے ایسے نادر روزگار بچے حضرت شیخ کے درس میں اتفاقاً جمع ہوجاتے تھے، اور آج کل ایسے بچے پیدا ہونا بند ہوگئے ہیں، یا وہ مدارس میں آتے ہی نہیں۔ میرے نزدیک ایسی کوئی بات نہیں ہے، اور ہرگز نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بات ہے کہ حضرت شیخ کی ذکاوت، تہ رسی اور مہارت علم وفن طلبہ کا ذہن کھول دیتی تھی۔ اور ذہن جب ایک مرتبہ کھل جاتا ہے تو وہ عمر بھر بند نہیں کیا جاسکتا۔ تو جن لوگوں کا ذہن حدیث، فقہ یا ادب یا معقولات کے لیے کھل گیا، وہ علامۂ وقت ہوکر رہے، جن کی نظیر آج کے برصغیر بلکہ پوری دنیا میں آپ کو نہیں ملے گی۔ جب کہ خود دارالعلوم کی پرشکوہ عمارت پہلے سے دس گنا بڑھ چکی ہے اور صرف دورۂ حدیث میں آج ۶۴۹ بچے ہیں، مگر ان کو فنی آبرو دینے والا کوئی محمود نہیں ہے، ورنہ ان میں سے بہت سے آج بھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہوجاتے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت شیخ میں حل مشکلات کی صلاحیت بے پناہ تھی، جس طرح انھوں نے دارالعلوم کے مسائل حل کیے، اور جس طرح انگریزی اقتدار کے مصائب کا حل تلاش کیے، اسی طرح علم دین کی مشکلات کو بھی چٹکی بجاتے حل کردیا کرتے تھے۔ فنی مشکلات حل کرنے کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک اس فن پر عبور، دوسرے مختلف فیہ مسائل میں قابل قبول موقف۔ ان دونوں میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا اس کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ ۱۳۱۶ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب دیوبند سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور وہاں حضرت شیخ الہند کی تاکید کے مطابق درس شروع کیا تو زبانی درس دیا کرتے تھے۔ اس لیے چند برسوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیخ حرم بنادیا تھا۔ چنانچہ ہر علم وفن اور ہر مسلک ومذہب کی فقہ وحدیث کی تمام کتابیں صبح سے رات تک آپ کے زیر درس رہا کرتی تھیں، اس عظمت کے باوجود حضرت مولانا اپنے استاذ حضرت شیخ الہند سے اس قدر متاثر تھے کہ خواہش ظاہر فرمائی کہ 'دیوبند آکر سبقاً سبقاً ترمذی وبخاری پڑھنا چاہتا ہوں۔' حضرت شیخ الہند کی اجازت کے بعد تشریف

لائے، چنانچہ علامہ ابراہیم بلیاوی فرماتے تھے کہ 'میرے دورہ کا سال تھا، معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب مدینہ سے حدیث پڑھنے آرہے ہیں۔ایک دن صبح کو ایک صاحب نے ترمذی پڑھنی شروع کردی تو ان کے عربی لہجے، بلند آواز اور زوردار قرأت سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مولانا آگئے۔'

فنی تعلیم:

استاد محترم حضرت مدنی علیہ الرحمہ نے ایک دن ترمذی کے سبق میں اپنے اس درس کا حال بیان فرمایا تھا، جس سے حضرت شیخ الہند کے انداز کا پتہ چل سکتا ہے۔فرمایا کہ 'کتاب الحج میں قِران کی بحث چل رہی تھی، مجھے اطمینان نہیں ہوا، میں نے ایک دو حدیثیں پیش کیں، حضرت نے ان کے جواب میں دوسری حدیثیں پیش فرمادیں، پھر میں نے حدیث پیش کی۔اس طرح دیر تک سبق چلتا رہا مگر مجھے تشفی نہیں ہوئی، تو حضرت نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ 'مولوی حسین احمد! تم حدیث کی کتابوں سے تمام حدیثوں کو اکٹھی کرلو، تب کل گفتگو ہوگی، اور سبق بند کردیا۔'

صبح کو پھر دریافت فرمایا کہ 'تم نے کیا کیا؟' تو میں نے عرض کیا کہ 'حضرت! تمام کتابوں سے میں نے ۱۲۶/احادیث جمع کرلی ہیں، اتنی ہی روایتیں صحاح ستہ اور دارقطنی وبیہقی میں مجھے مل سکی ہیں۔' تب فرمایا کہ 'اب تمھیں جو اشکال ہے وہ بیان کرو۔' میں نے عرض کیا کہ 'حضرت! مجھے اب کوئی اشکال نہیں رہا، فرمایا آگے چلو۔'

انداز تربیت:

اندازہ کیجیے کہ دارالعلوم کا محدث مسند درس پر ہے، اور شیخ حرم طالب علموں کی صف میں بیٹھ کر درس حاصل کررہا ہے۔مگر شیخ حرم ہے، اس لیے مختلف مذاہب، ان کے استدلال، ان کے احادیث کے موقف اور مستدلات کا حافظ ہے۔اور اپنے استاد سے مشکلات کے حل کی درخواست کرتا ہے، اور جب اشکال پیش کرتا ہے تو اسے وہ ڈانٹتے نہیں، یہ نہیں فرماتے کہ کمرے پر آجانا، بتادوں گا۔یہ بھی نہیں کرتے کہ کوئی قانون بنادیں کہ اس طرح کے سوالات کیے جائیں، اس طرح کے نہیں۔یہ کچھ نہیں کرتے، صرف یہ کرتے ہیں کہ شیخ حرم کے ذہن کی گرہ کھول دیتے ہیں،

اور جن روایتوں سے ان کا ذہن غیر مطمئن تھا، ان کا صحیح محمل اور مناسب موقف بیان کر کے سامنے رکھ دیتے ہیں، تا کہ ان کی عقل اور ان کا علم قبول کر لے۔ اسی طرح وہ طالب علم کی سعادت مندی سے چپ رہنے کی دہائی نہیں دیتے، بلکہ اسے اپنی علمی برتری، اپنی نکتہ رسی اور اپنی ذہانت سے مطمئن فرماتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں طالب علم اپنے استاد کا عاشق ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے واقعہ کی مثالیں ہم نے علامہ ابراہیم بلیاوی اور حضرت شیخ الاسلام کے یہاں دیکھی ہیں کہ اساتذۂ فن درسگاہ میں، کمرے میں، سفر میں، حضر میں، علمی اور فنی مسائل دریافت کرتے تھے، اور وہ بلا تکلف جواب دیتے تھے، اور انھیں مطمئن فرما دیتے تھے۔ اور ایسا اس لیے ہوتا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے یہی انھیں عطا کیا تھا۔

علمی تجسس:

ایک تیسرا واقعہ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ 'استاد محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہمیں مختلف قسم کے لوگوں سے مناظرہ کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ کہیں عیسائی، کہیں ہندو، کہیں بدعتی وغیرہ۔ میں اور مولانا محمود حسن وغیرہ ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ ہم صرف آپ سے یہ دریافت کرتے تھے کہ 'حضرت! اس مسئلہ میں ہمارا موقف کیا ہے؟ آپ موقف متعین کر دیں، ہم دلائل مہیا کر لیں گے۔' چنانچہ حضرت الاستاذ موقف معین کر دیتے تھے، اور ہم لوگ مناظرہ جیت لیتے تھے۔' اس طرح مناظروں میں نئے سوالات کے لیے نئے جوابات تلاش کرنا اور انھیں عقل، قرآن، حدیث اور فقہ کے مطابق بنانا آسان نہیں تھا، بلکہ یہ حضرات اپنی ذہانت، علمیت اور نکتہ رسی سے اس کے عادی تھے، اس لیے جب مسند درس پر پہنچتے تو حل مسائل کے عادی تھے تو اپنے طلبہ کو بھی اسی طرح مطمئن فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے بہت سے شاگرد شیخ التفسیر، شیخ الحدیث، شیخ المعقولات، شیخ الادب اور شیخ الاسلام بن گئے۔ **قدس اللہ اسرارھم**

یہاں ایک نازک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نے مدرسہ کے طلبہ کو اس طرح پڑھانے کی ضرورت کیسے محسوس فرمائی؟

اس سوال کا جواب مشکل ہے مگر کسی نے حضرت شیخ سے کہا تھا کہ' آپ علمائے سلف کی طرح کتابیں کیوں نہیں تحریر فرماتے؟' حضرت مولانا نے جو جواب دیا تھا، اس میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ' کتابیں لکھنے والے بہت ہیں، آدمی بنانے والے نہیں ہیں۔ میں آدمی بنانا چاہتا ہوں۔' (اوکما قال)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بچوں کی تربیت، ان کی اصلاح اور ان کی ایسی سرپرستی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹوں کی کرتا ہے، اس وجہ سے آسان ہوگئی تھی کہ انھوں نے اس مرحلہ کو اپنی زندگی کا موضوع بنالیا تھا۔ اس لیے آپ نے اس کے وہ تمام تقاضے بھی پورے فرمائے، اور ہنسی خوشی پورے فرمائے۔ اور جب کوئی منفرد صلاحیت کا آدمی مردم سازی کو اپنا موضوع بنائے گا تو مردم سازی کے ایسے ہی نمونے سامنے آئیں گے، جیسے نمونے حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا رشید احمد، حضرت مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی بارگاہوں میں ہم نے دیکھے اور سنے ہیں۔ کیوں کہ پھر ان کی ہر مجلس سونے چاندی کی کان بن جاتی ہے، اور نا قابل ادراک بہتر سے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس لیے احسان دانش نے کہا، اور خوب کہا ہے۔

میرے شہ پاروں کی کھائیں گے قسم اہل ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغ شام سے

ریشمی رومال تحریک حریت:

یہ تحریک حضرت مولانا کا عجیب وغریب کارنامہ ہے کہ ایک گوشہ نشین درویش، اور ایک عالم دین بزرگ نے آج سے ۶۵ / برس پہلے برطانوی سامراج کا جنازہ نکالنے کے لیے سلطنت عثمانی، افغانستان، روس اور ہندوستان کے تمام اہم مراکز کو تیار کر کے جنگ آزادی کا بگل بجادیا تھا۔

ذہنی انقلاب:

ہندوستان میں علما اور مشائخ یا مدرسہ وخانقاہ کی کمی کبھی نہیں تھی، مگر علما اور بزرگوں کے ہاتھوں میں تلواریں دے کر میدان جنگ میں لے آنا حضرت شاہ ولی اللہ کا عظیم الشان انقلابی

کارنامہ تھا۔ چنانچہ ان کے خانوادے سے مولانا سید احمد شہید کی قیادت میں ۱۸۳۱ء میں علما اور مشائخ نے اٹھ کر دہلی سے پشاور تک ہلچل ڈال دی تھی۔ اس کے بعد جب انگریزوں کے قدم جمنے لگے تو پھر علما اٹھے، اور حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کا جہاد کیا، اور شاملی کے میدان میں مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد رحمہم اللہ نے دو بدو جنگ فرمائی، اور ان کے چھکے چھڑا دیے۔ مگر کسی مرکزیت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ انقلاب کامیاب نہیں ہوسکا، اس لیے سب لوگ منتشر ہو گئے۔

حوصلہ بخشی:

ان دونوں تحریکات کی ناکامی کے باوجود ہندوستان کے علما و مشائخ کا یہ گروہ خاموش نہیں ہوا۔ کیوں کہ شاہ ولی اللہ کی ذہنی تربیت نے جو جرأت و دوررسی پیدا کردی تھی، وہ کسی صاحب علم کو اپنے مقصد پر قربان تو کرسکتی ہے، کسی ناکامی سے مایوس نہیں کرسکتی۔ اس لیے جو حضرات باقی رہ گئے تھے، انھوں نے جنگ کا رخ بدل دیا۔ چنانچہ اس انقلاب میں ناکامی کی تلافی کے لیے دس برس ہی میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا گروہ پھر میدان عمل میں کود پڑا، اور ۱۸۶۷ء میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اسے بہت جلد انقلابی کارکنوں کی چھاؤنی بنادیا گیا، اور اس میں ایسے مجاہدین تیار کیے جانے لگے جن پر علم دین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں اور اندر اندر جہاد کا خون جوش مار رہا تھا۔

سمت سفر:

مجاہدین آزادی کی یہ علمی چھاؤنی اس وقت شباب پر آ گئی جب مولانا محمود حسن دارالعلوم کے مدرس بن گئے، اور انھوں نے اپنے استاذ محترم مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی اس سمت سفر کو طے کرنا شروع کردیا جو مکمل آزادیٔ ملک کی منزل کے لیے انھوں نے مقرر کردی تھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں چند قدم کا فاصلہ بھی طے کر گئے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

آغاز کار:

مولانا محمود حسن کو ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم میں درس کے لیے منتخب کرلیا گیا تو انھوں نے

سب سے پہلے ''ثمرۃ التربیت'' کی اس انجمن کو زندہ و متحرک کر دیا جس کو طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے وہ پہلے سے قائم کر چکے تھے۔ ان کی یہ تحریک آگے بڑھی، اور اتنی بڑھی کہ ۱۳۳۵ھ میں ریشمی رومال تحریک بن کر اپنے انجام کو پہنچی۔

اسباب بغاوت:

سوال یہ ہے کہ تحریک کے اسباب کیا تھے؟ اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ اس کے چار اسباب تھے۔

اول یہ کہ مولانا محمود حسن نے ان بزرگوں کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے کمانڈر تھے، اور اس کی ناکامی کی کسک محسوس کر رہے تھے، اور تھک کر بیٹھ جانے کی بجائے سراپا عمل بن گئے تھے۔ اس لیے حضرت مولانا کی رگ و پے میں انقلابی خون دوڑ رہا تھا جو انھیں بے چین، سرگرم اور متحرک رکھتا تھا۔

نظریاتی جنگ:

دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں اور علمائے دیوبند کی جنگ ملکی اور غیر ملکی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ نظریاتی جنگ تھی۔ انگریز مغل حکومت کو ختم کرنے کے بعد مسلمانوں کی ملّی خصوصیات اور ان کی اسلامی انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے مختلف قسم کی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے، اور اس کے لیے ان کے پادری، ان کے مشن اور ان کے خزانے کھلے ہوئے تھے جس سے عوام وخواص میں سراسیمگی پیدا ہو رہی تھی اور اسلامی اصول سر عام مجروح ہو رہے تھے۔

بربریت:

تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج کے بے پناہ مظالم اور مسلم دشمنی میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد زبردست اضافہ ہو گیا، جس کی وجہ سے ہندوستان کی تمام آبادیاں خون ناحق سے شرابور ہو گئیں۔ ہزاروں درختوں کو پھانسی کا پھندا بنا دیا گیا اور لاکھوں آدمیوں کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس طرح کیا گیا کہ عدالت اور قانون بھی انھیں انصاف نہیں دلا سکتا تھا۔ یہ ایک بے پناہ خونی سیلاب تھا، جس میں اہل علم واہل دین اور ان کی آبادیاں جل تھل

ہورہی تھیں،اورانگریزاوران کے کاسہ لیس دوررونزدیک ان کا تماشہ دیکھ رہے تھےاورتالیاں بجا کر جشن فتح منارہے تھے،مگر غیرت مند طبیعتیں خون کا گھونٹ پی رہی تھیں۔

سیاسی بدحالی:

چوتھی وجہ یہ تھی کہ بنگال تقسیم ہوگیا تھا،جس کی وجہ سے وہاں کی مسلم اکثریت سخت پریشان تھی،اورسارا ملک انگریزوں کی اس حماقت سے چراغ پا تھا،اوراسے ان کی غلط ڈپلومیسی قراردے کرنفرت کررہا تھا۔اس طرح کے بہت سے نظریاتی،واقعاتی اورسیاسی سنگین حالات تھے جوانسانی غیرت وحمیت کومہمیز کررہے تھے،اورکسی جواں مردکوتلاش کررہے تھے جواس اندھیرے کو اپنی جدوجہد سے روشن کرے،اور برطانوی ڈپلومیسی اوران کا احساس فتح مجاہدین کے زخموں پر مرہم لگانے کی جگہ اپنی غلط روی اورغلط اندیشی سے اس زخم پرنمک چھڑکتا چلا جارہا تھا۔ملک میں بہت سے اہل علم،اہل سیاست اورارباب اقتدار تھے،اورانھیں حالات کے تقاضے جھنجھوڑتے بھی تھے،مگر برطانوی اقتدار سے مقابلہ کرنا،اوران کی بیخ کنی کی ہمت کرنا،اچھےاچھوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔اس لیے فضا میں کبھی کبھی ارتعاش ضرور پیدا ہوتا تھا مگر وہ سیلاب عظیم جوایک مرددرویش نے ابھاردیا،کسی شخص کے وہم وگمان میں نہیں تھا۔

پہلاقدم:

ان حالات میں مولانا محمودحسن نے اپنی سرگرمیاں اس وقت تیز کردیں جب وہ دارالعلوم کے صدرمدرس بن گئے۔

سب سے پہلا اقدام یہ فرمایا کہ ’’ثمرۃ التربیت‘‘ نامی تنظیم کوزندہ کرکے اسے آگے بڑھایا،اورطلبہ کوذہنی تربیت دے کر جہاد کے لیے انھیں تیارکرنے کی طرح ڈال دی۔مگر یہ انجمن بچند وجوہ زیادہ نہیں چل سکی،پھربھی اس کا جلایا ہوا چراغ جلتا رہا،بجھ نہ سکا۔

دوسرااقدام:

دوسرااقدام یہ فرمایا کہ ۱۳۲۸ھ میں جب دارالعلوم کا دوسرا اجلاس ہوا،جس میں فارغ طلبہ کی دستار بندی کی گئی تھی،اس اجلاس میں آپ نے ’’جمعیۃ الانصار‘‘ نامی تنظیم قائم کرنے کا اعلان کردیا،اوراسے حضرت مولانا کی دوراندیشی نے اس قدر اہمیت دی کہ سندھ سے مولانا

عبیداللہ سندھی کو بلا کرانھیں اس کا ناظم مقرر کر دیا۔ مولانا سندھی نے اس کا سب سے پہلا اجلاس مراد آباد میں کیا، جس میں دس ہزار سے زیادہ کا مجمع تھا۔ اس کے بعد میرٹھ وغیرہ کے اجلاسوں میں انھوں نے جو قواعد، ضوابط اور مقاصد مرتب فرمائے تھے، اس کا نشانہ تین چیزیں تھیں (۱) فضلائے دارالعلوم کی تنظیم (۲) جدید تعلیم یافتہ افراد اور فضلائے دینیات کی ہم آہنگی کی کوشش (۳) عوامی کارکنوں کی تیاری۔

مقاصد جمعیۃ:

مولانا نے اس 'جمعیۃ الانصار' کو ایک انقلابی تحریک کی شکل دے دی، جہاں رہنما اور کارکن دونوں ہی تیار کیے جاتے تھے، مگر یہ تنظیم انگریزوں کی نگاہ میں بہت جلد آ گئی۔ اس لیے مولانا سندھی کے خلاف طرح طرح کے طوفان اٹھائے، اور آخر کار حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا سندھی کو دیوبند سے دہلی منتقل کر دیا۔ اس طرح وہ جمعیۃ الانصار کی تحریک سے علاحدہ ہو گئے اور تحریک نے دم توڑ دیا۔

درس قرآن:

تیسرا اقدام یہ فرمایا کہ ''نظارۃ المعارف'' کا ایک تبلیغی ادارہ قائم فرمایا اور اس کا دفتر دہلی میں قائم کر دیا، اور مولانا سندھی کو اسے چلانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ مولانا سندھی نے وہاں پہنچ کر سب سے اہم یہ کام کیا کہ مسجد فتح پوری میں درس قرآن شروع کر دیا، اور قرآن کو ایک زندہ کتاب کی طرح عوام وخواص کے لیے آسان کر دیا، جس میں فرد، جماعت، مذہب اور زندگی وغیرہ بننے بگڑنے اور سب کے اصلاح وفساد کے تمام گوشے سامنے آتے رہتے تھے۔ اس لیے دہلی میں ایک زبردست ذہنی انقلاب سر اٹھانے لگا اور اس کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ مولانا سندھی، جو شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک کے نہ صرف امین بلکہ ترجمان تھے۔ اور ان کی اس ترجمانی سے دہلی جاگ اٹھا۔ اس تحریک کا عجیب اثر یہ بھی ہوا کہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری وغیرہ ایسے لوگ 'نظارۃ المعارف' کے اردگرد جمع ہو گئے، جو ملک کی سیاست میں اہم مقام کے مالک تھے۔

مراکز جہاد:

چوتھا اقدام یہ فرمایا کہ جس طرح ذہنی تربیت کے لیے مختلف کوششیں کر رہے تھے، اسی

طرح انقلابی تربیت کے لیے مختلف شہروں میں اپنے مراکز قائم کیے، اوران سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ کسی نہ کسی اہم کارکن کو ذمہ دار قرار دیا۔

اس قسم کے انقلابی مراکز دہلی سے سرحد تک ہر بڑے شہر میں قائم تھے، اور حاجی ترنگ زئی، خان عبدالغفار خان جیسے لوگ جان کی بازی لگا کر حضرت مولانا کے ہر حکم کے لیے منتظر رہتے تھے۔ ان مراکز پر کارکن، گولہ بارود اور اسلحہ جنگ سب کا انتظام تھا، اور یہ انتظام انتہائی خفیہ تھا، جس کا کسی کو کانوں کان نہیں علم ہوسکتا تھا۔

بین الاقوامی تحریک:

پانچواں اقدام یہ فرمایا کہ افغانستان، ترکوں کی عثمانی سلطنت اور روسیوں کو برطانیہ سے ٹکرانے کے لیے فضا پیدا کی، اور مولانا عبیداللہ سندھی کو دہلی سے کابل روانہ کر دیا۔ مولانا سندھی جب وہاں پہنچ گئے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا محمود حسن کے آدمیوں نے پوری فضا تیار کر رکھی ہے، صرف ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو تمام کوششوں کو منظّم کر سکے۔ یہ دیکھ کر انھیں حضرۃ الاستاذ کی کارکردگی اور ہمہ گیر جدوجہد پر حیرت ہوگئی۔

مولانا کی شخصیت:

چھٹا اقدام یہ فرمایا کہ ۱۳۳۳ھ میں خود حجاز تشریف لے گئے، اور وہاں اپنے شاگرد مولانا حسین احمد کے ذریعہ ترکی حکومت سے رابطہ پیدا کیا، اور انھیں تعاون کے لیے آمادہ کرلیا۔ چنانچہ ان سے ضروری خطوط لے کر ذمہ داران عثمانی حکومت کو خفیہ خفیہ روانہ فرمادیے، اور وہاں اس کی تعمیل کا انتظام کیا گیا۔

اس طرح مولانا محمود حسن نے دیوبند ایسی گمنام جگہ بیٹھ کر ایسا منصوبہ تیار کیا، پھر اسے عملی شکل دے دی تھی کہ مصر میں جب مقدمہ پیش ہوا اور جج نے فرد جرم سنائی تو اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ درویش اور غریب بوڑھا آدمی کس طرح اتنی زبردست تحریک چلا سکتا ہے! اور آج بھی کون باور کر سکتا ہے کہ برطانوی امپائر کے خلاف پڑوسی ملکوں، سرحدی قبائل اور ترکی سلطنت کو کھڑا کرنے کے لیے ایک عالم دین کا دماغ اس طرح چل سکتا ہے! مگر واقعہ ہے کہ حضرت مولانا نے

ایسی زبردست تحریک پیدا کی تھی اور ایسے ایسے جاں باز کارکن پیدا کردیے تھے، جن کے لیے جان پر کھیل جانا کوئی اہم کام نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بیرونی طور پر جنگ چھڑ جائے، اور اندرونی طور پر سرحد سے دہلی تک سخت خلفشار اور خانہ جنگی شروع ہو جائے، جس میں انگریزوں کو نشانہ بنا کر ختم کردیا جائے اور برطانوی حکومت کا جنازہ اٹھ جائے، ملک مکمل طور سے آزاد ہو جائے۔

ناکامی:

یہ ساری اسکیم جب تیار ہوگئی تو ایک اہم رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ ترکی حکومت انگریزوں سے شکست کھا گئی، اس لیے انگریزوں کے دباؤ سے حضرت مولانا محمود حسن عرب میں گرفتار کرلیے گئے، اور مصر میں بغاوت کا مقدمہ چلا کر انھیں مالٹا میں نظر بند کردیا گیا۔ ادھر ہندوستان میں وہ خطوط پکڑ لیے گئے جس میں ۱۹/فروری ۱۹۱۶ء کو انقلاب لانے کی تاریخ مقرر کردی گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے ان تمام کارکنوں کو جو اس تحریک میں کسی طرح کام کررہے تھے گرفتار کرلیا۔ بہت سے مقامات پر چھاپے ڈالے گئے اور پوری طاقت سے اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ دوسری طرف کارکنوں میں سراسیمگی اس لیے پیدا ہوگئی کہ حضرت شیخ گرفتار ہو چکے تھے، اور ان کی رہنمائی کے لیے ہندوستان میں کوئی جماعت موجود نہیں تھی، جو کچھ تھے وہ حضرت مولانا تھے۔

تحریک کے آثار:

اس طرح ریشمی رومال تحریک کامیاب نہیں ہوسکی، مگر اس نے اتنی بڑی بین الاقوامی تحریک چلا کر ملکی انقلاب کی رہنمائی فرمائی اور مسائل کے حل کرنے کے لیے ہزاروں افراد کو آمادہ کرکے جو راستہ دکھایا تھا، وہ راستہ آج تک کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ مسلم مسائل، ملکی مسائل اور ملّی مسائل کے لیے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کے علما آج بھی میدان جنگ میں کھڑے ہیں اور حضرت مولانا محمود حسن کا نام لے کر قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ علمائے ہند نے جس طرح ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی تھی، اسی طرح ۴۷ء کے بعد بھی آزادی کے مسائل سے اور اس کے مشکلات سے مسلمانوں کو آبروبندی سے نجات دلانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اور اس لیے ہے کہ اس کے اکابر نے یہی راہ دکھائی تھی، اور اسی راہ پر چل کر ہندوستان کی جنگ آزادی میں علما نے سربراہی کی تھی۔

ہندی علما کا امتیاز:

آپ اس صورت حال کو اس وقت صاف طور پر سمجھ سکیں گے جب مصر، سعودی حکومت، ترکی حکومت، انڈونیشیا اور دوسرے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کی صورت دیکھیں گے کہ وہاں کے علما و مشائخ ملکی و ملی مسائل کی قیادت کے میدان میں عملی جد و جہد کی سختیاں جھیلنے کا تصور نہیں کر سکتے، مگر ہندوستان میں وہ علما و مشائخ اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں جو دیوبند سے منسلک ہیں۔ اپنے ان اکابر کے نقش قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

آخری ہدایات:

حضرت مولانا محمود حسن ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا سے بمبئ واپس آئے تو ہندوستان ان کے نام، ان کے کارنامے اور ان کی شخصیت کے تصورات سے جھوم رہا تھا۔ اس لیے بمبئ میں آپ کو ''شیخ الہند'' کا خطاب دیا گیا۔

حضرت شیخ الہند واپس آ کر دہلی، علی گڈھ، دیوبند ہر جگہ تشریف لے گئے، اور آپ اس چھ مہینے کے مختصر عرصے میں ملک اور قوم کو جو ہدایات دی تھیں، وہ ہندوستان کی سیاست کا نہایت اہم موڑ تھے۔ آپ نے مشورہ دیا کہ:

۱) ملکی تحریک میں تشدد کارآمد نہیں ہے، اس لیے تشدد کے بجائے عدم تعاون کی تحریک چلائی جائے۔

۲) ملکی تحریک میں ہندو اور مسلمان سب کی مشترکہ جد و جہد ضروری ہے، اس کے بغیر ملک میں قابل اعتماد انقلاب نہیں آ سکتا۔ اسی لیے اپنی تحریک سے پیدا ہونے والی حکومت کا سربراہ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کو بنایا تھا۔

۳) کسی تحریک کو خفیہ سمجھنا غلط ہے، اس لیے جو کچھ کیا جائے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۴) اپنی تحریک میں علما اور دانشوروں کو شریک کیا جائے، اور دیوبند، علی گڑھ کو ملا کر آگے بڑھنا چاہیے۔

۵) ملک میں ہر قیمت پر فرقہ وارانہ اتحاد کو قائم کیا جائے، اس کے بغیر آزادی نہیں آسکتی اور ملک کمزور ہوتا رہے گا۔

٦) برطانوی امپائر سے گلوخلاصی اس لیے بھی ضروری ہے کہ تمام مسلم آبادیاں ان کے مظالم کا شکار ہیں، اور اگر ہندوستان آزاد ہوتا ہے تو سارے ملک آزاد ہو جائیں گے۔

۷) حضرت شیخ الہند نے جو تحریک چلائی تھی، اس کا آخری نشانہ برطانوی سامراج کو ہندوستان سے نکال کر باہر پھینک دینا تھا۔ حضرت مولانا کے اس نشانہ کا سب سے پہلے جمعیۃ علما کے پلیٹ فارم سے اعلان ہوا، اور مکمل آزادی کا پروگرام بنایا گیا، اور اس کے بعد ۱۹۲٦ء میں کانگریس نے اسے اپنایا اور آخر کار ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو گیا۔

❑❑❑

ماخذ: 'مقام محمود' ۔ مرتب: مولانا حبیب الرحمان قاسمی

سنہ اشاعت ۱۹۸٦ء

موضوع حیات
شیخ الاسلام حضرت مدنی

صبح کی چائے کا دور چل رہا تھا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے گول دسترخوان پر ملک کے مختلف حصوں کے مہمان بیٹھے خوشی خوشی باسی روٹی اور پوربی مرچوں کا ناشتہ کر رہے تھے۔ حضرت شیخ خود چائے تقسیم فرما رہے تھے جب تک برآمدے میں زوردار سلام گونجا اور اندر تشریف لانے والے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان تھے۔ ہشاش بشاش۔

مجاہد ملت نے ہنستے ہوئے اطلاع دی کہ 'حکومت نے آپ کو ''پدم وبھوشن'' کا خطاب دیا ہے۔' حضرت نے فرمایا 'یہ کیا چیز ہے؟' مولانا نے جواب دیا کہ 'سنسکرت کا کوئی لفظ ہے۔ مطلب ہے ''عزت افزائی۔'' حضرت شیخ دلچسپ گفتگو کر رہے تھے مگر اس اطلاع سے سنجیدہ ہو گئے تھے۔

ہم لوگوں کو انتظار تھا کہ شیخ نے کیا جواب دیا مگر فوراً معلوم نہیں ہو سکا لیکن حضرت شیخ نے دہلی جا کر حکومت کو جو شکریہ کا خط لکھا وہ جنگ آزادی کی تاریخی دستاویز ہے۔

حضرت شیخ نے حکومت کا خطاب شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور اس کی تین وجہیں لکھیں۔

☆ لکھا کہ مذہب کی آزادی، وطن کی آبرومندی اور انسانی برتری حاصل کرنے کے لیے میں نے جو کچھ کیا وہ میری زندگی کا موضوع ہے اور میرا مذہبی فریضہ تھا۔ اس کا کوئی معاوضہ قبول کرنا مذہبی غیرت اور خودداری کے خلاف ہے۔ میں نے جو کچھ کیا خدا کے لیے کیا، اسی سے اجر کا امید وار ہوں۔

☆ ایک وجہ اور بھی ہے کہ میرے اسلاف حکومت وقت سے خطاب حاصل کرنے کے

خلاف تھے۔اس لیے بھی واپس کرتا ہوں۔

☆ ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد انسانوں کی عام تباہی اور مسلمانوں کو برباد کرنے کی سازشیں ثابت کرتی ہیں کہ حکومت نااہل ہے اور کانگریس کے اصولوں کے برخلاف چل رہی ہے۔ایسے میں مجھ کو خطاب دینا ایک مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔اور اس کا قبول کرنا بے غیرتی کی بات ہوگی۔اس لیے واپس کرتا ہو۔

حضرت شیخ کے اصل الفاظ معلوم نہیں مگر مختلف حضرات نے جو کچھ بتایا وہ اس سے بھی سخت تھا مگر جب تک الفاظ سامنے نہ ہوں،ان کو نقل کرنا مشکل ہے۔البتہ اندازہ لگانا آسان ہے۔ تعجب ہے کہ حضرت شیخ کے مکتوبات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ،صرف اس وجہ سے کہ وہ کانگریس سرکار کے خلاف تھا اور سرکار کی ناراضگی اب مصلحت کے خلاف ہوگی۔

تحریک آزادی میں قربانیاں ہزاروں نے دیں۔ ہر فرقے کے لوگ جیل گئے ،گولیاں کھائیں، جائدادوں سے محروم ہوئے مگر ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد کسی نے صدارت،کسی نے وزارت ،کسی نے گورنری،کسی نے سفارت کاری جیسے معاوضے ضرور حاصل کیے اور آج تک اس کی پینشن ،اس کی وجہ سے سفر وغیرہ کی سہولتوں میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔مگر حضرت شیخ کا دل گردہ تھا کہ گیارہ برس جیلوں کی مشکلیں کاٹنے کے باوجود کسی معاوضے،کسی انعام یا کسی خطاب تک کا تصور نہیں کیا۔صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے وطن کی خدمت،اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کی آبرومندی کو اپنی زندگی کا موضوع بنا لیا تھا اور اس موضوع کو فرض سمجھ کر اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔اور صرف اللہ کو خوش کرنا ان کی غرض تھی دوسری کوئی غرض نہیں تھی۔

ایسے آدمی کانگریس میں یا دوسری جماعتوں میں کتنے تھے؟اور آج کون ہے جو ملک کی، قوم کی یا مذہب کی خدمت اس جدوجہد اور اتنے خلوص سے کرتا ہو؟ آج تو ایسے کاموں کا تصور ہی مشکل ہے۔اور کسی خدمت کو بطور فرض انجام دینا ایسا جذبہ ہے جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب یا ازم دے بھی نہیں سکتا۔اور اسلام صرف اس وجہ سے دیتا ہے کہ اس نے آخرت کو زندگی کا موضوع بنا دیا ہے،مگر تصور کی حد تک ہم بھی اسے کر سکتے ہیں لیکن زندگی میں اسے ہنسی خوشی برتنے کا کارنامہ حضرت شیخ جیسے ہی انجام دیا کرتے ہیں:

ہر ہوس ناکے نہ داند جام وسنداں باختن

حضرت شیخ کے اس خلوص کو سمجھنے کے لیے گوتم بدھ کا تصور کیجیے۔اس شہزادے نے آج سے ہزاروں برس پہلے انسانوں کو خدا سے جوڑنا اپنا موضوع بنایا تو اس طرح بنایا کہ اگر خاندان رکاوٹ بناتو چھوڑ کر بہرائچ سے گیا چلے گئے اور راج پاٹ نے دامن کھینچا تو تاج شاہی کوٹھوکر مار کر الگ ہو گئے حتی کہ ہندوستان کے برہمنوں نے شنکراچاریہ کے ساتھ مل کر انہیں روکنا چاہا تو وہ کام کی دھن میں دیش چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ چنانچہ چین کی ایک ارب آبادی آج تک ان کی مالا جپتی ہے اور آج خود پورا بھارت اس شہزادے کی پوجا کرتا ہے۔صرف اس وجہ سے کہ اس نے ایک روحانی جذبے کو اپنی زندگی کا موضوع بنالیا تھا اور اس کے لیے اپنے تن من دھن کو نچھاور کرنا اسے آ گیا تھا۔ایسی بلند تر ہستی،خلوص اور روحانیت کا نام ہے مہاتما گوتم بدھ۔

حضرت شیخ کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ وہ اپنے والد سید حبیب اللہ صاحب کے ساتھ دیوبند سے مدینہ طیبہ جانے لگے تو استاذ محترم مولانا محمود حسن صاحب نے فرمایا تھا کہ ''تم ہجرت کی نیت نہ کرنا،تم کو اسی ملک میں کام کرنا ہے۔'' دوسری بات یہ فرمائی تھی کہ ''وہاں بھی علمی مشغلہ نہ چھوڑنا۔'' حضرت شیخ جب تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے،ذریعہ معاش کے لیے کھجوروں کی تجارت اور کتابوں کی نقل کرتے رہے مگر خدمت علم کے لیے مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔درس بھی ایسا کہ ۱۴/اور ۱۸/اسباق تک ہوجاتے تھے اور ۲۴/گھنٹے میں صرف تین گھنٹے سوتے تھے مگر اس خدمت علم کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔جو کچھ کیا لوجہ اللہ کیا موضوع زندگی بنا کر اور خدمت علم کو بطور فرض انجام دیا۔

اسی طرح جب جنگ عظیم کے وقت مولانا محمود حسن عرب میں گرفتار کر لیے گئے تو صرف استاذ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو گرفتار کرایا اور مالٹا کی سنگین جیلوں میں برسوں مصیبتیں جھیلیں مگر ہنسی خوشی۔اور جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو یہاں کی تحریک آزادی میں زور وشور سے لگ گئے۔اس حد تک کہ کراچی میں برطانوی سنگینوں کے سامنے کھڑے ہو کر سامراج کی مخالفت میں اس وقت زبان کھولی جب تحریک خلافت کا کوئی لیڈر اس کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔مگر حضرت شیخ نے مجاہدانہ تقریر کر کے مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔انھوں

نے قدم چوم لیے۔

حضرت شیخ نے لکھا بھی ہے اور فرمایا بھی کرتے تھے کہ 'ہندوستان کی غلامی تمام عربی ممالک کی غلامی ہے۔' اس لیے انہوں نے استخلاص وطن کے لیے جو قربانیاں دیں اس میں ممالک اسلامیہ کا بھی درد شامل تھا۔ اور الجزائر، افغانستان، چین اور سمر قند و بخارا میں ایسے بہت سے شاگرد یادگار چھوڑ گئے تھے جو اپنے ملک میں اسلام کی خدمت، مسلمانوں کی سر بلندی اور وطن کی آبرو کے لیے کام کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں مگر ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں۔

میں ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند گیا تھا اور اسی سال حضرت شیخ ۱۹۲۰ء کے بعد پہلی مرتبہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ وہاں سے واپسی کے بعد معلوم ہوا تھا کہ مصر کی حکومت نے شیخ سے پیشکش کی تھی کہ 'از ہر مصر آکر حدیث کی خدمت کریں۔' مگر شیخ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی تھی کہ 'مجھے ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ہے اور جب ہندوستان چھوڑوں گا تو مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا۔'

مصر جانے کی پیش کش اس شخصیت نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دی تھی جس کو دیوبند میں صرف ۵۰۰/روپے ملا کرتے تھے جو وسیع دسترخوان کے لیے بھی ناکافی ہوتے تھے۔ اس لیے برابر مقروض رہا کرتے تھے۔ اور اس دعوت کو ٹھکرا دیا تھا جس کے عوض ان کو ۶۰/ ہزار روپے مل سکتے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس وجہ سے کہ ہندوستان کی ملکی اور علمی خدمت نیز مذہبی آزادی کو وہ اپنی زندگی کا موضوع بنا چکے تھے اور اس موضوع پر کام کر کے اپنا فرض پورا کر رہے تھے مگر انتہائی سادگی، انکساری کے ساتھ۔

حضرت شیخ نے ہندوستان میں جس طرح کام کیا ہے اس پر ان لوگوں کو یقین نہیں آتا جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں ہے۔ مثلاً ملتان کی ایک کانفرنس سے دہلی جا رہے تھے، صبح کوٹرین سے دیوبند اتر گئے، وہاں ترمذی اور بخاری کے اسباق بارہ بجے تک پڑھائے اور ظہر بعد ہی دہلی روانہ ہو گئے، جہاں رات میں جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا اور مولانا آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا احمد سعید جیسے شہسواروں کے ساتھ میدان سر کرنا تھا۔ دوسرا ہوتا تو دیوبند میں اتر کر آرام کرتا اور ہم جیسا ہوتا تو سیدھے دہلی چلا جاتا اور سکون سے اجلاس میں شریک ہوتا مگر حسین احمد تھے جن کا موضوع زندگی ان کی عمر اور صلاحیتوں کا ایک محبوب تھا۔ ایسا محبوب

جس کے لیے اصغر نے کہا:

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

اور محبت بھی ایسی ویسی نہیں، ایسی تھی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ترمذی کا سبق پڑھا رہے تھے، حدیث پر تقریر کرتے کرتے خاموش ہوجاتے، کیوں کہ نیند کا غلبہ بولنے نہیں دیتا تھا۔ ایسا بار بار ہوا تو مجبور ہوکر فرمایا کہ ''آج ۱۴؍دن ہوگئے سونے کو نہیں ملا ہے، اس لیے سبق پڑھانے کے قابل نہیں رہا۔'' سبق بند کرکے گھر تشریف لے گئے تو وہاں مہمانوں کا ہجوم تھا، اس ہجوم میں بھول گئے کہ مجھے سونا ہے۔

یہ تھے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ۔ یہ تھا اپنے موضوع سے ان کا والہانہ تعلق اور مخلصانہ محبت۔

ظاہر ہے کہ ایسے عاشق کو اگر کوئی عشق کا معاوضہ دینے لگے تو اس کے منہ پر طمانچہ رسید کردے گا۔ اس لیے شیخ نے کانگریس حکومت کا خطاب واپس کردیا اور ایک سخت خط لکھ کر واپس کردیا۔ سچ کہا تھا مولانا آزاد نے جب ٹنڈن جی کو جواب دے رہے تھے کہ ''بے غرض آدمی بے پناہ ہوجاتا ہے۔''

حرف آخر:

۱۹۳۷ء میں کانگریس کی پہلی وزارت قائم ہوئی تھی۔ پنتھ جی چیف منسٹر تھے۔ حضرت شیخ کو معلوم ہوا کہ حکومت نے مدح صحابہ پر پابندی لگادی ہے تو دارالعلوم سے چھٹی لے کر لکھنؤ آگئے اور یہاں ٹیلے والی مسجد پر قیام کرکے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کردیا۔ پھر تقریباً ایک مہینے تک گرفتاریاں دلائیں اور تحریک چلاتے رہے۔ جب پنتھ حکومت نے تین دن کے لیے مدح صحابہ کا حق تسلیم کرلیا تو تحریک واپس لے لی اور دیوبند واپس آکر تعلیم وتربیت میں مشغول ہوگئے۔

سوال یہ ہے کہ جس حکومت کو اتنی قربانیاں دے کر قائم کیا تھا اسی کے خلاف محاذ آرائی کیوں کی گئی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس لیے کہ اتر پردیش کی حکومت نے شیعہ راجدھانی لکھنؤ میں صحابہ کرام پر تبرا کرنے کی اجازت دے کر ایک غلطی کی تھی، پھر اس سے بڑی ناانصافی یہ کر ڈالی کہ سنی مسلمان سے مدح صحابہ کا حق بھی چھین لیا تھا۔اور جب کانگریس کی پوری تحریک آزادی انصاف اور مساوات کی خاطر لڑی گئی تو پنتھ سرکار کو انصاف کا سبق پڑھانے کے لیے اس قسم کی گوشمالی ضروری تھی۔اور جمعیۃ علما کے سربراہ نے گوشمالی دے کر اپنا فرض انجام دیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حق تسلیم کر لیا گیا حضرت شیخ دیوبند واپس آ گئے۔اگر آج حضرت شیخ حیات ہوتے تو یقیناً جیل میں ہوتے یا سرکار کے ہوش ٹھکانے لگا دیتے۔افسوس کہ:

''از قبیلہ مجنوں کسے نماند''

❑❑❑

ماخذ: 'مجلّہ سراج الاسلام' چھپرا، مولانا محمد افضال الحق نمبر۔۲۰۱۶

عارف باللہ حاجی عبدالرحیم فضلی

ولادت ۱۲۷۲ھ　　　وفات ۱۳۸۷ھ

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں:

حاجی صاحب نے آنکھیں کھولیں اعظم گڈھ میں، لیکن ایمان واسلام کی دولت لٹانے کا کام ۵۲؍سال تک فیض آباد شہر میں کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کے شیخ نے ہدایت فرمائی تھی کہ تم کو فیض آباد میں کام کرنا ہے، جب کہ خود شیخ نہ فیض آباد کبھی آئے تھے، نہ انھوں نے اسے دیکھا تھا، پھر فیض آباد کو کیوں منتخب کیا گیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

انتظام الٰہی:

اسے حسن اتفاق کہہ سکتے ہیں مگر دراصل انتظام الٰہی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے دیوبند سے مولانا ضرغام الدین صاحب مظفرنگری کو فیض آباد منتخب کر کے بھیجا تھا کہ تم کو علمی کام وہاں کرنا ہے۔ انھوں نے ساری عمر وہیں گزاردی اور عین اسی زمانہ میں گنج مرادآباد سے مولانا فضل الرحمان رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ سے حاجی صاحب کو غالباً ۱۹۱۳ء میں فیض آباد بھیجا گیا اور کہہ کر بھیجا گیا کہ تمھیں فیض آباد میں کام کرنا ہے، مگر تمھاری قبر وہاں نہیں ہے۔ وہاں سے پورب کے ضلع میں ہے۔ چنانچہ حاجی صاحب اپنے آبائی وطن رگھولی میں ۶؍شعبان ۱۳۸۷ھ سے آسودہ خاک ہیں، اور مولانا ضرغام الدین صاحب پولیس لائن فیض آباد کے قریب والے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کو اہل اللہ نے حکماً فیض آباد بھیج کر اس سوال کو حل کر دیا ہے کہ وہ فیض آباد جو نوابان اودھ کی راجدھانی تھا، اس لیے شیعہ حضرات کا گڑھ تھا اور وہاں جاگیریں دے

کر وظائف دے کر سنی مسلمانوں سے تعزیہ داری، ماتم امام باڑہ، سبیل وغیرہ غیر اسلامی رسم و رواج کو اسلام کا جز بنایا جار ہا تھا۔ چنانچہ تعزیہ داری کا جتنا زور یوپی خصوصاً مشرقی یوپی میں ہے، ملک کے کسی حصہ میں نہیں ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی منشا یہ تھی کہ اس خطۂ ارضی میں اسلام اپنی اصلی شکل میں باقی رہے۔ اس لیے اس نے دو بزرگ ہستیوں کو باہر سے بھیج کر وہاں سے بدعات، خرافات اور شیعی مراسم کا زور توڑ دیا۔ اور یہ خدمت مولانا ناضر غام الدین صاحب ایسے صاحب علم و فضل سے اور حاجی عبدالرحیم صاحب جیسے مستجاب الدعوات کے سپرد کی گئی اور دونوں حضرات نے بحسن و خوبی یہ کام انجام دیا۔

سلسلۂ ہدایت:

حضرت شیخ الہند نے اپنے شاگردوں کو پورے ملک میں مقرر کر دیا تھا کہ وہاں سے کام کریں، اسی طرح مولانا فضل الرحمان صاحب کی خانقاہ سے یہ کام ہو رہا تھا۔ اتفاق ایسا کہ دونوں مقامات سے دو قسم کے بزرگ فیض آباد کے لیے منتخب کر کے بھیجے گئے، اور دونوں نے بیک وقت اس شہر اور ضلع کو بلکہ متعلقہ اضلاع کو سنبھال کر دین و ایمان کو فروغ دیا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب ارشاد، ایمان و اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے کس انداز سے کام کرتے ہیں، اور اس کا بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ مالک الملک اللہ تعالیٰ انسانوں میں ایمان و اسلام کی بقا کے لیے کس طرح انتظام کراتے ہیں۔

گویا انسانوں کو غلط راہ روی سے ہٹا کر سیدھے راستے پر ڈالنے کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل فرمائی تھیں، انبیاء اور رسولوں کی بعثت فرمائی تھی، اسی طرح آج تک اہل علم اور اہل اللہ کو ان کاموں کے لیے منتخب کرنے کا سلسلہ جاری ہے **"ان الدین عنداللہ الاسلام"** **"انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون"** کا وعدہ اس طرح بھی پورا ہو رہا ہے۔

(۲)

حضرت حاجی صاحب اناؤ ضلع میں کانپور اور لکھنؤ کے درمیان ۱۸۹۰ء کے بعد نائب تحصیل دار تھے۔ اس وقت حاجی صاحب کے کلاس فیلو ملک وجیہ الدین اناؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہاں قریب ہی گنج مراد آباد ہے، جہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید حضرت مولانا

فضل الرحمان ایک مسجد اور خانقاہ میں گوشہ نشیں تھے۔ بڑے صاحب کشف وکرامات، بڑے صاحب علم وفضل اور پورے ملک کے لیے ایک حیرت ناک شخصیت تھے۔ وہاں روزانہ سینکڑوں ہر سائز اور مرتبہ کے اشخاص آیا جایا کرتے تھے۔ ڈپٹی صاحب ایک مرتبہ گنج مرادآباد جانے لگے، نائب تحصیل دار صاحب بھی اپنے لیے تحصیل داری کی دعا کرانے کے لیے وجیہ الدین کے ہمراہ وہاں چلے گئے۔

جس دن شام کو سب لوگ واپس جانے لگے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنے لیے مولانا سے دعا کی درخواست کی اور مولانا نے فرمایا سب لوگ دعا کرو، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرا دیتے تھے۔ منشی عبدالرحیم صاحب نے عرض کیا کہ 'حضرت! میں آج کل تحصیل دار کا انچارج ہوں، دعا فرمائیں کہ تحصیل دار بن جاؤں، میرا نام عبدالرحیم خان ہے۔' تو حضرت مولانا نے حسب معمول سب حاضرین سے دعا کرنے کے لیے فرمایا اور خود بھی ہاتھ اٹھا کر دعا فرمادی، مگر دعا یہ فرمادی کہ 'اے اللہ! عبدالرحیم کو کبھی تحصیل دار نہ بنائیو!' آمین

دعا کی جگہ بدعا سن کر عبدالرحیم صاحب سکتے میں رہ گئے کہ الٹی دعا کیوں فرمادی؟ اور صرف میرے لیے ایسا کیوں کیا؟ سوچتے سوچتے حیران رہ گئے مگر نہ ان کی سمجھ میں آیا، نہ ڈپٹی صاحب سمجھے کہ اس میں کیا راز ہے؟ نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ کس کو معلوم کہ تکوینی طور پر خدا کے یہاں فیصلہ ہو چکا ہے کہ عبدالرحیم کو ایمان واسلام کا مینارہ بنانا ہے اور اس فیصلہ کو شاہ فضل الرحمان صاحب کی نگاہ بصیرت نے اس کی پیشانی میں پڑھ لیا تھا۔ اس لیے خدائی فیصلہ کے خلاف کوئی قدم کیسے اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈپٹی صاحب اور نائب تحصیل دار صاحب اس نگاہ سے محروم تھے، اس لیے حیران کھڑے تھے کہ مولانا نے یہ کیا کردیا؟ اللہ اکبر! کبھی تحصیل دار نہ بننے کی دعا کر کے ترقی کے تمام راستے روک دیے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن صدیق حسین ایسے کمشنر فیض آباد تمہاری قدم بوسی کو اپنی عزت سمجھیں گے۔ وہ تو آج کی بات دیکھ رہے تھے کہ دنیا سے محروم رہ گئے۔ ہائے افسوس!

اس احساس محرومی اور خلاف معمول کاروائی پر حیرت کرتے ہوئے دونوں آدمی اناؤ واپس آگئے مگر مولانا نے عبدالرحیم خان کے دل میں ایسی چنگاری ڈال دی تھی کہ اس نے ان کو

چین نہ لینے دیا اور چونکہ مولانا کی بزرگی اور بے غرضی پر اطمینان تھا، اس لیے تسکین تھی کہ خدا کی مصلحت ہی ہوگی، میری تقدیر میں اتنا ہی لکھا ہوگا، اس لیے صبر کرنا چاہیے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حدیث رسول ﷺ کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "**اتقوا من فراسة المومن**" چنانچہ جس شخص کو ۱۹۱۳ء میں شیخ وقت بن کر فیض آباد میں کام کرنا تھا اسے تحصیل داری سے روک دینا خدائی مصلحت تھی، جسے مولانا نے سمجھ لیا تھا، اور وہ چونکہ اس فراست سے محروم تھے اس لیے اپنی مرضی کے خلاف حالات بدلنے سے پریشان تھے۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مولانا سے پوچھ لیتا کہ یہ آپ نے کیا کردیا۔

(۳)

کچھ دنوں کے بعد پھر گنج مرادآباد گئے، اور شام کے وقت حضرت مولانا فارغ ہو کر اپنے حجرے میں جانے لگے تو ساتھ اندر چلے گئے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ 'حضرت اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھا کیسے آئے ہو؟' میں نے عرض کیا کہ:

'میرے دماغ میں بڑا فتور ہے، طرح طرح کے اچھے برے خیالات بھرے رہتے ہیں، کبھی خدا کے وجود پر شک وشبہ ہونے لگتا ہے تو نمازیں چھوڑ دیتا ہوں۔ سخت حیران رہتا ہوں کہ کیا کروں۔'

مولانا نے فرمایا 'بیٹھ جاؤ'، پھر فرمایا 'آنکھیں بند کرلو'، میں نے آنکھیں موندلیں، تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ 'آنکھیں کھول دو' تو مجھے بڑی راحت اور ٹھنڈک محسوس ہوئی، اور یہ حال ہوگیا کہ دور دور تک کی چیزیں نظر آنے لگیں۔ دادا میاں نے فرمایا کہ 'وہ دن تھا اور آج ساٹھ برس ہوگئے، کبھی خدا کی ذات وصفات میں شک وشبہ نہیں پڑا۔ بہت دنوں تک ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل کے اندر کوئی چراغ جل رہا ہے مگر وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔' ظاہر ہے کہ وہ اپنی کسبی کیفیت نہیں تھی، عطا کردہ تھی، اس لیے اسے ختم ہونا تھا، وہ ہوگئی۔ اور نہ اتنی آسان تھی کہ فوراً ہی اپنے اندر پیدا کرلے، نہ کوئی علمی بات تھی، جسے پڑھ کر یاد کرلے۔ وہ تو ایک قلبی کیفیت تھی، اس لیے کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی اور جب کھوگئی تو اس سے جو طمانینت اور بشاشت تھی اس کی تلاش شروع ہوئی اور ایسی شروع ہوئی کہ نہ گھر یاد رہا نہ خاندان، نہ ملازمت۔ پھر اس کی تلاش میں سارے

ہندوستان کا چکر لگایا، کہیں میسر نہ ہوئی، تو مدینہ چلے گئے، اور پا پیادہ۔

فرماتے تھے کہ 'حجرے سے نکلنے کے بعد دل و دماغ کا عالم ہی دوسرا تھا۔ کیوں کہ مولانا نے تحصیل داری سے جس کام کے لیے روکا تھا، اس کام کا بیج بو دیا تھا، اس لیے ساری دنیا بدل گئی'۔ چنانچہ اسی سفر میں حضرت مولانا سے باضابطہ بیعت ہو گئے، پھر اناؤ سے وہاں آتے جاتے رہے، اور گنج مرادآباد میں مولانا مونگیری، مولانا نور محمد فتح پوری، سید حبیب اللہ ٹانڈوی، منشی فیروزالدین ایسے سینکڑوں اشخاص و افراد سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور ہر مرتبہ اس دربار کی کرامتیں، دعائیں، وارداتیں اور علمی معرکے دیکھا کرتے تھے۔

زندگی کا پہلا موڑ:

فرماتے تھے کہ میں ۱۸۹۰ء میں اعظم گڑھ کچہری میں ملازم تھا، والد صاحب کی طبیعت خراب ہوئی تو انھیں دیکھنے کے لیے گھر (رگھولی) آیا۔ حالت تشویش ناک تھی، عشا بعد بابا کے پاس بیٹھا تھا، کہنے لگے 'عبدالرحیم! کچہری میں ملازم ہو، رشوت نہ لینا، اگر لیتے ہو تو چھوڑ دو'۔ میں نے کہا 'بابا! بہت مشکل ہے، آپ دعا کر دیجیے کہ چھوٹ جائے'، تو بابا نے ہاتھ اٹھا کر لیٹے لیٹے دعا کی۔ تھوڑی دیر بعد ہوا کا ایک جھونکا آیا کہ کڑوے تیل کا دیا بجھ گیا۔ میں نے گھر میں آواز دی پھر جلدی سے جا کر دیا جلا کر لے آیا تو بابا جا چکے تھے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور یقین آ گیا کہ موت کا فرشتہ آ کر انھیں ساتھ لے گیا، ورنہ ابھی تو مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا فرشتہ کی آمد تھی جس نے آناً فاناً انھیں عالم ملکوت میں پہنچا دیا۔

دادا میاں فرماتے تھے کہ 'بابا کی آخری دعا نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ دنیا سے دین کی طرف بلکہ آخرت کی طرف مڑ گیا، ورنہ میں نہ جانے کدھر نکل جاتا'۔

گورکھ پور کا سفر:

کچھ دنوں کے بعد اہل اللہ سے ملنے کا شوق ہوا تو فتح پور مولانا علیم اللہ صاحب کے ہمراہ گورکھ پور ایک مجذوب کے یہاں گئے اور اس کے پاس وہاں آتے جاتے رہے۔ وہ کون صاحب تھے؟ کہاں رہتے تھے؟ معلوم نہیں مگر تھے مجذوب، یہ معلوم ہے۔ جیسے چار سال پہلے گورکھ پور کے

''نکوشاہ بابا'' تھے، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور اپنی اپنی آرزو ان سے کہہ کر پوری کرانے کی خواہش رکھتے تھے۔ یا پانچ برس پہلے ایک اور صاحب تھے، جن کے پاس مختار چچا آتے تھے اور وہ پھر خود بھی مجذوب ہو گئے تھے۔ اپنے کو خدا کہنے لگے تھے۔ وہ بھی گورکھ پور رہی کے تھے۔ مگر دادا میاں اور مولانا علیم اللہ صاحب نے ان مجذوب صاحب کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ شاید انھیں وہ بات نہیں ملی جس کی اس دین دار سالک کو تلاش تھی مگر اس سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ باپ کی دعا قبول ہو گئی، اور دل میں آخرت کی فکر پیدا ہو گئی اور طبیعت کا رجحان بدلنے لگا۔

زندگی کا دوسرا موڑ:

دادا میاں کی زندگی کا دوسرا موڑ اس وقت آیا جب وہ اناؤ میں نائب تحصیل دار تھے، اور تحصیل داری کی آرزو میں گنج مرادآباد گئے تھے۔ وہاں حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب نے دعا کر دی تھی کہ 'اے اللہ! عبدالرحیم کو کبھی تحصیل دار نہ بنائیو'

مولانا کی اس مخلصانہ دعا نے ان کے دل، ان کے دماغ اور ان کی آرزوؤں کی کایا پلٹ دی تھی۔ حیرانی کے عالم میں جا کر پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے اور اس بیعت سے اور حضرت مولانا کی خصوصی توجہ اور عنایت سے ان کو ذکر کی لذت نصیب ہو گئی اور اس میں ترقیات ہونے لگیں۔ فرماتے تھے کہ 'حضرت مولانا نے مجھے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کیا اور تلقین فرمائی تھی کہ زبان کو تالو سے لگا کر لفظ اللہ سانس سے ادا کرو، پھر واپس ہوتی ہوئی سانس سے بھی ادا کرو۔ اس میں زبان نہ چلے، صرف دھیان کام کرے۔' ذکر کا یہ طریقہ ان کی اصطلاح میں پاس انفاس ہے جسے 'جاروبِ دماغ' بھی کہتے ہیں کہ گندے خیالات و تصورات کا کوڑا کرکٹ نکال کر باہر ڈال دیتا ہے۔ اس لیے اولاً ذکر میں لذت پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے نماز میں جی لگنے لگتا ہے، تیسرے یہ کہ اللہ کی ذات وصفات سے زندہ تعلق پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہی تعلق بڑھ کر مراقبہ ذات تک پہنچ جاتا ہے اور آدمی کامل ہو جاتا ہے۔

دادا میاں نے ابتدائی منزل طے کی تھی، درمیانی منزلیں طے کر رہے تھے کہ بیعت کے ڈھائی سال کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا اور مریدین کی دنیا اجڑ گئی۔ جو جہاں تھا وہیں حیران کھڑا

ہوگیا۔

اس انتقال سے اہل ذکر کے یہاں جو خلا پیدا ہوتا ہے، وہ روحانی خلا ہے، اور ایسا خلا کہ بھرتا ہی نہیں، جب تک کوئی شیخ پھر توجہ دے کر ذکر الٰہی کا ذوق تازہ نہ کرے۔ ایسے میں دوسروں پر کیا گزری، مجھے معلوم نہیں، مگر دو بزرگوں کا حال معلوم ہے۔ ایک سید حبیب اللہ کا، دوسرے دادا میاں۔

سید حبیب اللہ کا دل اس قدر اچاٹ ہوا کہ 'ٹانڈہ' نہیں ہندوستان چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلے گئے کہ وہاں سکون قلب میسر آئے گا، اور دادا میاں نے تلاش شروع کی کہ جو اطمینان قلب مولانا صاحب سے حاصل ہوتا تھا، اب کہاں ملے گا؟ پیر بھائیوں نے کہا کہ فتح پور ہنسوا کے مولانا نوراللہ صاحب کے پاس جاؤ، تو وہاں پہنچ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں بھی اسی حال میں ہوں، تم مونگیر جاؤ مولانا محمد علی کے پاس، تو برسات کے باوجود وہاں چل دیے، اور دریاؤں کو پھاندتے ہوئے گزر گئے۔ کہتے تھے کہ 'ایک دریا کے پاس رات میں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے دریا پار کرا دیا۔'

اس طرح سکون قلب اور لذت ذکر کی تلاش میں جہاں جہاں لوگوں نے بتایا، دوڑتے چلے گئے۔ کہیں کوئی ایسا مرد کامل نہیں ملا جو انھیں اطمینان کرا دیتا۔ لوگوں نے سید حبیب اللہ کا نام بتایا، جب ٹانڈہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ مدینہ ہجرت کر گئے۔ اس وقت دادا میاں سیتا پور میں کسی انگریز کے پیشکار تھے، جب انھیں یقین ہو گیا کہ ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی تو سیتا پور سے استعفا دیے بغیر اور چھٹی لیے بغیر مدینہ کا سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ سیتا پور سے چل کر کابل گئے اور وہاں سے پیدل ایران ہوتے ہوئے عرب پہنچ گئے۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں کہ اس سفر میں انھیں کتنے دن لگے مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ روزانہ پچاس میل پیدل چلا کرتے تھے۔ اور جب وہ جدہ سے مدینہ منورہ جا رہے تھے تو بہرائچ شہر کا ایک قافلہ حج کرنے مدینہ جا رہا تھا۔ صدیق شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب کہتے تھے کہ 'ہم لوگ مدینہ کا سفر اونٹنی پر کر رہے تھے، دیکھا کہ ایک جوان آدمی پیادہ پا روانہ ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمارے ساتھ آجاؤ، سواری سے چلو مگر وہ تیار نہیں ہوا، مگر ہمارے ساتھ ساتھ برابر چلتا رہا، اور ہمارے ساتھ مدینہ داخل ہو گیا۔' صدیق شاہ اور ممتاز شاہ کہتے تھے کہ جب والد صاحب کو معلوم ہوا کہ فیض آباد میں جو بزرگ حاجی عبدالرحیم

صاحب ہیں یہ وہی جوان ہیں جوانھیں مدینہ کے راستے میں ملا تھا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ان سے ملاقات کی تمنا کی۔

دادا صاحب وہاں پہنچے تو سید حبیب اللہ صاحب اپنے مکان کی تعمیر کر رہے تھے اور ان کے چاروں بچے اس میں شریک تھے، تو دادا میاں نے بھی حرم کے سامنے ایک مکان بنایا اور اس میں قیام کر کے کھجور کی تجارت کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ یہی مکان تھا جسے سید حبیب اللہ صاحب کے پوتے سید حبیب صاحب نے توڑ کر ایک ہوٹل بنا لیا تھا 'فندق حرم' لیکن آج کل وہ مدار حرم میں آ کر مسجد نبوی میں شامل ہو چکا ہے۔ پچیس برس پہلے اس مکان میں سید نیاز علی کاکوری رہا کرتے تھے، پھر ان کے بچے رہتے تھے اور تمبا کو کا کاروبار کرتے تھے، وہ دادا صاحب کے مرید خاص تھے۔

دادا صاحب کہتے تھے کہ 'میں نے سید حبیب اللہ صاحب سے اپنے سفر کا معاملہ رکھا، اور ان سے کہا کہ آپ میری پیاس بجھائیں تو انھوں نے وہی جواب دیا جو مولانا نوراللہ اور مولانا محمد علی نے دیا تھا۔' اس پر مجھے سخت مایوسی ہوئی کہ اب کیا کروں؟ کہتے تھے کہ 'ایک دن میں نے سید صاحب کو پکڑ لیا تو حرم میں ظہر کی جماعت چھوٹ گئی، پھر بھی سید صاحب مجھے تو بتا نہ سکے کیوں کہ وہ خود بھی حیران تھے۔'

حکم سفر:

مدینہ منورہ میں مکان بنا کر ذکر و شغل میں مصروف رہتے اور دن کے اوقات میں کھجوروں کی تجارت کر کے خود ذریعہ معاش حاصل کر لیتے تھے۔ اسی دوران خواب دیکھا کہ سرکار دو عالم ﷺ تشریف لائے ہیں، فرماتے ہیں کہ 'عبدالرحیم! تمہارے گھر اور خاندان کے لوگ بہت پریشان ہیں، تم گھر جاؤ۔' تین چار روز بعد امام حرم نے آواز دی کہ 'عبدالرحیم صاحب جہاں بھی ہوں مجھ سے مل لیں۔' حجرہ میں گئے تو انھوں نے فرمایا کہ 'میں نے آج خواب دیکھا ہے کہ آں حضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ 'عبدالرحیم سے کہہ دیں کہ وہ گھر چلے جائیں۔'

وطن واپسی:

عبدالرحیم صاحب یہ طے کر کے گھر سے، ملازمت سے اور ہندوستان سے نکلے تھے کہ اس وقت تک واپس نہیں لوٹیں گے جب تک دل کی پیاس نہ بجھ جائے، دلجمعی حاصل نہ ہو جائے۔

اس لیے کئی روز سے خواب دیکھ رہے تھے، اس میں گھر کے حالات، پریشانیاں اور دشواریاں نظر آتی تھیں مگر اپنی دھن کے آگے خواب وخیال سے لڑتے چلے جاتے تھے، لیکن جب سرکار دوعالم ﷺ کی ہدایت آگئی اور تاکید آگئی تو محبوب کا حکم تھا، مدینہ سے ہندوستان کے لیے چل پڑے۔ جدہ آئے، ایک دخانی کشتی کراچی جارہی تھی، اس میں سوار ہوکر کراچی آگئے اور سیدھے سیتاپور پہنچے، جہاں سرکاری پیشکار تھے۔ انگریز عبدالرحیم صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، کیوں کہ کام محنت، سلیقے اور ایمان داری سے کرتے تھے مگر عبدالرحیم صاحب نے استعفا لکھ کر دے دیا۔ صاحب نے بہت سمجھایا، تمام وارنٹ اور قرقیاں منسوخ کردیں، غیر حاضری معاف کردی اگرچہ سالوں کی تھی مگر وہ بضد تھے کہ میرا استعفا منظور کرلیجیے۔ پھر اس نے دفتر کے لوگوں سے کہا کہ اسے سمجھاؤ کیا ہوگیا ہے، مگر انھیں نہ سمجھنا تھا، نہ سمجھے۔ گھر آئے تو حالات کچھ نارمل ہو چلے تھے۔ کیوں کہ جائداد جو نیلام پر چڑھ گئی تھی، اس کا نیلام کسی نہ کسی طرح والد صاحب نے تین سو روپے جمع کر کے لے لیا تھا، اور منصف بھی عبدالرحیم صاحب کا پیر بھائی تھا۔ اس لیے پوری ہمدردی سے منسوخ کردیا اور خط نکال کر دکھایا کہ تمہارے والد مدینہ میں ہیں، زندہ ہیں۔ پھر قرق شدہ سامان بھی واپس مل گیا۔ جب تک عبدالرحیم صاحب خود بھی آگئے، گھر آباد ہوگیا۔

خدائی نصرت:

خدائی نصرت اس طرح آتی ہے کہ ایک طرف عبدالرحیم صاحب پر حالات منکشف کردیے گئے، پھر خدا کی طرف سے سرکار دوعالم ﷺ کی توجہ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کو کسی نہ کسی طرح خاندان کے سر سے ٹال دیا جو اگر نہ ٹلتی تو خاندان رگھولی سے ہمیشہ کے لیے اجڑ جاتا۔ مگر خدا کے فضل وکرم سے اسی برس ہوگئے، اس کے بعد ایسی مصیبت نہیں آئی۔ اب بھی عزت وآبرو سے ہم لوگ آباد ہیں۔

مگر حیرت اس پر ہے کہ کہاں اعظم گڑھ، کہاں اس کا ایک معمولی گاؤں ''رگھولی''، مگر وہاں سے مدینہ منورہ تک خبروں کا، مدد کا اور تاکیدوں کا تانتا بندھ گیا اور خصوصی طور پر حضور ﷺ کا اس قدر فکر فرمانا، وطن بھیجنا اور اس کے لیے اس قدر اہتمام کرانا، روحانی عالم کا حیرت ناک کرشمہ

ہے جو ماورائے عقل واحساس ہے مگر واقعہ ہے، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ عقل، تجربہ اور ذہانت کوئی تاویل کر سکتی ہے۔ اس لیے جو کچھ سنا کرشمۂ قدرت تھا، فضل خداوندی تھا، اللہ کے راستے میں نکل جانے کی وجہ سے نصرت کا خدائی وعدہ پورا ہورہا تھا اور حضور ﷺ کی روحانیت کام کررہی تھی۔

عبدالرحیم صاحب گھر پہنچے تو دھوم مچ گئی، سالوں کی گمشدگی کے بعد اچانک واپسی سے والد صاحب، بڑے والد صاحب، دادی ماں اور خاندان کے سارے لوگ باغ باغ ہوگئے۔ ساری مصیبت بھول گئے لوگ، مگر چند دن قیام کر کے اللہ کا مسافر پھر بے سمت سفر پر روانہ ہوگیا۔

سفر گنگوہ:

مدینہ سے واپسی کے بعد کہاں کہاں گئے؟ یہ معلوم نہیں مگر دلجمعی اور سکون قلب کی تلاش میں جہاں جہاں سراغ ملا، خواب میں رہنمائی ہوئی، پہنچتے رہے۔

آخر کار گنگوہ پہنچ گئے، جہاں مولانا رشید احمد صاحب کا درس حدیث وفقہ اور ان کی خانقاہ تینوں مشہور تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت مولانا فضل الرحمان رحمۃ اللہ علیہ مولانا پر بہت اعتماد فرماتے تھے، اور سید حبیب اللہ صاحب سے مولانا نے فرمایا تھا کہ 'تم اپنے بچوں کو گنگوہ پہنچا دو، وہاں میں حدیث کا نور دیکھتا ہوں۔' اس لیے دادا میاں فرماتے تھے کہ 'میں نے حضرت مولانا کے پاس آٹھ روز قیام کیا، آٹھ روز کے بعد حضرت گنگوہی نے ایک صاحب سے فرمایا کہ اس جوان کو بلائے جو کئی روز سے ہے اور کچھ کہتا نہیں۔ مولانا کے پاس گئے تو حضرت مولانا گنج مرادآبادی اور ان کے بعد کے کچھ واقعات کا ذکر کیا اور التجا کیا کہ میرے دل کی آگ بجھایئے، میں بہت پریشان ہوکر آیا ہوں۔' حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ 'تمہارا پیر مرد کامل تھا، اس کی روحانیت تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا، تمہارا کام ہوجاوے گا مگر تمہارا راستہ ٹیڑھا ہے۔ مولانا نے فرمایا 'گھبرانا نہیں۔'

کہتے تھے کہ حضرت مولانا کی باتوں سے اطمینان ہوا کہ عمر ضائع نہیں ہورہی ہے، تلاش جاری ہے، راستہ طے ہورہا ہے اور حضرت شیخ کی روحانیت نگرانی کررہی ہے، اس لیے ان شاءاللہ

یہ اہم کام ہو کر رہے گا۔

تسکین خاطر:

کچھ دنوں کے بعد خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ 'عبدالرحیم! گنج مرادآباد جاؤ اور مولانا عبدالکریم صاحب کی صحبت میں رہو۔' میں گنج مرادآباد پہنچا تو مولانا میرا انتظار کر رہے تھے۔ فرمایا کہ 'تو نے بڑا انتظار کرایا، اچھا آؤ' تو میں وہاں دو مہینے تک رہا۔ مولانا نے مجھے مراقبہ بتلایا اور اس کی مشق کرادی، جس کی وجہ سے وہ آگ بجھ گئی جو ذکر کی لذت کو ترس گئی تھی۔ ذکر الٰہی میں وہی لذت محسوس ہونے لگی جو شیخ کی صحبت میں میسر تھی۔ بحمدللہ دلجمعی نصیب ہوگئی تو مولانا عبدالکریم صاحب نے مجھے اجازت دی اور فرمایا 'تم فیض آباد جا کر کام کرو، تمھیں وہیں کام کرنا ہے۔' جاتے وقت فرمایا کہ 'تمھیں کام فیض آباد میں کرنا ہے مگر تمہاری قبر وہاں نہیں ہے، پورب کے ضلع میں ہے۔'

مولانا عبدالکریم صاحب:

پشاور سے اس کیفیت کی تلاش میں نکلے تھے، جس نے امام غزالی کو برسوں تڑپایا تھا، اور جس نے مولانا روم کو شمس تبریز تک کشاں کشاں لے جا کر ان کے دل کی دنیا آباد کر دی تھی۔

وہ ذکر کی لذت نہیں، اسم الٰہی نہیں، یاد الٰہی نہیں، بلکہ ذات الٰہی سے زندہ تعلق کی خاطر ہزاروں میل کا سفر کر کے پہنچے تھے، اور ان کو مولانا فضل الرحمان کی صحبت میں وہ روحانی رابطہ میسر آ گیا تھا جس کی نشان دہی سرور کائناتﷺ نے فرمائی تھی کہ "لی مع اللہ وقت"، یعنی کسی کسی وقت خدا سے ایسی روحانی معیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں جبرئیل، میکائیل سے بھی ملنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ خداوند قدوس نے بارہا خود قرآن میں فرمایا ہے کہ "ان اللـــه مـع الـمحسنین"، "وھو معکم این ما کنتم" اور جب اس کی طرف سے کسی ذات گرامی کو یہ معیت حاصل ہو تو صرف اس کا ادراک کافی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے، مگر ادراک وہمی نہ ہو، تصوراتی نہ ہو بلکہ قلبی ہو، جیسے بچہ ماں کی معیت کا واقعی احساس رکھتا ہے۔ یہ کیفیت خالص روحانی اور خدائی عطیہ ہے۔ عموماً ان ہی لوگوں کو میسر آتی ہے جو ذکر، فکر اور مراقبہ میں اپنے کو مشغول رکھتے ہیں یا پھر

کسی مرد کامل کی صحبت میں پہنچ جاتے ہیں۔

چنانچہ مولانا فضل الرحمان صاحب کی صحبت، تربیت اور کیفیات نے مولانا عبدالکریم صاحب کا دل کھول دیا تو مولانا نے اس شخص کی اتنی قدر فرمائی کہ انھیں اپنی خلافت عطا کردی، اور پھر اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح بھی کردیا اور مولانا کے بعد ان کی جانشینی کی دولت سے سرفراز ہوئے:

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خدا کی مصلحت تھی کہ جس طرح مولانا عبدالکریم صاحب کو لمبے لمبے سفر اور تلاش و جستجو کی خارزاروں سے گزرنے کے بعد وہ روحانی کیفیت نصیب ہوئی تھی، اسی طرح حاجی عبدالرحیم صاحب کو در در کی ٹھوکریں کھلانے کے بعد ایک ایسے مرد مجاہد کی خدمت میں پہنچا دیا جو اس راستے سے اور اس کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے ان کو قلبی سکون کی دولت مہیا کردی۔

قیام فیض آباد:

مولانا عبدالکریم صاحب نے کسی روحانی سلسلہ میں حاجی عبدالرحیم صاحب کو فیض آباد بھیج دیا اور وہ اس اجنبی شہر میں پہنچ گئے۔ انھوں نے پختہ سرائے کی مشہور مسجد میں قیام فرمایا جو آج کل سبزی منڈی بنی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے سامنے ان کا ایک مکان ہے، اسی میں قیام کیا۔ نماز کے وقت مسجد میں اترتے اور پھر جا کر ذکر و شغل میں لگ جاتے۔ جب تک پیسے تھے، خرچ کرتے رہے، جب ختم ہوگئے تو فاقے شروع ہوگئے، شام کے وقت پانی سے افطار کر لیتے، اور بس۔

توکل:

مشکل یہ تھی کہ شہر میں کسی سے کوئی تعارف نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو مزاج ایسا تھا کہ کسی سے اپنی حالت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ 'سات روز اسی حال میں گزر گئے، آخر میں چلنا پھرنا دشوار ہوگیا تو وہیں نماز پڑھ لیتے تھے۔ لوگ سمجھتے کہ طبیعت خراب ہے، جب کہ سیڑھیوں پر چڑھنے کی تاب نہیں تھی۔'

یہ ساری مشکلات اس لیے پیش آئیں کہ ان کے پیر نے ان کو فیض آباد میں دین کا کام کرنے کے لیے بھیجا تھا، اس لیے ان کو یقین تھا کہ میرا خدا مجھ سے واقف ہے اور اس نے بلایا ہے تو وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ اس لیے فاقہ پر فاقہ جھیلتے رہے مگر اف نہ کیا، وہ تھے ان کا خدا تھا، اور اس کی یاد تھی۔ ساتویں دن دادا میاں کے ایک پیر بھائی انھیں تلاش کرتے ہوئے سرائے کی مسجد پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان تھا اور بہت سا حلوہ بھی تھا۔ فرماتے تھے کہ 'اسی حلوے سے میں نے افطار کر کے فاقہ توڑ دیا اور اس کے بعد سے کبھی ایسی نوبت نہیں آئی' دادا میاں باون برس فیض آباد میں رہے اور کسی طرح کا کوئی ذریعہ معاش پیدا نہیں کیا۔ اللہ کے ذکر کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا مگر ہمیشہ خوش حال رہے، خوش پوش رہے اور مہمانوں کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔

میں پانچ برس کا تھا کہ دادا میاں نے ہم دونوں بھائیوں کو فیض آباد بلا لیا۔ ہم نے وہاں آٹھ نو برس گزارے اور بحمد للہ نہ کبھی فاقے کی نوبت آئی اور نہ کبھی قرض لینا پڑا، نہ شہر کا کوئی مالدار تھا جو ان کی کفالت کرتا ہو، نہ ایسا ان کا مزاج تھا۔ پھر بھی سارا کام چلتا تھا اور اچھے سے اچھا چلتا تھا۔ پہلے تو ہمیں احساس نہیں تھا کہ یہ سارے اخراجات کہاں سے پورے ہو رہے ہیں؟ مگر جب احساس ہوا تو توکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ مقبول باورچی نے آ کر صبح کو کہا کہ آج کچھ نہیں ہے اور چلا گیا۔ دادا میاں نے اس سے کہا کہ اچھی بات ہے۔ لڑکے پڑھنے جا رہے ہیں تو اس وقت انھیں چنے بھنوا کر کھلا دو مگر جب مولانا ضرغام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھ کر واپس آتے تو کھانا پکا ہوا ملتا۔ بھائی ضیاء الحق مقبول سے پوچھتے کہ صبح تو کچھ بھی نہ تھا پھر کہاں سے پک گیا کھانا؟ تو کہتا کہ حاجی صاحب کے یہاں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔

پولیس لائن:

حاجی صاحب چوک کی مسجد میں آئے تھے مگر وہاں لوگوں کے ہجوم، کثرت سے آمد و رفت انھیں پسند نہ تھی۔ کوئی ایسی جگہ چاہتے تھے کہ وہاں سکون سے اللہ کا نام لے سکیں۔ چنانچہ شہر کے کنارے پولیس لائن کے پاس ایک شاہی انداز کی مسجد ان کے علم میں آئی جو بند پڑی تھی، گھاس

پھوس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا مگر دادا میاں کو وہی پسند آئی۔ کئی دن محنت کر کے اسے خود صاف کیا اور اس میں منتقل ہو گئے تو وہیں عمر گزار دی۔ وہیں برآمدہ، کمرہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ سب بنوا دیے۔ اس کے بعد تھوڑی سی زمین خرید کر پیچھے ایک مکان بنوا دیا۔ ہم جب پہنچے تو مسجد اور کمرہ دونوں موجود تھا۔

دعا:

حاجی صاحب اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا زندہ تعلق رکھتے تھے کہ جس طرح سے ہم لوگ اپنے بڑوں سے رکھتے ہیں، مگر وہ تعلق بندے کا خدا سے تھا۔ اس لیے جب وہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگتے تو ہماری طرح دعا کے الفاظ کی تلاوت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خدا سے کوئی بات کہتے تھے اور اپنی زبان میں کہتے تھے اور ہزاروں آدمی گواہ ہیں کہ وہ بات اسی طرح ہو جاتی تھی جس طرح انھوں نے اپنے مالک سے کہی تھی۔ انھوں نے یہ دعا اپنے پیر مولانا فضل الرحمان صاحب سے سیکھی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے کچھ کہہ دیا کرتے تھے اور وہ اسی طرح ہو جاتی تھی۔

گفتۂ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

حاجی صاحب اپنی دعا اور تعلق مع اللہ سے ایسے مشہور ہوئے کہ مسلمان تو مسلمان، اجودھیا کے بڑے بڑے پجاری اور پنڈے آ کر دعا کراتے تھے۔ ایک مرتبہ اجودھیا کی ہنومان گڑھی کا بڑا پجاری چند پنڈتوں کے ساتھ حاجی صاحب کے پاس آیا اور اپنے لڑکے کے لیے دعا کرائی جو بہت دنوں سے سخت بیمار تھا اور ڈاکٹر اس سے مایوس ہو گئے تھے۔ حاجی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کر دی اور وہ لوگ چلے گئے۔ تیسرے دن بہت ساری مٹھائیاں لے کر پھر آئے اور کہا کہ حاجی صاحب آپ کی دعا سے ہمارا بچہ ٹھیک ہو گیا، اس کو ذرا دم کر دیجیے۔

اس طرح کے واقعات وہاں روز ہوتے تھے۔ وہ اسی دعا کی طاقت سے خدا کے وجود کا، اس کی قدرت کا اور اس کے کرشمے کا مشاہدہ کراتے تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ پولیس کے تمام لوگ ان کی بددعا سے ڈر جاتے تھے۔

نسبت:

ایک مرتبہ مولانا ضیاء الحق قاسمی نے پوچھا کہ 'دادا جان! کبھی تو آپ مریض کو دم کر دیتے ہیں اور فوراً ٹھیک ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا، یہ کیا بات ہے؟' بھائی کی بات ایسی ہی ہوتی تھی، دادا جان سمجھ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ 'مجھ پر جب نسبت عیسوی غالب رہتی ہے تو فوراً شفا ہو جاتی ہے لیکن جب نسبت موسوی غالب رہتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا۔' ہم نے سن لیا اور خاموش ہو گئے مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا چیز ہے یہ نسبت؟ اس کا غلبہ اور تبادلہ؟ سچی بات یہ ہے کہ نسبت کی اصل کیا ہے؟ اس بات کی اب تک مجھے پوری خبر نہیں ہے۔ مگر اس کا تذکرہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ غالباً یہ اسی طرح کی بات ہو گی جیسی احادیث میں آیا ہے کہ 'جب میں کسی بندے کو قبول کر لیتا ہوں تو اس کی زبان بن جاتا ہوں، جو اس نے کہا گویا وہی میں نے کہہ دیا، جو وہ سنتا ہے، گویا میں نے سن لیا۔' یعنی اس کی ہر طاقت میں خدا کی توانائی شامل ہو جاتی ہے، جیسے قرآن میں ہے ''وما رمیت اذرمیت ولکن اللہ رمیٰ '' مکہ کے ایک واقعہ کے متعلق خود قرآن کہتا ہے کہ 'جب تم کنکریاں پھینک رہے تھے تو تم نہیں مار رہے تھے، اللہ تعالیٰ مار رہا تھا۔' ظاہر ہے کہ جب انسان کی طاقت میں غیبی طاقت شامل ہو جائے تو وہ شخص بے پناہ ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس کی مثال ایسی سمجھئے کہ ہم ریڈیو پر بولتے ہیں تو بجلی کی پچاس گنا طاقت ہماری آواز میں شامل ہو جاتی ہے تو ہماری وہی آواز جو چند گز تک جاتی ہے، بجلی کے سہارے تین سکنڈ میں پوری زمین کا چکر کاٹ لیتی ہے اور ہمیشہ اسی طرح کاٹتی رہے گی۔ (ان شاء اللہ قیامت میں سنائی دے گی)

اسی طرح اہل اللہ جب قبولیت کے اس مرتبے کو پہنچ جاتے ہیں تو ان کی زبان خدا کی زبان، ان کا ہاتھ خدا کا ہاتھ، ان کی طاقت، ان کی سماعت خدا کی توانائی بن جاتی ہے۔ اس لیے حضرت مریم کھجور کی ٹہنی ہلاتی ہیں تو کھجوریں بھر بھرا کر گرتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ جب اندھے پر ہاتھ

پھیر دیتے ہیں تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم خانہ کعبہ پر چڑھ کر جو قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو بلانے کے لیے اذان دیتے ہیں تو وہ اذان خدا کی بے پناہ توانائی سے ساری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ جب بڑھ کر دریائے نیل پر لاٹھی مار دیتے ہیں تو سمندر تھم جاتا ہے، اس میں بارہ راستے پیدا ہو جاتے ہیں، ریت خشک ہو جاتی ہے اور دو لاکھ سے زائد اسرائیلی پار ہو جاتے ہیں۔ پھر فرعونی ان کی جگہ اتر جاتے ہیں تو وہی برف کی سلیں پھر سمندر بن جاتی ہیں۔ ایک لاٹھی کی مار میں یہ طاقت کہاں ہے؟ لیکن جب خدا نے اپنی توانائی شامل کر دی تو گھنٹوں اس سے عجائبات کا صدور ہوتا رہا۔ اسی وجہ سے حضرت محمد ﷺ نے اشارہ کر دیا تو چاند کے ٹکڑے ہو گئے۔ آواز دے دی تو پتھر چلنے لگا، درخت کھسک آئے۔ ابھی اسی مہینے کا تازہ واقعہ ہے کہ ڈاکوؤں نے قاری صدیق احمد صاحب کو کان پور اور باندہ کے درمیان روک لیا، قاری صاحب نے جتنا روپیہ وغیرہ تھا، ان کے حوالہ کر دیا اور باندہ روانہ ہو گئے۔ صبح کو آدمی بھیجا کہ دیکھ آؤ روپیہ کا کیا ہوا؟ تو وہاں جا کر لوگوں نے دیکھا کہ اسی وقت سے دو آدمی کھڑے ہیں اور روپے کی تھیلی وہاں ان کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ ان میں اتنی سکت نہیں کہ ہل سکیں۔ صرف اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندے کی مدد فرما دی تھی اور چوروں کو زمین کے حوالہ کر دیا، اس نے ان کو جام کر دیا۔ ان حالات میں ''نسبت'' ایک خدائی توانائی ہے جو مقبول بندوں کے ہاتھ پاؤں بن جاتی ہے، مگر کس طرح؟

تو شئون الٰہی مختلف ہیں، انبیا اور رسولوں کے مزاج، ان کے موضوعات، ان کی قوموں کے حالات مختلف تھے۔ اس لیے یہ نسبت جس نبی یا رسول یا بزرگ کے ساتھ قائم تھی اسی جیسی نسبت خدا کے مقبول بندوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ چونکہ راقم الحروف واردات سے نابلد ہے، اس لیے اس اصطلاح کا وہی مفہوم بتا سکتا ہے جو ذہنی تصورات اور مذہبی تصورات نے اسے عطا کیے ہیں۔ اس سے زیادہ تشریح اس سے ممکن نہیں مگر یہی نسبت بدلتی رہتی ہے۔

چنانچہ اتر ولا ضلع گونڈہ سے ڈاکٹر مہدی اپنے بچے کو فیض آباد لائے، ان کے والد صاحب بھی ساتھ تھے، وہ حاجی صاحب سے بہت منھ لگے تھے۔ کہنے لگے حاجی صاحب یہ ہمارا پوتا ہے، یہ بولتا ہی نہیں دعا کر دیجیے۔ دادا میاں نے دسترخوان پر بچے سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟

اس نے نام بتا دیا، پھر باپ اور دادا کو پوچھا، وہ سب کو بتاتا چلا گیا۔ دادا میاں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بولتا تو ہے، اور وہ واقعی بولنے لگا۔ میں نے اس بچے کو چند سال بعد ہائی اسکول میں دیکھا تھا، آج وہ کوئی سروس کرتا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دادا صاحب پر نسبت عیسوی غالب تھی۔

جہاں تک میں نے پڑھا اور سنا ہے، اس نسبت پر انسان کا کوئی تصرف نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا کا عطیہ ہے، جب بھی کسی پر طاری ہو جائے، اس سے اسی قسم کے واقعات سرزد ہوں گے۔ اس میں ہماری ذہانت، ذکاوت اور تیزی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ صرف خدا کی مہربانی اور فضل وکرم پر ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مصر سے جب حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا چلا تو اس کی خوشبو سونگھ کر بتادی کہ ''انی لاجد ریح یوسف'' لیکن وہی وادیٔ کنعان میں سترہ برس کے لڑکے یوسف پر دوپہر سے شام تک جو کچھ ہوتا رہا اسے نہ دیکھ سکے، نہ سن سکے۔

خلاصہ یہ کہ کسی مقبول بندے کے دل اور اللہ تعالیٰ کی توجہ خاص میں جب واسطہ پیدا ہو جاتا ہے، تو وہ ''نسبت'' ہے۔ اور اکابر صوفیہ کے اخبار و اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ''نسبت'' طرح طرح کی ہوتی ہے، جیسے مشین مختلف ہوتی ہے تو یہی بجلی کہیں گرم کرتی ہے، کہیں ٹھنڈا، کہیں کچھ اور۔ کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلال بن جاتی ہے، کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نرم مزاجی، کہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی، کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نظم وضبط۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

حاجی صاحب کی ایک بڑی خصوصیت ان کی دعا تھی۔ وہ اس کے لیے دور دور تک مشہور تھے اور نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ ہندوؤں میں بھی اس قدر مقبول تھے کہ اجودھیا جیسے مندروں والے شہر کے بڑے بڑے پجاری ان کے پاس آتے تھے اور اپنی مصیبتوں کے لیے دعا کراتے تھے اور حاجی صاحب بلا کسی تکلف اور امتیاز کے سب کے لیے دعائیں کر دیا کرتے تھے۔ میں ان کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

(۱)

حاجی عبدالخالق صاحب نے بیان کیا کہ اجودھیا کے ایک بڑے پجاری اپنے بچے کو لے کر حاجی صاحب کے پاس آئے جو عرصے سے بیمار تھا۔ اس لیے وہ ہر قسم کے دوا علاج سے مایوس ہو چکے تھے، حاجی صاحب نے بچے کو دعا کر دی اور پانی دم کرانے کے لیے ایک برتن لائے تھے، حاجی صاحب نے پانی دم کر دیا اور تھتکار بھی دیا۔ پنڈت جی کو حاجی صاحب کے دم کرنے کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ اس لیے انھوں نے پھاٹک سے باہر ہوتے ہی اس پانی کو سامنے والے کھیت میں پھینک دیا مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ پانی جہاں پڑا تھا، وہاں کی گھاس ایک دم جلنے لگی، اور اس میں سے لو نکلنے لگی۔ جب آگ بجھ گئی تو پنڈت جی نے جلی ہوئی ہری گھاس کی راکھ جمع کر لی اور اٹھا کر لے گئے۔ اس میں سے کچھ بچے کو کھلا دیا اور کچھ بدن پر مل دیا۔ بچہ دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ معمولی کسر باقی رہ گئی تو اسے لے کر پھر حاجی صاحب کے پاس اجودھیا سے چل کر آئے، حاجی صاحب نے پھر دم کر دیا اور پنڈت جی سے پوچھا کہ 'آپ نے اس دن پانی کھیت میں کیوں پھینک دیا تھا؟' پنڈت جی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے، البتہ شرمندہ ہو گئے اور سر جھکا لیا، اور پھر پانی دم کرا کے لے گئے۔

اک دوسرا واقعہ سنیے کہ فیض آباد کے مشہور نار بس اسکول کے ایک ماسٹر صاحب اپنے بھتیجے کی بیماری سے پریشان ہو گئے۔ انھوں نے شہر سے لے کر لکھنؤ تک کے حکیم اور ڈاکٹروں سے ہر طرح کا علاج کرا کے دیکھ لیا کہ وہ جہاں تھے، وہیں تھے۔ ان کے بھتیجے آصف کا دماغی توازن قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ عاجز آ گئے تو شہر کے بعض لوگوں کے اس مشورے پر دھیان دینے لگے جو کہتے تھے کہ حاجی صاحب کو دکھا لیجیے مگر ان کی عقل باور نہیں کرتی تھی کہ اس روشن زمانہ میں جھاڑ پھونک پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ ایک نامعقول حرکت تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا، وہ آصف کو دیکھیں یا فلسفہ بگھاڑیں۔ بڑی کشمکش کے بعد چند لوگوں کو ساتھ لے کر حاجی صاحب کے پاس پہنچے، اور بتایا کہ ہم غازی پور کے ہیں، یہاں لکچرر ہیں، بچہ سخت بیمار ہے، آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ حاجی صاحب دعا کر دیتے تھے مگر تعویذ لکھنا یا فلیتہ لکھنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ پھر بھی اس بچے کو دم کیا اور ایک نقش لکھ کر اس کا فلیتہ بنا کر دیا کہ اسے گھر جا کر رات میں جلایئے اور تین دن جلا کر ختم

کر دیجیے، ٹھیک ہو جاوے گا۔

ماسٹر صاحب نے گھر آکر فلیتہ جلایا تو آصف بے ہوش ہوگیا۔ یہ دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی سے حاجی صاحب کے پاس دوڑے۔ انھوں نے کہا کہ گھبرایئے نہیں، ٹھیک ہوگیا ہوگا۔ چنانچہ وہ پہنچے تو آصف ہوش میں تھا۔ پہلے سے بہتر تھا، حتیٰ کہ تیسرے دن بالکل ٹھیک تھا اور آج کل الٰہ آباد میں بجلی کا ایک دفتر سنبھالے ہوئے ہے، پچاس کے قریب عمر ہے۔

ماسٹر صاحب کو آصف کے ٹھیک ہوجانے پر اور ایک کاغذ کے پرزہ جلانے سے ٹھیک ہوجانے پر سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے اپنے بھائی محمد فاروق علیگ ایڈوکیٹ کو لکھا کہ ہزاروں ہزار روپے میں جو کام نہیں ہوسکا وہ ایک حاجی صاحب ہیں ان کے فلیتے سے ہوگیا۔ فاروق صاحب کو بھی حیرت ہوئی تو غازی پور سے فیض آباد آئے اور دیکھنے آئے کہ وہ صاحب کون ہیں؟ جو اس دور میں کرامات کرتے ہیں، ان کی شکل دیکھنی چاہیے۔

آکر دیکھا، باتیں کیں اور دیر تک جائزہ لیتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے ایک حدیث پڑھ دی تو حاجی صاحب نے تیز لہجے میں کہا کہ 'حدیث محبوب کی بات ہے، قانون کی کتاب نہیں، اس لیے تم کیا جانو حدیث میں کیا ہے؟' فاروق صاحب برجستہ بولے کہ 'حاجی صاحب! کیسے سمجھی جائے پھر حدیث؟' حاجی صاحب نے فرمایا کہ 'وہ محبوب کی بات ہے، محبت پیدا کرو تب سمجھ میں آوے گی۔' وکیل صاحب نے پھر سوال کیا کہ 'محبت کیسے پیدا کی جائے؟' حاجی صاحب اسی میدان کے شہ سوار تھے، فوراً جواب دیا کہ 'کسی کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر سیکھو، تب محبت پیدا ہوگی۔' وکیل صاحب نے کہا ضرور سیکھوں گا محبت، اور آپ ہی سے سیکھوں گا۔ چنانچہ ہولی کی چھٹی میں یا اس کے بعد حاجی صاحب سے مرید ہوگئے اور ذکر اللہ اس طرح سیکھا کہ معلوم نہیں کتنے وکیلوں، افسروں اور منصفوں کو ذکر اللہ کی لذت چکھادی اور پیر طریقت ہوکر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

ان جیسے ان گنت واقعات نے حاجی صاحب کو پورے ملک میں مقبول عوام وخواص کردیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں حاجی صاحب کے ساتھ سرہند گیا تھا۔ ۱۹۵۲ء کے قریب، جب پنجاب سے مسلمان گزرتے تھے تو پنجابی اور سندھی سر اٹھا کر دیکھا کرتے تھے کہ کون لوگ ہیں؟

کہاں جا رہے ہیں؟ سرہند سے واپسی میں دیوبند آئے، استاذ محترم شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے یہاں قیام فرمایا۔ حضرت شیخ حاجی صاحب کو 'چچا' کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ سید حبیب اللہ صاحب کے ساتھ مدینہ طیبہ میں غالبًا چھ سال گزارے تھے۔ دیوبند میں ناشتہ کے بعد حضرت شیخ اندر تشریف لے گئے اور واپس آ کر حاجی صاحب سے فرمایا کہ حاجی صاحب عورتیں بچوں کے لیے تعویذ کا تقاضہ کر رہی ہیں، فرمایا کہ لکھ دوں گا، اور لکھ کر دے دیا۔ کیوں کہ شیخ کی اہلیہ محترمہ، محترم بشیر احمد کی صاحبزادی ہیں اور حاجی صاحب اس پورے گھرانے کے پیر تھے اور بالکل گھریلو تعلقات تھے۔ چنانچہ سالوں تک ہم لوگ یہی سمجھتے تھے کہ سید بشیر صاحب ہمارے بڑے ابا ہیں، اور ہم ان ہی کے خاندان کے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا گھر ٹانڈہ ہے اور ہمارا گھر گھوسی اعظم گڈھ ہے۔

(۲)

ان واقعات میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پانی ڈالنے سے ہری گھاس کیسے جل گئی؟ اور اس کی راکھ سے شفا کیسے ہوگئی؟ بخار کیسے غائب ہوگیا؟ تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاغذ کے ایک پرزے سے برسوں کی بیماری کیسے ٹھیک ہوگئی؟ اور کیا جوڑ ہے بیماری اور تعویذ یا فلیتے میں؟ اگر افسانہ نہیں تو حقیقت کیا ہے؟ یہ اور اس طرح کے سوالات کا جواب یہ ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں 'مادہ' اور 'روح'۔ صحیح یہ ہے کہ مادی طور سے ان واقعات کی کوئی ٹکنک سمجھ میں نہیں آتی لیکن دعا کا تعلق روح سے ہے۔ اس لیے ان جیسے سینکڑوں واقعات اولیا، انبیا اور رسولوں کی زندگی میں پیش آئے اور ہمیشہ پیش آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہر واقعہ ایک حقیقت ہے، زندہ حقیقت۔ آپ اس کے تجزیہ اور ٹکنک سے جتنے بھی نابلد ہوں مگر اس کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ قرآن گواہ ہے کہ 'حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور واقعات کا انکار کرنے والا فرعون بھی آخر آخر کہتا ہوا گیا کہ ''آمنتُ برب موسیٰ وھارون'' اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا میں دو چیزیں ہیں۔ ایک دعا کرنے والا شخص، دوسرے خود دعا کی طاقت اور تاثیر۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روحانیت کو خدا نے جو طاقت بخشی تھی، اس کی وجہ سے وہ مادر زاد اندھے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیتے تھے اور اس کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اس طرح انبیا و اولیاء اللہ کے سینکڑوں نہیں ہزاروں واقعات ہیں کہ دم

کردیا، چھودیا، لکھ دیا تو مریض ٹھیک ہوگیا، جن بھاگ گیا، یا جادو کٹ گیا، یا مصیبت ٹل گئی، حتیٰ کہ مشہور واقعہ ہے کہ آنکھوں کے درد اور آشوب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ خیمہ سے نکل نہیں سکتے تھے لیکن جب پیغمبر اعظم ﷺ نے بلا کر آنکھوں پر دم کر دیا تو وہیں سے اٹھے اور خیبر فتح کر کے لوٹے۔ اس طرح کے واقعات شخصی تاثیر کے ہیں۔

اور جہاں تک خود دعا کی تاثیر ہے تو سردار انبیا علیہم السلام نے فرمایا کہ ''**الدعاء سلاح المومن**'' دعا کے الفاظ مومن بندے کے منہ سے نکلتے ہیں تو ہتھیار کا کام کر ڈالتے ہیں۔ دوسری جگہ اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا کہ ''**الدعاء یرد القضاء**'' کہ خدا کا فیصلہ بدلنے کی طاقت نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں، نہ فرشتے میں، اگر ہے تو مومن کی دعا میں کہ اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرتے، بلکہ اپنا فیصلہ بدل دیتے ہیں کہ میرے بندے نے دعا کی ہے اس لیے اس کے مفاد میں اسے کر دیا جائے۔

آپ ''حصن حصین'' اٹھا کر دیکھئے کہ حضور ﷺ نے کیسی کیسی دعائیں کی ہیں اور ان دعاؤں کی وجہ سے کیسے کیسے کام ہوگئے۔ فوراً بارش ہوگئی ہے، موسم بدل گیا ہے، جن بھاگ گئے ہیں، سحر کٹ گیا ہے، خدا کی رضامندی آگئی ہے، بشارت اور خوشی آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طرح طرح کی دعائیں احادیث میں منقول ہیں۔ شاہ عبدالقادر، امام غزالی، ابن قیم، شاہ ولی اللہ، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی اور اکابر دیوبند نیز مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری جیسے رجال کار سے ہزاروں دعائیں، طریقے اور تعویذات منقول ہیں اور آج بھی کارآمد ہیں، جس کا جی چاہے آج بھی تجربہ کر سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں کی روحانیت بلند ہے، ان کی توانائی زبردست ہے، اس لیے یہی دعا وہاں تیر بہدف ہو جاتی ہے، دوسری جگہ اتنی موثر نہیں ہوتی۔ مگر خود دعا میں اس کے حروف والفاظ میں جو تاثیرات ہیں، وہ ضرور کام کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ محقق علما کے نزدیک ابجد کے ۲۷؍حروف میں سے ہر حرف کی ایک طاقت ہے، اور طاقت کی اسی نوعیت کی وجہ سے بہت سے حروف آتشی ہیں، آبی ہیں، خاکی ہیں اور بادی ہیں۔ اس لیے حروف کی نوعیت کے مطابق اور ان کے مزاج کے مطابق اگر کام کیجیے تو آتشی کو جلایے، بادی کو پہنایے، آبی کو پلایے اور خاکی کو دفن کر دیجیے تو اس کی تاثیر کئی گنا بڑھ جاتی

ہے۔دیکھئے علامہ لونی اورعلامہ دیربی وغیرہ کی تحقیقات اورتجربات اور جواہر خمسہ کے مجربات کو آزما کرآپ کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہرحرف کی ایک طاقت، ایک اثر، ایک مزاج ہے تو ان ہی طاقتوں کومرکب کرنے سے جادو پیدا ہوا۔چنانچہ ہاروت ماروت یہی علم دے کرآسمان سے اتارے گئے تھے، جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہرحروف کی جو طاقت اوراثر ہے، اس کا علم بھی اللہ نے دوفرشتوں کے ذریعہ زمین پراتاردیا تھا۔یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے جادوکوغلط طور سے استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔چنانچہ وہی جادوحضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کی قوم کے خلاف فرعون کوراضی کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا جس کی کاٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام کومعجزہ سے کرنی پڑی۔

اور چونکہ حروف میں جو طاقت ہے وہ ایٹمی ذرات سے زیادہ موثر اورزوداثر ہے اور قدرتی ہے تو جب بھی کوئی بزرگ عالم یا غیر عالم ان حروف کو یا الفاظ کواستعمال کرتا ہے تو وہی تاثیرات ظاہرہوتی ہیں خواہ وہ شخص مسلمان ہو، غیرمسلم ہو، یہودی ہو، یاعیسائی یا کوئی اور۔اوران کے استعمال سے کام بنتے ہیں، بگڑتے ہیں۔اسی لیے اگران کواستعمال کرنے والا روحانی شخص ہوتا ہے تو اس کا اثر ہزار گنا بڑھ جاتا ہے اور نہ صرف ان حروف کا پڑھنا بلکہ ان کا لکھنا، پینا، باندھنا، اورجلانا بھی موثر ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں نے سحر کردیا توجبرئیل ''قل اعوذ برب الفلق'' اور''قل اعوذ برب الناس '' لے کرآئے، ان کو حضور پڑھتے جاتے اورگرہوں پر جو دباؤ تھا، وہ ختم ہوتا جاتا تھا۔اورآج بھی کوئی سورہ فلق کو جادو کاٹنے اورسورہ الناس کوآسیب ختم کرنے کے لیے پڑھے تو تیر کی طرح کام کرتی ہے۔نہ صرف الفاظ کا پڑھنا بلکہ ان کا باندھنا اور پلانا بھی مفید ہے۔کیوں کہ تاثیران کی ذاتی توانائی ہے جو استعمال کرنے والے کی طاقت کے ذریعہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

حاجی صاحب نے ماسٹرصاحب کو جونقش دیا تھا، وہ ان کی بیاض میں لکھا ہوا ہے، اورلکھا ہے کہ اجودھیا کے ایک بزرگ مولانا عبدالرشید صاحب کا عطیہ ہے۔اس میں حروف ابجد کے کل ۹ رحروف ہیں، ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ان کو کسی عالم نے ایک خاص ترکیب سے مثلث

بنا دیا ہے، وہ درد کے لیے، آسیب کے لیے، جادو کے لیے بے حد مفید ہیں۔ نہ صرف یہ حروف بلکہ ان کو اگر حروف جمل میں لکھ کر استعمال کریں تو بھی دونوں ایک ہی طرح کام کرتے ہیں اور حاجی صاحب، حضرت گنگوہی اور تمام مشائخ نے استعمال کر کے دیکھا ہے کہ ان کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں رہا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے حروف نہیں استعمال کیے تھے، گنتی ہی استعمال کی تھی اور آصف سلمہ کا آسیب بالکل ختم ہو گیا تھا۔ آج بھی وہ بحمد للہ کام کر رہے ہیں۔ اس قدر زود اثر اور اتنا دیرپا اثر تھا اس نقش کا۔

بعض حضرات کو اشکال ہے کہ عربی حروف اور الفاظ کو استعمال کرنا صحیح ہے، لیکن ان کو عددی شکل میں استعمال کرنا صحیح نہیں۔ لہٰذا ''بسم اللہ'' کو ۷۸۶ لکھنا بدعت ہے۔

اصل صورت یہ ہے ابجد کے حرفوں میں سے ہر ایک حرف کی توانائی اس کی تاثیر اور اجتماعی طاقت نیز دوسرے حرفوں سے ان کا ملنا جلنا اور تاثیر کا بدل جانا اگر صحیح ہے تو ہم اسے اصل مانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان حرفوں کو انگریزی، ہندی، چینی، یا بنگالی رسم الخط میں لکھیں تو یہ تاثیر باقی رہے گی یا نہیں؟ علما کے نزدیک رسم الخط بدلنے سے تاثیر نہیں بدلتی، اس لیے بسم اللہ کو کسی زبان یا رسم الخط میں لکھئے، اس کی تاثیر وہی رہے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی حروف کے جب ہم عدد نکال کر لکھتے ہیں تو دراصل وہ بھی عددی رسم الخط ہے۔ چنانچہ ہر حرف کی ایک عددی شکل متعین اور ماقبل تاریخ سے متعین ہے۔ اسی لیے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اسم الٰہی کو جب لکھتے تھے تو عددی شکل میں ۲۔۴۔۶۔۸ لکھتے تھے، ب، د، و، ح، اور عموماً ہر شخص کو اسی شکل میں تعویذ دیا کرتے تھے۔

اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عربی الفاظ اور رسم الخط کا احترام اپنی جگہ قائم رہا اور عددی اشکال نے اس کی تاثیر کو سمیٹ کر کام کو مختصر اور طاقتور بنا دیا۔ چنانچہ ''بسم اللہ'' جتنی دیر میں لکھیں گے، اتنی دیر میں ۷۸۶ پانچ مرتبہ لکھ دیں گے۔

اس لیے عربی حروف اور الفاظ کو عددی اشکال میں لکھنے سے نہ کوئی اصولی قباحت پیدا ہوتی ہے، نہ ہی شرعی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک یہودی نے ''ا، ل، م'' کو عددی زبان ''۷۱'' کر دیا، تو اپنی حماقت سے اس کو ۷۱ سال کی عمر سمجھ لیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ا،ل،م،ر'' بھی ہے، یعنی ''۲۷۱'' تب وہ خاموش ہوگیا تو عددی شکل سے استدلال کر کے خود حضور ﷺ نے دشمن کا حملہ روک دیا۔ اس لیے اس کو بدعت کہنا یا تو لاعلمی ہے ورنہ جسارت۔

تیسری بات جب پوری امت متفق ہے کہ قرآن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوسکتا ہے اور اس ترجمہ سے ہمارے یہاں نماز بھی ہوسکتی ہے تو وہاں نہ صرف حروف بلکہ الفاظ اور ترکیب بھی بدل جاتی ہیں، دوسری زبان ہوجاتی ہے اور اسے کوئی بدعت نہیں کہتا۔ کیوں کہ قرآن خود ترجمہ ہے، سینکڑوں کتابوں، زبانوں اور اشخاص کی منشاء کا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا ترجمہ بھی صحیح ہے۔ اسی وجہ سے دوسرے رسم الخط میں استعمال کرنا بھی صحیح ہے۔

پھر الفاظ کو عددی شکل میں لکھنے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ حروف کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً بسم اللہ کو ۷۸۶ لکھیے، پھر اس کو ہفتے کے عدد سے ضرب دیجیے تو اس عدد کی طاقت سینکڑوں گنا بڑھ گئی۔ تفصیل کے لیے دیکھئے علامہ بونی وغیرہ کی کتابیں۔

اب کسی عربی لفظ کو اسی شکل میں لکھ کر کوئی تاثیر بڑھا نہیں سکتے تو عدد نے وہی کام کیا ہے جو دواؤں کو مختصر کر کے انجکشن بنا کر ہم خون میں شامل کرنے سے کرتے ہیں۔ چنانچہ نقش حوایا نقش بدوح یا نقش اجل کو لکھئے اور پھر انھیں ہر خانے کو دوسرے سے ملایئے تو وہ ایک نہیں چار تعویذ بن گئے اور ان کی تاثیر چوگنی ہوگئی۔ اسی لیے اہل علم اعداد کی شکل میں تعویذ لکھ کر خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں اور خدمت ایسی شاندار ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے میڈیکل کالج، وہ خدمت نہیں انجام دے سکتے۔ آخر میڈیکل سائنس میں کیا علاج ہے سحر کا، آسیب کا، ام الصبیان کا، نظر بد کا، کرتب اور ٹونا کا؟ مگر مولانا ابوالوفا صاحب، قاری صدیق احمد صاحب کے پاس ان چیزوں کا تیر بہدف علاج ہے۔ ان کا دم کرنا، ان کا لکھ دینا، ان کے لکھے کو پلانا اور جلانا وہ کام کرتا ہے جو ہزاروں روپے کی دوا نہیں کرسکتی، جہاں سینکڑوں انجکشن اور ڈاکٹر ناکام ہوجاتے ہیں۔

ایسے میں جو حضرات تعویذ کے نام سے چڑھ جاتے ہیں ان کو اپنا علمی علاج کرنا چاہیے۔ ہاں جو حضرات نظر بد، سحر اور آسیب کو تسلیم ہی نہیں کرتے ان بے چاروں کی بات دوسری ہے، مگر میں نے ایسے دانشوروں کو حضرت گنگوہی اور حاجی عبدالرحیم صاحب کے پاس مسلمان ہوتے

دیکھا ہے اور مولانا ابوالوفا اور قاری صدیق احمد صاحب کے دربار میں ہاتھ پھیلاتے پایا ہے۔ اس لیے علم کی بات علم سے حل کی جائے تو اچھے نتیجے نکلتے ہیں۔

ذکر الٰہی:

حاجی صاحب کا سب سے بڑا کمال، سب سے بڑی طاقت اور عمر بھر کی پونجی تھی ذکر الٰہی۔ وہ جب مغرب بعد اور فجر بعد ذکر میں بیٹھ جاتے تو آنکھیں بند، زبان تالو سے لگی ہوئی، سانس معمول کے مطابق ہوتی، مگر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے۔ قلب اللہ اللہ کرتا تھا اور روح اس ہستی کے جلوؤں میں منہمک ہوجاتی تھی جس ہستی کا نام اللہ ہے۔

علما نے لکھا ہے کہ ابتداء زبان سے لفظ اللہ کی مشق کراتے ہیں جب اس سے مناسبت پیدا ہوجاتی ہے تو وہی ذکر، قلب سے شروع کردیتا ہے۔ اب آواز نہیں نکلتی مگر لفظ ادا ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ جب قلب جاری ہوجاتا ہے تو سوتے جاگتے چلتے پھرتے خدا کا نام لیا کرتا ہے اور غفلت طاری ہی نہیں ہوتی، بلکہ جب قلب اللہ کہتا ہے تو سارا بدن اللہ کہنے لگتا ہے۔ اسی کا نام اللہ والوں کے نزدیک سلطان الاذکار ہے۔ اور یہ تکمیل کی آخری منزل نہیں بلکہ وہ منزل ہے جس کو دہلوی شاعر نے کہا ہے:

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاناں کے قریب
آن پہنچے ہیں کہیں منزل جاناں کے قریب

جب یاد الٰہی سے یہ خلش اٹھنے لگتی ہے تو روح بیدار ہوجاتی ہے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوجاتی ہے۔ روح کا ذکر لفظ یا آواز یا آہٹ نہیں ہوتا بلکہ انتہائی خاموش مراقبہ ہوتا ہے اور آدمی براہ راست اس ہستی اور مسمیٰ کے جلوؤں میں کھونے لگتا ہے جسے عربی میں 'اللہ'، ہندی میں 'پرماتما' اور 'ایشور' کہتے ہیں۔

اس منزل تک کم لوگ پہنچتے ہیں مگر جو پہنچ جاتے ہیں، وہ پتھر سے ہیرا بن جاتے ہیں۔ ان کی مجلس میں بیٹھیے تو آپ کے دل کی حالت بدل جاوے گی اور دل خود بخود اللہ کی طرف مائل ہوجائے گا۔ چنانچہ بارہا مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب بھی

گیا، وہاں دل کی عجیب کیفیت ہوجاتی تھی۔ پاس انفاس جاری ہوجاتا تھا، قلب میں ایک خاص انقلاب نظر آنے لگتا تھا۔ یہی کیفیت اس وقت ہوجاتی تھی جب شیخ الاسلام حضرت مدنی کے ساتھ تہجد پڑھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اکابر اہل اللہ لکھتے ہیں کہ 'ذکر لسانی قلقلہ ہے، ذکر قلبی وسوسہ ہے، اور ذکر روح ذکر الٰہی ہے۔' اس کا یہی مطلب ہے کہ روح خود اللہ کی طرف براہ راست متوجہ ہوجاتی ہے اور اس کے جلووں میں، اس کی صفات میں ایسی منہمک ہوجاتی ہے کہ پھر اسے دوسری کسی چیز کی خبر نہیں ہوتی۔ اسی بے خبری کا اصطلاحی نام 'بے خودی' ہے، 'مراقبہ' ہے، اور اہل دل اسے 'استغراق' کہتے ہیں، جس کے لیے بہت سے اولیاء اللہ مشہور ہیں۔ یہی استغراقی کیفیت جب ترقی کرنے لگتی ہے اور جب بہت غالب ہوجاتی ہے اور کوئی استاد کامل سہارا نہیں دیتا تو آدمی مجذوب ہوجاتا ہے۔ یہیں پہنچ کر منصور ''انا الحق'' بول اٹھتا ہے۔ اگر منصور کو کسی نے آگے بڑھا دیا ہوتا تو وہ ولی کامل ہوجاتا مگر پہلی منزل پر پہنچ کر تجلیات کو برداشت نہ کرسکا، ابل گیا تو اسے پھانسی دے دی گئی۔ کیوں کہ خلاف شریعت بول رہا تھا۔ خالق اور مخلوق کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ عبدالحق رودولویؒ نے فرمایا کہ ''منصور بچہ بود بہ یک جرعہ بے خود شد'' منصور بچہ تھا، محبت کا ایک گھونٹ پی کر آپے سے باہر ہوگیا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ 'بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جو خم کے خم پی جاتے ہیں اور ڈکار نہیں لیتے، جیسے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی۔' یہی وہ مقام ہے جس کی آخری منزل پر پہنچ کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'لی مع اللّٰه وقت'' یعنی میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک ایسی گھڑی بھی آتی ہے جس میں انسان کیا کوئی مقرب فرشتہ بھی دخل نہیں دے سکتا۔

جب روح زندہ ہوجاتی ہے اور خدا سے براہ راست اس کا رابطہ پیدا ہوجاتا ہے تو دل میں خدا کی محبت اور رسول کی محبت بے حد وحساب بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'تمہارا ایمان اس وقت کامل ہوتا ہے جب تمہارے دل میں اللہ کی محبت اور میری محبت دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہوجائے، حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ۔' اس پر حضرت عمر کو تعجب ہوا مگر ذرا دیر کے بعد جب حضرت عمر نے بتایا کہ 'حضور! اب آپ کی محبت جان سے بڑھ کر ہوگئی ہے' تو فرمایا ''الاٰن یــا عــمــر'' اے عمر آج تمہارا ایمان کامل ہوگیا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ 'ایمان جب دل کی

گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے تو پھر نکل نہیں سکتا۔' اس کو حضور ﷺ نے 'بشاشۃ القلوب' فرمایا ہے۔ جب یہ ایمان کامل کسی مسلمان کو نصیب ہوتا ہے تو اہل اللہ اسے اجازت دے کر خلیفہ بنا دیتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ریاضت، خدمت یا تعلیم وتربیت کے ذریعہ ترقی کرتے رہتے ہیں، پھر ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان کی ناراضگی کا اثر ہوتا ہے، ان کی محبت پھیلنے لگتی ہے اور جو وہاں پہنچ جاتا ہے اسے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔

روح اس مقام پر جب ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتی ہے تو وہیں ذکر اللہ کے جتنے راستے ہیں وہ سب مل جاتے ہیں۔ چنانچہ چشتی حضرات ذکر بالجہر کراتے ہیں، نقشبندی حضرات ذکر بالسر کراتے ہیں اور پھر ذکر کے یہ مختلف طریقے بھی قادریہ اور شاذلیہ میں مختلف انداز وکیفیات سے رائج ہونے کے باوجود جب روح کو ذکر محبوب کے لیے بالکل بیدار کر دیتے ہیں تو دین کے اس بام احسان پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اب کسی طرح کسی سیڑھی کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے، صرف یاد الٰہی باقی رہ جاتی ہے۔

حاجی صاحب ذکر میں بیٹھ جاتے تو ان کا انہماک قابل دید ہوتا اور وہاں جو کیفیات پیدا ہوتی تھیں، وہ اہل دل ہی بتا سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ گونڈہ سے فیض آباد پہنچا تو مغرب کے وقت ایک گاڑی رکی، اس سے فیض آباد کا کمشنر اتر کر حاجی صاحب کی خدمت میں آیا اور نیازمندوں کی طرح چٹائی پر بیٹھ گیا۔ پھر مغرب بعد ذکر الٰہی میں مشغول رہا۔

ان کمشنر صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی، مغرب بعد تعارف ہوا تو انھوں نے اصرار کیا کہ ظہر بعد کوٹھی پر آؤ۔ میں گیا تو محبت سے ملے اور بہت دیر تک خالص علمی اور مذہبی گفتگو کرتے رہے اور جب ذکر الٰہی کی بات آ گئی تو دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ آخر میں کہنے لگے کہ 'میں نے لندن میں تعلیم مکمل کی ہے اور ایشیاء سے یورپ تک بہت سفر کیے ہیں، دنیا کی بہت ساری لذتیں چکھی ہیں مگر افضال صاحب! یقین کیجیے کہ مجھے حاجی صاحب کے ساتھ ذکر کرنے میں جو لذت نصیب ہوتی ہے، ویسی لذت مجھے آج تک کسی چیز میں نہیں ملی، ایسا روحانی سرور، ایسی قلبی طمانینت اور اس قدر ذہنی یکسوئی ملتی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔'

یہ تاثر تھا کنور مسعود علی صاحب کا جو فیض آباد جیسی کمشنری کے کمشنر تھے اور دنیا سے دین کی طرف اللہ کے ذکر کے ذریعہ آ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سید صدیق حسن مرحوم فیض آباد میں کمشنر بن کر رہتے تھے تو حاجی صاحب کے یہاں پوری نیاز مندی سے تشریف لاتے، ذکر کی محفل میں شریک ہوتے اور بہت مسرور ہوکر واپس ہوتے تھے اور لکھنؤ وغیرہ میں جب حاجی صاحب کا نام آ جاتا تو بڑی بے خودی سے ذکر کرتے تھے۔

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غازی پور کے محمد فاروق صاحب وکیل میں جب دین کی طلب پیدا ہوئی تو ذکر اللہ کی کیفیت حاصل کرنے کے لیے فیض آباد آئے اور کسی طویل تعطیل میں آئے، تاکہ مطمئن ہوکر ذکر اللہ حاصل کریں گے۔ چنانچہ وہ پولیس لائن کی مسجد میں قیام کرکے محفل ذکر میں شامل ہوتے تھے اور بہت مطمئن و مسرور اٹھتے تھے۔ چنانچہ جب انھیں ذکر الٰہی میں لطف آنے لگا تو اندر سے بدلنا شروع ہوگئے اور اس قدر بدل گئے کہ عدالتوں کو حیرت ہوگئی۔ ایک منصف صاحب کو سخت تعجب تھا کہ 'محمد فاروق صاحب ایسے وکیل کو بدل ڈالنے والا آدمی کیسا ہوگا؟' چنانچہ انھیں دیکھنے کے لیے وکیل صاحب کے ہمراہ فیض آباد گئے اور دو چار سفر کے بعد وہ بھی بدل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں پڑھے لکھے نہیں بلکہ مولوی صاحبان ہیں، ایسے مولوی جو ہاتھوں میں تسبیح لینا عیب نہیں ہنر سمجھتے ہیں۔

فاروق صاحب کا حاجی صاحب سے اتنا تعلق ہوا اور پھر دین کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے چلتی ہوئی وکالت سے توبہ کر لی اور عدالت تو نہیں چھوڑی مگر مقدمات کا بنانا بگاڑنا، سچ جھوٹ ملا کر ایک پلندہ تیار کرنا چھوڑ دیا۔ اب وکیل صاحب اپیل کا مقدمہ لیا کرتے تھے اور عدالت کو متوجہ کر دیا کرتے تھے کہ جج یا منصف نے قانون کی رعایت نہیں کی ہے، قانون کا تقاضہ یہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی وکالت کا دائرہ بہت محدود ہوگیا مگر فاروق صاحب اس پر قناعت کرتے اور مطمئن رہتے تھے کہ خدا نے انھیں حرام سے بچا کر حلال کا خوار بنا دیا، حتیٰ کہ اسی حالت میں ترقی کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ایک صاحب پرتاپ گڈھ سے حاجی صاحب کی شہرت سن کر آئے اور بیعت ہوگئے۔ ذکر الٰہی میں بہت مشغول رہنے لگے، چوں کہ تحصیل داری سے ریٹائرڈ ہوئے تھے، اس لیے دماغ

میں گرمی اوراحساس برتری بہت تھا مگر ذکر وشغل کی لذت بھی خوب ملتی تھی۔حاجی صاحب نے ان سے فرمایا کہ 'تم سلطان پور جا کر عید گاہ میں قیام کرواور گھاس چھیل کر اسے روزانہ بیچ کر اسی سے کام چلاؤ' سید صاحب چلے گئے اور روزانہ گھاس چھیلتے، بازار میں لے جا کر بیچ ڈالتے اور خود کھانا پکا کر وقت گزارتے تھے۔اس لیے رات، صبح اور دو پہر کو خوب ذکر کیا کرتے تھے، آخر پیر طریقت ہو کر غازی پور دلدارنگر میں انتقال فرمایا۔

حاجی صاحب مقرر نہیں تھے، عالم نہیں تھے، محفل آرا نہیں تھے مگر ذکر الٰہی سے اس قدر معمور تھے کہ جوان کے پاس بیٹھ جاتا ان سے ضرور متاثر ہوتا تھا اور پھر ذکر کا عادی بنا کر اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی اتنی محبت پیدا کر دیتے تھے کہ آدمی اندر ہی اندر خود کو ہی بدلنا شروع کر دیتا تھا اور پھر عمر بھر اسی کیفیت پر ترقی کرتا چلا جاتا تھا۔حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام میں اسی محبت کو ابھار کر انھیں اندر سے بدل دیا کرتے تھے اور آدمی عمر بھر کے لیے بدل جاتا تھا۔اس لیے فرمایا کہ 'جب ایمان دل کی بشاشت میں پیدا ہو جاتا ہے تو پھر نکل نہیں سکتا۔'

روحانی عالم:

ذکر الٰہی کا سب سے بڑا فائدہ روح کی زندگی اور توانائی ہے، جیسے دوا اور غذا سے جسم اور اس کے تمام اعضا کی پرورش ہوتی ہے، اسی طرح ذکر الٰہی سے روح پرورش پاتی ہے اور اسے بے پناہ توانائی حاصل ہوتی ہے۔دادامیاں کی زندگی کی چند مثالیں حاضر ہیں۔

پہلی مثال:

گونڈہ سے ہم چند آدمی شہر کی بارہ دری کو خریدنے کے لیے لکھنو گئے، جہاں ٹھہرے تھے معلوم ہوا کہ منشی احترام علی کی کوٹھی ہے اور معاملہ ان کے صاحبزادے سے ہے۔منشی جی لکھنو کے مشہور رئیسوں میں تھے۔اعظم گڑھ کی چھوٹی سی ریاست دوباری، مدھوبن کے پاس تھی، وہ ایک........تھی فیض آباد پولیس لائن کے مشہور بزرگ حاجی عبدالرحیم صاحب سے بیعت تھے۔ اس لیے میں نے ان کے گھر سے اپنا تعارف کرا دیا کہ فیض آباد کے حاجی صاحب میرے دادا ہیں تو وہ لوگ مجھے پا کر باغ باغ ہو گئے۔مجھے بلا کر کوٹھی کے اندلے گئے، وہاں منشی احترام علی صاحب

عرصہ سے بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے۔ملاقات کے بعد لوگوں نے بتایا کہ دو تین دن ہوئے، ایک دن والد صاحب نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ میرے سامنے ایک کرسی بچھا دو، حاجی (عبد الرحیم) صاحب آرہے ہیں۔عورتیں اندر چلی گئیں، ہم لوگ کمرے سے باہر چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد بلائے گئے تو والد صاحب نے بتایا کہ حاجی صاحب آئے تھے، مزاج پرسی فرمائی اور ذکر کی تلقین کر کے چلے گئے۔ میں نے منشی احترام علی صاحب کو مبارکباد دی کہ اہل اللہ آپ کی سرپرستی فرما رہے ہیں، بہت اچھا ہے۔ میری واپسی کے چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ منشی جی کا انتقال ہو گیا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت عطا کرے، اور ان کی قبر کو انوار سے بھر دے۔

(۲)

جب میں لکھنو گیا تھا تو حاجی عبدالرحیم صاحب فیض آباد ۵۲ر برس قیام کے بعد رگھولی ضلع اعظم گڑھ اپنے وطن چلے گئے تھے اور وہیں پر موجود تھے۔ ۱۰۸ر برس کی عمر ہو چکی تھی، خود سے چلنا پھرنا مشکل تھا۔ اس لیے لکھنؤ آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، تو سوال یہ ہے کہ منشی احترام علی صاحب نے حاجی صاحب کو اپنی کوٹھی پر کس طرح دیکھا؟ کہ آئے، تلقین فرمائے اور چلے گئے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ حاجی صاحب کی روحانیت تھی تو مجسم کیسے ہوئی؟ اور روحانیت تھی کوئی لطیفہ تو نہ تھا جو منشی احترام علی صاحب کی تسکین قلب کے لیے خدا کی طرف سے ظاہر کر دیا گیا تھا، اور حاجی صاحب کی شکل میں تھا۔ ان تینوں میں کیا شکل تھی؟ مجھے معلوم نہیں، مگر ایک واقعہ ہے جس کو میں نے ان لوگوں سے سنا ہے، جن کے سامنے ہوا تھا۔ اس لیے اس واقعہ کی توجیہ جسمانی طور سے کریں، یا روحانی طور سے کریں، کوئی نہ کوئی توجیہ تو کرنی ہوگی۔

یہ کوئی تنہا واقعہ نہیں ہے، کیوں کہ میں اسی بقرعید سے پہلے حیدرآباد گیا تھا، دارالعلوم رحمانیہ میں کئی دن قیام کیا۔ دارالعلوم کے بانی محترم حاجی محی الدین صاحب انصاری فیض آبادی کی قبر دارالعلوم کی مسجد میں ہے اور قبلہ کا مکان بھی متصل ہے۔ حضرت قبلہ حیدرآباد کے اہل حق مرشدوں میں بڑے پیر تھے اور حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی کے نہ صرف مرید بلکہ خلفائے محترم میں سے اہم خلیفہ تھے۔ ان کے صاحبزادے اور پوتے وغیرہ مجھ کو بتانے لگے کہ ایک روز والد صاحب مرض وفات میں فرمانے لگے کہ 'دیکھو! حاجی (عبدالرحیم) صاحب تشریف لا رہے

ہیں، کرسی بچھا دو، اور بچھ گئی، مزاج پرسی کی، ذکر کی تلقین فرمائی اور واپس تشریف لے گئے۔' کہاں حیدرآباد اور کہاں رگھولی ضلع اعظم گڑھ اتر پردیس؟ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی پہچانا کہ حضرت حاجی صاحب ہی تھے۔

(۳)

حاجی صاحب گھر پر رہتے تھے اور اکثر استغراق کا عالم رہتا تھا۔ آواز دیجیے تو بول دیتے تھے، قریبی ہو تو پہچان لیتے تھے، ورنہ ضروری پتہ بتانا پڑتا تھا۔ یہی حال ۶ رشعبان ۱۳۸۷ھ تک تھا، اس دن والد صاحب سے صبح ۹ ر بجے فرمایا کہ 'مولوی امین! ہم جائیں گے۔' دریافت فرمایا کہاں جائیں گے؟ حاجی صاحب نے فرمایا 'مدینہ منورہ۔' والد صاحب خاموش ہو گئے، برآمدہ سے کمرے میں گئے، پان کھا کر چارپائی کے پاس آئے تو آنکھیں بند، سانس بند۔ حاجی صاحب رفیق اعلیٰ کی طرف جا چکے تھے۔ شاید اسی وجہ سے صالحہ اور اس کی دادی وغیرہ کو حکماً بھیج دیا تھا کہ جاؤ ناشتہ کر لو، وہ اپنے مالک کے یہاں جانے کی تیاری میں تھے اور آناً فاناً چلے گئے۔ اسی طرح ان کے والد بھی چلے گئے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ رگھولی سے یہ حاجی صاحب حیدرآباد کس طرح پہنچے کہ ان لوگوں نے پہچان لیا جو ہمیشہ کے دیکھنے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کی اور لکھنؤ کے واقعہ کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ میں اس واقعہ کو افسانہ کہہ دوں، نہ مجھے کوئی افسانہ نگار ہی کہہ سکتا ہے، مگر اس کی کوئی جسمانی توجیہ میری سمجھ سے بالاتر ہے اور میں واقعات سے انکار بھی نہیں کر سکتا، ہاں ہو سکتی ہے تو کوئی روحانی توجیہ ممکن ہے، مثلاً:

حضرت عمر خلیفہ ثانی فاروق اعظم اپنے عہد خلافت میں خطبہ دے رہے تھے، مسجد نبوی صحابہ و تابعین سے بھری ہوئی تھی، جب تک خطبہ رک گیا اور اچانک بلند آواز کر کے امیر المومنین نے فرمایا "**یا ساریة! الجبل**" یہ ساریہ ایک صحابی تھے، شام کے ملک میں بڑی فوج لے کر لڑ رہے تھے۔ میدان جنگ ایک پہاڑ کے دامن میں تھا اور پہاڑ خالی تھا۔ دشمن نے بھانپ لیا اور اس پر چڑھ کر مسلمان لشکر پر سنگ باری کی تیاری کرنے لگا۔ جب تک کمانڈر چیف حضرت ساریہ نے سنا کہ پہاڑ کی طرف سے حضرت عمر ڈانٹ رہے ہیں کہ 'ساریہ! پہاڑ کو نگاہ میں رکھو، الجبل الجبل۔' انھوں نے فوراً ایک دستہ پہاڑ پر بھیج دیا اور غالباً اسی دن شام تک وہ ملک فتح ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ مدینہ سے ایک ہزار میل دور تک حضرت عمر کی آواز کیسے پہنچ گئی؟ ایسی آواز جسے حضرت ساریہ اور دوسرے صحابہ نے سن کر پہچان لیا کہ حضرت عمر کمان کر رہے ہیں۔ دوسرا سوال ہے کہ حضرت عمر جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے اور شام میں نہیں بلکہ مدینہ میں تھے۔ اتنی دور سے دونوں لشکروں کی پوزیشن کیسے دیکھ لی، سمجھ لی، اور سنبھال دیا۔ ان دونوں باتوں کی مادی توجیہ ممکن نہیں، عقلاً دونوں ناممکن ہیں، بالکل اسی طرح جیسے میدان بدر میں یہی عمر بن الخطاب تھے، جب حضور ﷺ باہر تشریف لے جا کر مکہ کے ان سرداران قبائل اور سرداران مکہ کو نام لے لے کر پکارا، جو میدان بدر میں قتل کیے گئے تھے اور جن کو اٹھا اٹھا کر صحابہ کرام نے بدر کے گڑھے میں ڈلوا دیا تھا، اور آج خود حضور ﷺ ہی صبح صبح ان سرداران کو پکار رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ 'ہم نے تو خدا کے وعدے سچ پالیے، کیا تم لوگوں نے بھی خدا کی دھمکیاں سچ پائیں؟' یہ سوال مقتول دشمنوں سے کیا گیا تو اس سوال پر صحابہ کرام میں سے جس شخص کی جرأت گفتار نے خود حضور ﷺ سے سوال کر دیا کہ آپ ایسے لوگوں سے کس طرح خطاب فرما رہے ہیں جو مر چکے؟ یہ کیسے ہوگا؟ یہ تعجب کرنے والے عمر بن الخطاب ہی تھے اور وہاں پیغمبر اعظم ﷺ نے ان کو جواب دیا تھا کہ عمر وہ لوگ تم سے بہتر سن رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں۔ یہ جواب سوال سے بھی عجیب تھا مگر ایک واقعہ تھا جسے پیغمبر ﷺ بیان کر رہے تھے۔ اس لیے حضرت عمر خاموش ہو گئے تھے۔ (دیکھئے بخاری غزوہ بدر)

سوال یہ ہے کہ میدان بدر والے یہی عمر بن الخطاب ہیں جو مقتولین کے ہوش وحواس پر حیرت کر دیے، اور وہی فاروق اعظم بیس برس بعد خود مدینہ میں کھڑے ہو کر ملک شام میں حضرت ساریہ کو کمان کر رہے ہیں، آخر کس طرح؟ کل ان کو جو بات عقلی طور پر ناممکن نظر آتی تھی، آج اس سے حیرت ناک واقعہ کیسے ممکن ہو گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جسمانی طور سے جو باتیں ناممکن نظر آتی ہیں، اسی عالم میں روحانی طور پر وہ باتیں واقعہ بن جاتی ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ پیغمبر اعظم ﷺ کی محبت نے ان کی روحانیت کو صیقل کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے روحانی طور پر ان کے سامنے تمام مناظر منکشف فرما دیے تھے۔ اسی طرح اہل اللہ جب ذکر الٰہی کی کیفیت سے اپنی روحانیت کو صیقل کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ روحانی طور پر ان واقعات کا صدور ان سے ممکن بنا دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ روحانی طور پر جس طرح مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کی خلوت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا لطیفہ غیبی ظاہر ہوا تھا اور وہ گناہ سے بچ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب کا لطیفہ غیبی لکھنؤ اور حیدرآباد میں ظاہر کر کے نے ان برگزیدہ بندوں کی مدد کی تھی اور شیطان سے حفاظت کا سامان کر دیا تھا، جیسے مشہور ہے کہ امام رازی کی جاں کنی کے عالم میں ان کے پیر و مرشد نے ان کی مدد فرمائی تھی اور شیطان سے وہ اپنا ایمان بچا کر عالم آخرت کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

تو عالم ارواح میں انبیائے کرام کے یہاں، صدیقین اور اولیاء اللہ کے یہاں اس طرح کے روحانی واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ابھی چند ماہ کی بات ہے، قاری صدیق صاحب کی گاڑی روک کر ڈاکوؤں نے روپیہ چھین لیا تو قاری صاحب گاڑی سے ہتھورہ چلے گئے اور ڈاکو روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے ساری رات کھڑے رہے۔ خدا کے حکم سے زمین نے ان کو پکڑ لیا اور اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکے، کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جب تک قاری صاحب کے آدمی نے آ کر ان کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ کیا اس واقعہ کی کوئی مادی توجیہ ممکن ہے لیکن کیا روحانی طور پر ان میں سے کوئی بات خلاف واقعہ ہے۔

(۴)

رمضان میں دہلی خط آیا کہ والدہ سخت علیل ہیں، میں رگھولی پہنچا تو وہ صاحب فراش تھیں۔ دوسرے دن مغرب بعد ان کے پاس آ کر بیٹھا تو وہ کچھ باتیں کر رہی تھیں، جب وہ خاموش ہو گئیں تو میں نے پوچھا کہ آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟ اماں نے بتایا کہ تین آدمی آئے تھے، تمہارے دادا تھے، ابا تھے اور بابو (ضیاء الحق مرحوم میرے برادر بزرگ) تھے۔ میں نے پوچھا آپ کہاں رہتے ہیں؟ تو دادا نے فرمایا کہ مدینہ منورہ اور بابو نے بتایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے عرش کے سائے میں جگہ دی گئی ہے۔ جب جانے لگے تو میں نے کہا کہ مجھے بھی لیتے چلیے، تو تمہارے دادا نے فرمایا کہ ابھی نہیں عید بعد ہم آئیں گے تو لے چلیں گے۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور دہلی واپس چلا گیا۔ عید بعد آیا تو میرے سامنے میری امی خدا کو پیاری ہوئیں اور اس طرح تشریف لے گئیں کہ میری بہن بار بار پانی پلاتی تھی اور بولتی جاتی تھی کہ اماں پانی پی لیں۔ اس پر اماں نے

ڈانٹا کہ کیا پانی پانی کرتی ہے،کلمہ پڑھ۔ہم سب لوگ سورہ یٰسین پڑھنے لگےاور والدہ محترمہ ہوش و حواس کے ساتھ خدا کے حضور تشریف لے گئیں،۔رحمہا اللہ

(۵)

تقریباً دومہینہ پہلے میرے دوسرے لڑکے ڈاکٹر ارشد قاسمی نے عالم رویا میں دیکھا کہ حاجی (عبدالرحیم) دادا گھر پر آئے ہیں اور حال چال پوچھ کر فرما رہے ہیں کہ گھر میں تم نے ''ٹی وی'' کیوں رکھی ہے؟ ارشد نے کہا کرکٹ وغیرہ کھیل دیکھنے کے لیے، ورنہ اور کوئی چیز کبھی نہیں دیکھتے، سنتے۔حاجی دادا نے فرمایا'نہیں یہ بہت خبیث چیز ہے،اس کو گھر سے فوراً نکال دو'اور ارشد میاں نے اس کے بعد ہی ٹی وی نکال باہر کردی اور پھر بیچ ڈالا۔اس سے اندازہ ہوا کہ اہل اللہ یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد بھی اپنی قبر سے اپنے متعلقین سے تعلق رکھتے ہیں اوران کی روحانی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ دین وایمان کی ترقی نصیب فرمائے،اورروحانیت کی تکمیل آسان فرمائے۔آمین

معمولات عبدالرحیم:

حضرت حاجی صاحب کی روزمرہ کی زندگی سادہ تھی مگر صبح سے نہیں، بلکہ رات سے شروع ہوتی تھی۔وہ رات کو ٹھیک بارہ بجے نیند سے بیدار ہوجاتے،استنجا کرکے وضو بناتے،اور اپنے حجرے میں کھڑے ہوکر اطمینان سے تہجد ادا کرتے۔تہجد میں سورہ یٰسین پڑھنے کا معمول تھا۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ'جوانی میں اسّی اسّی مرتبہ سورہ یٰسین پڑھا کرتا تھا مگر اب طاقت نہیں رہی'

تہجد کے بعد ذکر کرتے ہوئے سوجاتے اور گھنٹہ دوگھنٹہ بعد پھر اٹھ جاتے، پھر وضو کرتے پھر تہجد پڑھتے اور سوجاتے۔روزآنہ دومرتبہ ضرور اٹھتے اور معمولات پورا کرتے۔اس میں نہ سردی رکاوٹ بنتی، نہ گرمی، نہ برسات۔ایسا ہی حضور ﷺ کا بھی معمول تھا، جاڑے میں وضو کے لیے چولہے پر گرم پانی ڈھانک کر رکھ دیا جاتا تھا،اس کو استعمال کرتے تھے۔اس کے لیے نہ کسی نوکر کو آواز دیتے تھے،نہ گھر والوں کو پکارتے تھے،سارا کام خود کرلیا کرتے تھے۔

(۲)

اپنی مسجد میں پانچوں وقت نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ فجر کی پہلی رکعت میں عموماً پوری سورہ یٰسین پڑھتے تھے اوراطمینان وسکون سے پڑھتے۔اس لیے ہم پانچ بجے جاگ جاتے تھے، وضو کر کے نماز میں شریک ہوجاتے تھے۔ دوسری رکعت میں عموماً سورہ بروج پڑھتے۔ نمازوں کے لیے ہمیشہ اہتمام فرماتے۔ بڑے خشوع وخضوع سے پڑھا کرتے۔ دعا مختصر ہوتی تھی۔کوئی عالم آجاتا تو اس سے نماز پڑھواتے تھے۔ نماز میں صافہ باندھنے کا اہتمام کرتے۔ایک مرتبہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد سے نماز پڑھانے کے بعد پوچھا کہ 'صافہ باندھنا کیا سنت نہیں؟ پھر بلا صافہ کے نماز کیوں پڑھائی؟' انھوں نے بڑے احترام سے جواب دیا کہ 'اہل عرب عادتاً صافہ باندھا کرتے تھے، وہ نماز کی سنت نہیں ہے۔' پھر بھی وہ نماز میں صافہ کا اہتمام کرتے تھے اوراس وجہ سے مصلیٰ پر ایک عمامہ ہروقت موجود رہتا تھا۔ جمعہ میں ہم بھی باندھ لیتے تھے۔

(۳)

فجر کی نماز کے بعد اشراق تک ذکر کے لیے چارزانو بیٹھ جاتے تھے، گردن جھکا کر آنکھ بند کیے رہتے۔ زبان سے نہیں بلکہ روح اور قلب سے ذکر کیا کرتے تھے۔ مریدین ان کے اردگرد حلقہ بنا کر ذکر میں مشغول ہوجاتے اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاتے۔

ہم لوگ اسم ذات 'اللہ اللہ' کہتے ہیں مگر اہل اللہ صرف نام کو کافی نہیں سمجھتے، وہ تصور ذات میں ہمہ تن مشغول ہوجاتے ہیں اورایک ایسے حی وقیوم معنی کا خیال باندھ کر اس میں مشغول ہوجاتے ہیں جو بے کیف وکم ہے، مگر موجود ہے۔ پھر چونکہ خدا اس کو یاد کرتا ہے، جو اسے یاد کرتا ہے تو انسان دوطرفہ یادوں سے ایک ایسی نایاب، روح پرور اورزوردار جیسا کہ مومن میں کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے طبیعت بشاش، دل مطمئن اور دماغ روشن ہوجاتا ہے، ذکر کی اس مسلسل کیفیت سے دل کے اندر سے خدا کی محبت کے چشمے ابلنے لگتے ہیں اورایمان کی تکمیل اسی محبت کے ذریعے سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ذکر کی اس کیفیت اورلذت کی وجہ سے بہت سے لوگ جد محترم کے پاس بیٹھتے تھے، اور پھر لوگ لذتوں میں کھو کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتے تھے۔

ذکرالٰہی کی یہ مجلس صبح فجر کے بعد اور شام کو مغرب بعد لازمی طور سے ہوتی تھی، حتیٰ کہ سفر میں جہاں قیام ہوتا تھا، وہیں ذکر میں پڑ جاتے تھے۔

ذکر:

جدمحترم اسم ذات کا ذکر بھی کرتے تھے اور 'یا حی یا قیوم' کا ذکر بھی، اور پاس انفاس میں جس طرح اندر آنے والی سانس 'اللہ' ادا کرتی ہے اور باہر جانے والی 'ہُو'۔ اسی طرح میں نے انھیں پاس انفاس میں 'یا حی یا قیوم' کا ذکر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

جس طرح جہری ذکر ہوتا ہے اور اسے چشتی حضرات پسند کرتے ہیں، اسی طرح سری ذکر ہوتا ہے، اسے نقشبندی حضرات پسند کرتے ہیں، مگر اس میں کچھ اثر مزاج اور طبیعت کا بھی ہے۔ بعض طبیعتیں ذکر جہری سے کھلتی ہیں، بعض ذکر سری سے۔ چنانچہ میں نے شیخ الاسلام حضرت مدنی سے متعدد کوشش کی کہ مجھے ذکر جہری کی اجازت دیں تو فرمایا کہ تم پاس انفاس کرو، اور ذکر قلبی کی مشق کرو، یعنی سری ذکر تمہاری طبیعت کے مطابق ہے۔

اشراق:

ذکر سے اٹھتے تو اشراق کی نماز ادا کرتے، تب مسجد سے باہر آتے۔ مقبول چائے بنا کر پیش کرتا اور مہمانوں کے ساتھ چائے نوش فرماتے۔

ناشتہ:

میں اعظم گڑھ کچھ اردو پڑھ کر برادرم ضیاء الحق کے ہمراہ فیض آباد ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء میں آ گیا تھا اور یہاں فارسی شروع کی تھی۔ اس وقت چائے کا اتنا رواج نہیں تھا مگر جد محترم اس وقت بھی چائے کے عادی تھے۔ صبح اشراق کے بعد اور شام کو عصر کے بعد چائے ضرور بنتی اور باقاعدہ چائے پراتی اور پیالیوں میں پی جاتی تھی۔ چائے کے ساتھ عموماً رات کی باسی روٹی اور سالن استعمال ہوتا تھا۔ ہمارے لیے اور مہمانوں کے لیے یکساں انتظام ہوتا تھا۔ اگر کبھی باسی روٹی نہیں بچتی تو قریب کی دوکان سے پاپے لائے جاتے اور اسے کھا کر چائے پی لی جاتی تھی۔ فیض آباد کے پاپے بہت مشہور اور اچھے ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ چائے بننے کے بعد مہمان بڑھ گئے تو دادا میاں چائے خود تقسیم کی۔ انھوں

نے ہر پیالی میں کم کم چائے دے دی، سب نے پی لی۔ بڑے بھائی آٹھ نو برس کے تھے، انھوں نے موقع کی نزاکت کا لحاظ نہیں کیا اور ٹوک دیا کہ 'دادا میاں! آپ ایک پیالی تو چائے دیتے ہیں اور وہ بھی پوری نہیں ہوتی' اس پر جد محترم بہت ہنسے، اور سب مہمان ہنس پڑے، بھائی صاحب بھی ہنس پڑے مگر اس کے بعد دادا جان ان کی پیالی ہمیشہ بھر کے دیا کرتے تھے کہ ضیا کو شکایت ہوجاتی ہے۔

بے تکلفی:

اگر کبھی کوئی مولانا صاحب، پیر صاحب یا کوئی نواب زادہ صاحب آجاتے تو باسی روٹی کے ساتھ پائے ضرور منگاتے۔ میرا بچپن کہتا کہ بڑے لوگوں کے لیے اور اہتمام ہونا چاہیے اور باسی روٹی چھپا دینی چاہیے۔ مگر جد محترم ان تکلفات سے بری تھے اور جو کچھ خدا نے دے رکھا تھا، اسے بے تکلف استعمال کرنا ان کا شیوہ تھا۔ چنانچہ صحابہ کے تعارف کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا "اقلهم تكلفاً" اور سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے "البذاذة من الايمان" کہ سادگی اچھے ایمان کی علامت ہے۔

چاشت کی نماز:

۹ ربجے کے وقت چاشت کی نماز پڑھی جاتی ہے، دادا صاحب اس کے پابند نہیں تھے، البتہ اس وقت وضو کر کے بخاری شریف جلد اول یا جلد ثانی ضرور پڑھتے تھے ایک ورق دو ورق۔ پھر اسے جز دان میں بند کر کے الماری میں رکھ دیتے۔ اسی طرح حصن حصین جو ان احادیث کا نادر مجموعہ ہے جن میں حضور ﷺ کے معمولات، آپ کی دعائیں اور صبح و شام کے طور طریقے درج ہیں۔

کھانا:

عموماً سادہ کھاتے تھے، روٹی، چاول، دال اور کوئی سالن ضرور ہوتا، پھر چٹنی اور اچار کا شوق تھا۔ اس لیے میٹھی اور کھٹی چٹنی ضرور رکھی جاتی اور سرکہ ضرور ہوتا۔

سالن میں عموماً چھوٹا گوشت آتا تھا، جو ۱۹۳۲ء میں تین آنہ سیر تھا، اور دو پیازہ میں بڑا گوشت، بیس پیسے میں مل جاتا تھا۔ ترکاریاں عموماً ایک یا دو پیسے کلو ملا کرتی تھیں۔ حاجی صاحب کو کدو، تروئی اور کریلا بہت پسند تھے۔ کریلا بڑے اہتمام سے پکواتے تھے اور اس کا پیڑ بھی خود

لگاتے تھے۔

کھانے کا ادب:

سیتا پور کے تعلق دار بابو محمد حسن صاحب بابو پور سے فیض آباد آئے، چونکہ وہ اور ان کا خاندان حاجی صاحب سے بیعت تھا۔ کھانے پر بیٹھے تو ان کا ملازم نہیں آسکا، اس کی ہمت نہیں تھی کہ بابو صاحب کے ہمراہ بیٹھ سکے، کھانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ دادا میاں نے پوچھا ملازم کہاں ہے؟ بابو میاں نے بلایا، دادا میاں نے کہا بیٹھو، ساتھ کھانا کھاؤ، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے بیٹھوں اور کیسے کھاؤں؟ تو دادا میاں نے اس کو ڈانٹ کر دستر خوان پر بیٹھا دیا اور بابو صاحب سے کہا کہ وہ بھی آدمی ہے، اسے ساتھ کھلایا جائے۔

بمشکل تمام وہ ساتھ میں بیٹھ گیا اور کسی کسی طرح چند لقمے حلق سے اتار کر چلا گیا مگر ہر کھانے اور ناشتے میں اس کو ہمارے ساتھ اور بابو صاحب کے ساتھ کھانا پڑا اور بابو صاحب کو کسی کسی طرح گوارہ کرنا پڑا۔ کیوں کہ پیر کا حکم تھا اور شریعت کے مطابق حکم تھا۔ بابو صاحب نے شان چھوڑ دی مگر پیر کا حکم نہیں چھوڑا، ان کی سعادت مندی تھی۔

قیلولہ:

کھانا کھانے کے بعد ظہر کی اذان تک قیلولہ کرتے، اور یہ قیلولہ ان کی تہجد میں بڑا کام کرتا تھا۔ اس کی مدد سے تہجد میں بار بار اٹھتے اور پھر سو جاتے، پھر پڑھتے۔ اس سے بار بھی نہ پڑتا، اور آں حضرت ﷺ کا طریقہ کار بھی زندہ ہو جاتا تھا۔ آپ رات میں بار بار اٹھتے، پڑھتے اور پھر سو جاتے۔ اس طرح نیند کا بھی حق ادا ہو جاتا، اور رات کا بھی۔

ظہر:

ظہر کی نماز جاڑوں میں اول وقت پڑھتے، گرمی میں کچھ ٹھنڈا کر کے پڑھتے۔ پھر عصر، مغرب اور عشا میں پڑوس کے لوگ کافی آجاتے تھے اور خاصی جماعت ہو جاتی تھی۔ ظہر بعد حجرے میں بیٹھ کر قرآن مجید کھول کر رحل پر رکھتے، یا تکیے پر اور اہتمام سے تلاوت فرماتے۔ اس کے بعد جز دان میں رکھ کر الماری میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد عموماً کتابیں پڑھی جاتیں۔ اور یہ مجلس کافی دیر تک چلتی رہتی، اگر کسی نے کوئی سیاسی پہلو شروع کر دیا تو سیاسی

حالات پر تبصرے ہوجاتے تھے اور اگر باہری مہمان ہوتا تو مٹھائی یا پھلوں سے اس کی ضیافت کی جاتی اور میں بھی شریک کیا جاتا۔ کبھی اہل ذوق جمع ہوجاتے تو بخاری شریف پڑھنے کے بعد کتابیں پڑھی جاتیں اور آپ انھیں سب کے سامنے سناتے رہتے تھے۔ آپ کی پسندیدہ کتابوں میں مجدد الف ثانی کے مکتوبات، حضرت عبدالقادر جیلانی کے مواعظ، مثنوی مولانا روم، نالۂ عندلیب، تذکرۃ الاولیا اور اس طرح کی دو کتابیں اکابر اور صوفیا کی ہیں، جن کے پڑھنے اور سننے سے دلوں میں نرمی اور جذبات میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں حضرت جیلانی کے مواعظ کا جواب نہیں، کیوں کہ وعظ نہیں کہتے دلوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔

حاجی صاحب کو تصوف کی کتابوں کا بہت اچھا ذوق تھا۔ اس کے لیے کتب خانہ بہت بڑا نہیں تھا مگر بہت اہم اور قیمتی تھا۔ افسوس کہ خانگی تقسیم، لاپرواہی اور گھر والوں کی ناقدری کی وجہ سے اس کا اکثر حصہ ضائع ہوگیا۔

دادا میاں کے کتب خانے میں بخاری کا وہ نسخہ بھی تھا جو حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی کے سامنے پڑھا گیا تھا اور اس پر حاجی صاحب کے دستخط ہیں اور تاریخ درس بھی۔ کیوں کہ حضرت مولانا روزانہ بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے اور خاصے لوگ شریک ہوتے تھے۔ فارسی انھوں نے بچپن میں زلیخا تک پڑھی تھی اور عربی مدینہ منورہ میں جاکر سیکھ لی تھی اس لیے مولانا روم کی مثنوی یا بخاری سمجھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ موڈ میں تھے، فرمانے لگے کہ 'بیٹے! جب کوئی شخص بخاری شریف پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا منہ چوم لیتے ہیں'۔ یہ تعبیر عاشقانہ ہے مگر بات بڑی عارفانہ ہے۔ کیوں کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا علم بھی ہے اور عمل بھی۔ زندگی میں ضرور یہ تینوں چیزیں خدا کو پسند ہیں، اور اتنی پسند ہیں کہ حدیث پڑھنے والے کو شاباشی دیتا ہے۔

دوپہر:

دوپہر سے پہلے دس یا گیارہ بجے تک کھانے سے فارغ ہوجاتے تھے۔ ہم نے بہت کم دیکھا ہے کہ ان کے دسترخوان پر ہم ہی تین آدمی ہوں، دو چار مہمان ضرور ہوتے تھے اور کسی مرتبے

کا مہمان ہو کھانا جو کچھ پکتا تھا سب کے لیے یکساں پکتا تھا اور خود دادا صاحب سب کے ساتھ ہی کھاتے تھے۔ روٹیاں ہانڈی میں بند رہتی تھیں، اس کو کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا تھا، دادا صاحب اپنے ہاتھ سے نکال کر ہر شخص کو دیتے جاتے تھے۔ اس طرح جتنے آدمی ہوتے، ان سب کے لیے کھانا کافی ہو جاتا تھا۔

مٹھائی:

مہمانوں کے لیے مٹھائی یا پھل کبھی منگانے نہیں پڑتے تھے، اس وجہ سے کہ جو لوگ باہر سے حاجی صاحب کی ملاقات، زیارت یا اپنی دعا تعویذ یا سفارش کرانے آتے تھے تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ سامان لے کر آتے اور ہم لوگ اسے اٹھا کر دروازے کے اوپر جو محراب خالی رہتی اس میں رکھ دیا کرتے تھے اور جو ان مہمانوں کے کام آتی تھی۔ اگر ہم دونوں بھائی نہ ہوتے تو مٹھائی یا پھل ختم ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

مہمانوں کے لیے چائے کا اہتمام بہت کم کیا کرتے تھے، پھل یا مٹھائی کی ضیافت کافی ہو جاتی تھی۔

تحفے:

عام طور پر لوگ تحفے اس لیے لاتے ہی کہ اس سے وہ خوش ہوں گے اور ان کی خاطر بھی ہو جائے گی۔ تحفے میں اس لیے مٹھائیاں بہتر سے بہتر اور پھل قیمتی سے قیمتی آتے تھے اور موسم ہوتا تو آم ٹوکری کی ٹوکری آتی اور اسے کمرے کے اندر چارپائی پر ہم پھیلا دیتے۔ پھر اس میں سے پکے ہوئے آم چن لیا کرتے تھے۔

دادا صاحب کے لیے سب سے بہتر تحفہ تھا مچھلی۔ وہ آتی تو بہت خوش ہو جاتے اور اسے طرح طرح سے پکاتے اور پکواتے، پھر شوق سے کھاتے کھلاتے۔ گونڈہ اور سلطان پور کے کچھ دیہاتی مکھیا جب بھی آتے مچھلی ضرور لاتے۔ اس لیے کبھی ٹوک دیا کرتے تھے کہ تم مچھلی نہیں لائے، اور وہ کہتے حاضر ہے حاجی صاحب! یہ ہے روہو۔

حاجی صاحب کی عمر جب ۱۱۰/ برس کی ہوئی تو اپنے وطن رگھولی کے برآمدے میں لیٹے

ہوئے تھے۔۶؍شعبان ۸۷ھ کی صبح فرمانے لگے کہ 'مولوی امین! (صاحبزادے) ہم آج جائیں گے۔' انھوں نے پوچھا کہاں جائیں گے؟ تو 'فرمایا کہ مدینہ طیبہ جائیں گے۔'

تھوڑی دیر کے بعد بیوی، والدہ وغیرہ عورتوں سے فرمایا کہ جاؤتم لوگ ناشتہ کرلو، پھر صالحہ جوان کی خدمت کے لیے اپنے کووقف کیے ہوئی تھی، اس سے فرمایا کہ تو بھی جا، ناشتہ کرلے، سب عورتیں اندر چلی گئیں، والد صاحب کمرے میں پان بنا کر کھانے لگے، سب سے پہلے صالحہ پہنچی تو دیکھا آنکھیں بند ہیں، بالکل خاموش ہیں۔اس نے پکارا تو کچھ نہیں بولے۔اس نے دادی سے جا کر کہا، وہ دوڑتی آئیں اورسب عورتیں آگئیں۔والد صاحب نے اعلان کردیا کہ حاجی صاحب دنیا سے رخصت ہوگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

اس کے بعد لوگوں کوسمجھ میں آیا کہ وہ صبح صبح مدینہ طیبہ جانے کی جو بات کررہے تھے وہ کسی علم یا خبر سے کررہے تھے اور وہ خبر صحیح تھی۔اس لیے انھوں نے سب کو صبح کو ناشتہ سے فارغ کروایا اور تشریف لے گئے۔

سوال یہ ہے کہ انھوں نے جانے کی اطلاع کس بنا پر دی تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ بذریعۂ کشف ان کو معلوم ہوگیا کہ ان کی دنیاوی زندگی کی مدت ختم ہوگئی ہے اور سفر آخرت شروع ہونے والا ہے۔

کشف کی صورت یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ میں جو عالم مثال ہے، وہاں حضرت آدم سے لے کر قیامت تک کے نقشے موجود ہیں۔اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کسی روح پر سوتے میں منکشف کردیتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح وہ خواب ہوجاتا ہے، ورنہ بیداری میں ہی منکشف کردیتے ہیں تو اس کا نام کشف ہے۔اور یہ دل کی صفائی کا معاملہ ہے اور ملاء اعلیٰ سے تعلق کا مسئلہ ہے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے دیتے فرمایا "**یاسارية!الجبل**" جب کہ وہ شام میں ایک لشکر کے سپہ سالار تھے اور میدان جنگ میں پہاڑ سے غفلت کررہے تھے، پھر متنبہ ہوگئے۔

حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ نے مرتے وقت بیوی سے کہا کہ تم جا کر راستے پر بیٹھ جانا، ایک قافلہ گزرے گا، اس سے کہہ دینا کہ ابوذر کا انتقال ہوگیا ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا، قافلہ آیا اس میں صحابی رسول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سفر کررہے تھے، انھوں نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

اسی کا نام کشف ہے اور یہ ملاء اعلیٰ سے روحانی رابطہ کے بعد ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ دادا میاں سے تقریباً ساٹھ برس پہلے مولانا عبدالکریم صاحب گنج مرادآباد سے رخصت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ 'عبدالرحیم! تم کو فیض آباد میں کام کرنا ہے، مگر تمہاری قبر وہاں نہیں ہے، پورب کے ایک ضلع میں ہے۔' چنانچہ فیض آباد میں وہ ۵۲/ برس مقیم رہے، پھر شادی میں وطن آئے، اور یہیں رہ گئے۔

یہ قبر والی بات دادا میاں نے ہم سے کئی بار کہی تھی، اس وجہ سے غازی پور اور اعظم گڑھ کے لوگ انتظار میں تھے کہ ان کی قبر کہاں بنتی ہے؟ آج معلوم ہوا کہ وہ جگہ رگھولی گھوسی اعظم گڈھ میں تھی۔ اس لیے ۶۰/ برس پہلے جو بات گنج مرادآباد میں کہی گئی تھی، وہ آج واقعاتی شکل میں موجود ہے اور ہم خواب کی نہیں بلکہ ایک مکاشفہ کی تصدیق کررہے ہیں، وہ بالکل صحیح تھا۔

مگر کشف کیا ہے؟ علم غیب کیا ہے؟ خواب کیا ہے؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہ مقام نہیں لیکن یہ ایک واقعہ ضرور ہے اور واقعہ بالکل سچا ہے، نقل اصل کے مطابق ہے۔ ہمیں اگرچہ اس کی توجیہ معلوم نہیں، تب بھی ہم اس کی واقعیت کا انکار نہیں کرسکتے جو ثابت کرتا ہے کہ کشف یہی صحیح ہے اور جس پر کشف ہوا تھا وہ صاحب دل بھی صحیح تھا اور یہ ایک روحانی ترقی کی قسم میں سے ہے۔

(۱)

دادا میاں آبائی قبرستان میں اپنے والد محترم کے سرہانے آرام کررہے ہیں، جس کے لیے بار بار کہتے تھے کہ 'بابا کے پاس مجھے دفن کرنا۔' قبر پر کتبہ لگادیا گیا ہے، رگھولی میں ان کی تدفین سے بڑا کام یہ ہوگیا کہ وہ فیض آباد کی اس فضا سے بچ گئے جو قوالی، عرس، گاگر اور ناچ کے رنگ سے معمور ہے اور کچھوچھہ، ردولی وغیرہ کے بزرگان دین، عوامی خرافات میں اس قدر پھنس گئے ہیں کہ ان کے اہل حق ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے مگر اہل حق تھے۔ بعد کے مفاد پرستوں نے ان کی قبروں کو اپنی پرورش کا ذریعہ بنالیا ہے۔ خدا انھیں ہدایت دے۔ اسی لیے دادا میاں دعا کرتے تھے کہ 'اللہ تعالیٰ! بدعتوں سے مجھے نجات دیجیے گا' اور بحمد للہ انھیں نجات مل گئی۔ اب ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے، سلام کرنے اور سورہ یٰسین پڑھنے کا موقع تو آتا ہے مگر عرس وغیرہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ دوسرے سال

بستی سے ایک بڑا ٹھیکیدار اپنی جیپ سے ۶ رشعبان کو رگھولی پہنچا اور عرس میں شرکت کے لیے پہنچا مگر میں نے اسے لے جا کر فاتحہ پڑھوادی، سورہ یٰسین پڑھوادی اور کہہ دیا کہ عرس اور گاگر وغیرہ کھانے پکانے کا چکر ہے، اس کا نہ شریعت سے کوئی تعلق ہے، نہ صاحب قبر کی مرضی کے مطابق ہے۔لیکن تیسرے سال غازی پور کے محمد آباد سے کچھ زائرین ۶ رشعبان کو کھانے پکانے کا سارا سامان لے کر آئے تھے کہ پکا کر غریبوں کو تقسیم وفاتحہ کرادیں گے۔ چنانچہ دیگیں چڑھائی گئیں، اور غریبوں کو گھر ہی سے بانٹ دی گئیں مگر عین الحق سلمہ نے اور گاؤں کے لوگوں نے انھیں سمجھا دیا کہ اس دعوت سے نہ ان کو نفع ہے، نہ غریبوں کو، نہ آپ کو۔خدا یہاں سے بھی قبول کرسکتا ہے، اور وہاں سے بھی۔اس طرح عرس کا چکر ختم ہوا اور بحمد للہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

پھر بہت سے معقول لوگوں نے اصرار کیا کہ حاجی صاحب کی پولیس لائن والی مسجد کو آباد کرو مگر ہم لوگوں کو سمجھ میں نہیں آیا۔ کیوں کہ ہم اس لائن کے آدمی نہیں ہیں اور کھانے کمانے کے لیے ہمارے پاس دوسرے ذرائع موجود ہیں۔اس لیے حاجی صاحب کا نوکر حاجی محمد میاں نے ان کی مسجد آباد کرلی اور بحمد اللہ اس کی وجہ سے وہاں پانچوں وقت کی نماز ہوتی ہے۔

(۲)

حاجی صاحب کے انتقال کے بعد دس برس کے بعد والدہ کی طبیعت بہت خراب ہوگئی کہ مجھے دہلی سے آنا پڑا۔مغرب بعد میں دوسری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ اندر اندر کچھ بول رہی تھیں۔جب خاموش ہوگئیں تو میں نے پوچھا کہ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟ میں سمجھا کہ کمزوری کی وجہ سے کچھ بڑبڑا رہی ہیں۔مگر انھوں نے سنجیدہ جواب دیا، کہنے لگیں ’پھوپھا (دادا صاحب) بابو (ضیاء الحق قاسمی مرحوم) اور تمہارے ابا آئے تھے، حال پوچھ رہے تھے۔میں نے پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں تو پھوپھا نے کہا کہ میں مدینہ طیبہ رہتا ہوں، بابو نے بتایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے عرش کے سایے میں جگہ دی ہے۔پھر میں نے کہا کہ مجھے بھی لیتے چلیے تو پھوپھا کہنے لگے کہ روزہ کے بعد آئیں گے تو لے چلیں گے۔‘ صبح کو ارشد سلمہ نے گلوکوز وغیرہ چڑھا دیا جس سے طبیعت سنبھل گئی اور پھر میں دہلی چلا گیا اور عید بعد آیا تو والدہ محترمہ ۸ رشوال کو عشا بعد تشریف لے گئیں۔ دوسرے دن طارق سلمہ نے بتایا کہ ایک بوڑھے سے آدمی کہہ رہے تھے کہ تمہاری دادی کو لینے ہم

بہت سے لوگ آئے تھے اور ان کی قبر پھولوں سے بھر دی گئی۔ میں نے حلیہ پوچھا تو حاجی عبدالرحیم صاحب کا حلیہ تھا، جن کو طارق نے دیکھا نہیں تھا۔

اولاد:

دادا صاحب کے چار بھائی تھے، دو لاولد گزر گئے۔ محمود صاحب مرحوم کی اولاد بحمدللہ پھل پھول رہی ہیں۔ دادا میاں کے دو لڑکے تھے، محمد عیسیٰ خان اور محمد امین الحق قاسمی۔ عیسیٰ خان کا انتقال جوانی میں ہو گیا۔ ۱۹۳۴ء کے قریب زبردست طاعون آیا تھا، اس میں خاندان کے خاندان صاف ہو گئے تھے مگر والد صاحب بحمدللہ ۱۹۶۵ء تک حیات سے رہے۔ ان سے ہم چار بھائی اور تین بہنیں ہیں (۱) ضیاء الحق قاسمی (۲) افضال الحق قاسمی (۳) انوار الحق (۴) ڈاکٹر عین الحق قاسمی علیگ (۵) تہذیب النسا، بلیا (۶) تشریف النسا، اعظم گڈھ (۷) سمیع النسا، اعظم گڈھ۔ جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو بھائیوں اور بہنوں کی وجہ سے بحمدللہ ۳۷ نفر موجود تھے، آج اگر دادی زندہ ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔ وہ دعا کرتی تھیں کہ 'اللہ تعالیٰ! ایک مولوی سے سو مولوی بنا دے'۔

والد صاحب نے علامہ انور شاہ صاحب سے حدیث پڑھی تھی، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری، مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری، مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب دیوبندی، مفتی محمد شفیع صاحب پاکستان، حکیم سعد اللہ صاحب مئو کے ہم سبق ساتھی تھے۔ ابتدائی تعلیم فتح پور ہنسوا میں مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی تھی۔ فراغت کے بعد دادا میاں نے ان کو جون پور مسجد اٹالہ میں بھیج دیا جہاں ایک حافظ صاحب ان کے پیر بھائی تھے، وہاں انھوں نے چھ ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور رمضان میں گھر پر قرآن سنایا۔ کہتے تھے کہ میں چھ ماہ جون پور میں رہا، لیکن جون پور کا شاہی پل دیکھنے کبھی نہیں گیا۔ اتنا شوق اور انہماک تھا تعلیم کا۔ آخر وقت میں روز آنہ دس پارے قرآن پاک حفظ سے پڑھ لیا کرتے تھے۔ رگھولی میں انتقال ہوا، دادا صاحب کے دائیں طرف آرام فرما رہے ہیں۔ کبھی کبھی خواب میں نظر آتے ہیں، بہت خوش، بہت بشاش اور عموماً والد صاحب، دادا میاں اور ضیاء الحق بھائی ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ دادا میاں جب گھر پر آتے ہیں تو سب کو ساتھ لے کر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کسی نہ کسی کو ضرور دکھائی دیتے ہیں۔

نور اللہ مرقدھم

۱۹۶۲ء میں سفر حج کے لیے قافلہ روانہ ہوا تو اس میں ہمارے گھر کے ۳ر افراد شامل تھے، دادا صاحب، والد مولانا امین الحق صاحب، والدہ محترمہ۔ غازی پور کے کئی افراد تھے، غالباً ۱۱ر افراد کا کارواں تھا۔ میرا معاملہ اور دادا کے باورچی جمال کا معاملہ معلق تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر جمال جائے گا تو دادا صاحب بے تکلفی سے کام لے سکیں گے، ورنہ ان کو تکلف ہوگا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ جمال آپ کے ساتھ جائے اور میں نہ جاؤں۔ یہ بات الہ آباد اسٹیشن پر طے ہوئی تو میں گھر لوٹ گیا اور جمال جا کر حج کر آیا۔

آج کل حاجی جمال صاحب دادا رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد پولیس لائن میں قیام پذیر ہیں، اور اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انھوں نے وہ مسجد آباد کر رکھی ہے، غالباً میرے ایثار کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا کہ دادا میاں کے بعد مجھے سفر حج کے لیے تین مرتبہ موقع ملا اور بحمد للہ چار مرتبہ عمرہ کر چکا ہوں، خدا قبول فرمائے۔

(۲)

سعد اللہ نگر کے ملا جی حاجی صاحب سے فیض آباد جا کر مرید ہوئے تھے، اور نماز کے ساتھ تہجد کے پابند تھے۔ نوادہ سے سعد اللہ نگر تک ملا جی کے نام سے وہی مشہور تھے، ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک شخص آیا جو سر سے پاؤں تک ننگا رہتا تھا، صرف آدھی ران تک جانگیہ پہنتا تھا، نماز وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

عوام میں ایسے لوگ بہت مقبول ہو جاتے ہیں۔ ملا جی نے بھی اس کی دعوت کر دی، اسے گھر بھی ملا جی لے کر آئے۔ کمرے میں وہ ملنگ ان کے ساتھ رہنے لگا، وہ نماز نہیں پڑھتا تھا، اس لیے ملا جی اس کے ساتھ رہتے تو وہ بھی نماز سے غافل ہو جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد نماز میں ان کا جی نہیں لگتا تھا، گھبراہٹ ہوتی تھی اور اس ملنگ میں ملا جی کے لیے بڑی کشش پیدا ہونے لگی تھی۔

میں سعد اللہ نگر گیا تو ملا جی کے گھر پر ٹھہرا، انھوں نے اپنی حالت بیان کی اور نماز سے غفلت ولاپرواہی کا قصہ سنایا اور رونے لگے کہ اس ملنگ کی وجہ سے میری آخرت خراب ہو جاوے گی، اس سے نجات پانے کی کوئی صورت بتایے۔ کیوں کہ میں اس کے ساتھ ساتھ رہنے میں سکون

پاتا ہوں، اکیلے جی گھبراتا ہے، اس کے اندر معلوم نہیں کیسی کشش موجود ہے۔

مجھے یہ سن کر پریشانی ہوئی، پھر میں نے سوچا کہ معاملہ عقل اور علم کا نہیں ہے، دل کا معاملہ ہے تو کسی صاحب دل کو پکڑ کر علاج بہتر ہوگا۔ چنانچہ میں نے ملا جی سے کہا کہ وہ اپنے پیر حاجی عبدالرحیم صاحب کے پاس چلے جائیں وہ آج کل رگھولی گھوسی اعظم گڑھ میں رہتے ہیں۔

ملا جی دادا میاں کے بڑے خادم اور حاضر باش رہے ہیں، فوراً سمجھ میں آ گیا اور سعد اللہ نگر سے اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں دادا صاحب نے پہچان لیا، دعائیں دیں۔ انھوں نے اپنی صورت حال بتائی تو دادا میاں نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، اس سے وہ کیفیت ختم ہوگئی اور پھر نمازوں میں لذت اور کیفیت محسوس ہونے لگی۔ واپسی میں میرے پاس آئے اور بہت خوش تھے۔ پھر اس ملنگ سے رابطہ توڑ دیا اور اس کو دوسری جگہ بھیج دیا۔ یہ ہوتی ہے اہل اللہ کی نظر!

(۳)

آزادی کے بعد سرھند کا سفر ہوا، پنجاب میں سکون تھا لیکن اب بھی بزرگ قسم کے آدمیوں کو دیکھ کر لوگ اچنبھے میں آ جاتے تھے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ دادا میاں کے ساتھ پانچ چھ آدمی تھے۔ میں بھی خدمت کے لیے ساتھ تھا۔ سرہند میں کئی دن تک قیام رہا۔ وہ کہتے تھے کہ کچھ باتوں سے الجھن میں ہوں، دو تین دن کے بعد آئے اور کہنے لگے کہ حضرت مجدد صاحب کی قبر پر مراقبہ میں تھا، وہ الجھن دور ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ دادا میاں نے حضرت مجدد صاحب کے قلب منور سے، ان کی روحانیت سے اور ان کے علمی انوار سے روحانی فیض حاصل کیا ہے اور انھوں نے ان کے دل کی گرہیں کھول دیں جن کے کھلنے کے لیے وہ برسوں سے پریشان تھے۔

بات یہ ہے کہ ہم عالم اجسام میں ہیں، بزرگان دین عالم ارواح اور عالم برزخ میں ہیں تو اگر کوئی آدمی اپنی روحانیت کو پرانوار اور طاقت ور کر لیتا ہے تو وہ عالم برزخ سے علوم ومعارف حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عالم برزخ میں جا کر انسانی روحیں دنیاوی زندگی سے بہتر طور سے توانا اور متحرک ہو جاتی ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام عالم برزخ میں تھے، مگر مسلم شریف کی روایت ہے کہ شب معراج میں حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی تو وادی سینا میں نماز پڑھ رہے تھے

اس کے بعد مسجد اقصیٰ میں ملے اور پھر آسمانوں پر ان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے زور دے کر حضور کو بار بار بھیج کر نمازوں کی تعداد کم کرائی۔

اس سے ثابت ہوا کہ عالم برزخ میں جا کر ان میں اتنی توانائی آ گئی ہے کہ وہ ڈھائی ہزار برس کے بعد بھی قبر میں زندہ ہیں اور زمین سے آسمان تک بے تکلف آتے جاتے ہیں اور انسانی احوال و کیفیات سے خوب واقف ہیں۔ یہی حال بڑے اولیاء اللہ کا ہے، شہداء کرام کا ہے کہ ان کی روحیں اپنے متعلقین کے لیے دعا، استغفار اور ترقی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی آدمی اپنی روح کو تازہ توانا اور متحرک کر لیتا ہے تو ان حضرات سے رابطہ پیدا کر کے علوم وفنون حاصل کر لیتا ہے، کبھی خواب میں، کبھی بیداری میں، کبھی نیم بیداری و نیم خوابیدگی میں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے متعلقین سے فرمایا ہے کہ: ''من رانی فقد رانی فان الشیطان لا یتمثل بی'' (بخاری)

تو وہ لوگ جو حضور ﷺ کو دیکھا کرتے ہیں اور ان سے علوم و معارف بھی حاصل کر لیتے ہیں، وہ ان کا روحانی فیضان ہے۔ پھر کچھ ایسے حضرات ہیں جو وہاں پہنچ کر یا دوسرے اہل اللہ کی قبروں پر جا کر مراقبہ کے ذریعہ ان کا فیض حاصل کرتے ہیں۔

دراصل ہم جیتے تو ہیں عالم اجسام میں، مگر ہماری روح عالم ارواح کی ہے۔ اس لیے اس کا تعلق عالم ارواح اور عالم اجسام دونوں سے رہتا ہے، اور خواب دونوں کے درمیان کی ایک ایسی منزل ہے جہاں کی زبان، جہاں کے علوم، جہاں کے دن اور رات، جہاں کی چلت پھرت، سب ہمارے جسمانی عالم سے مختلف ہے۔ اس لیے کبھی کبھی دیکھا ہوا خواب عالم اجسام میں دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ''ھذا تاویل رؤیای من قبل'' تو روح عالم اجسام، عالم خواب اور عالم ارواح تینوں سے تعلق رکھتی ہے۔ سائنس کا تعلق عالم اجسام سے ہے، نبوت کا تعلق عالم ارواح سے ہے اور انسان کا تعلق ہر عالم سے ہے، آج بھی ہے کل بھی رہے گا۔ اس لیے انبیا کا تعلق اور اولیاء اللہ کا تعلق ہر عالم سے ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کی روحانیت جب اپنی پوری شان پر آتی ہے تو اشرف المخلوقات بن کر ہر جگہ رہتی ہے اور اس کی روح اس عالم میں رہتے ہوئے بھی عالم ارواح سے رابطہ رکھتی ہے، کبھی خواب میں، کبھی مراقبہ میں، کبھی وجد و حال میں اور کبھی قبر اور برزخ میں، جیسے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی۔

اللھم اتمم لنا نورنا، ونور قلوبنا واروا حنا بحرمة النبی الاکرم ﷺ

(۴)

سرہند میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔آزادی سے پہلے دادا میاں کا ایک قافلہ حضرت مجدد الف ثانی کی زیارت کے لیے سرہند گیا تو اس وقت ملا شور بازار اپنے ہزاروں مریدین کے ساتھ اسی غرض سے سرہند تشریف لے آئے تھے۔ پرنور چہرہ، گداز بدن، آنکھوں میں چمک، پوری بھیڑ میں اپنی شان اور اپنے جلال کی وجہ سے ممتاز تھے۔

پتہ چلا تو دادا میاں ان سے ملنے کے لیے ان کے کمرے پر تشریف لے گئے، ان کے ساتھ نیاز علی کاکوری اور غالباً فاروق صاحب وکیل غازی پور بھی تھے۔میں کمرے پر تھا، وہاں دیکھا تو پورا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور دروازہ پر لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ پشاوری اور کابلی لوگ کسی کی کوئی بات نہیں سنتے تھے، نہ پشتو کے علاوہ کوئی زبان جانتے تھے۔لوگوں سے فارسی میں کہا گیا کہ ''بزیارت شیخ آمدیم'' مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔

دادا میاں بیچ دروازے میں کھڑے تھے، جب تک ملا شور بازار اپنی مسند سے اٹھ کر وہیں کھڑے ہوگئے اور گرجدار آواز میں فرمایا کہ ان بزرگ کو میرے پاس آنے دو، درمیان میں راستہ بنادو۔ راستہ بن گیا اور دادا میاں ملا صاحب تک پہنچ گئے۔ ملا شور بازار نے فرمایا کہ 'مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کی پیشانی کو بوسہ دوں، اس میں بڑی نورانیت ہے۔' پھر دادا میاں کی پیشانی چوم لی اور پھر احترام سے اپنی مسند پر بیٹھایا اور حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں کرتے رہے۔

یہ ہوتے ہیں ارواح عالیہ کے لوگ کہ دلہا را بدلہا راہ باشد۔اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ساتھ صدیقین کا معاملہ فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کی اتباع کی اچھی توفیق عطا کرے۔

بحرمة النبی الاکرم صلی الله علیه وسلم

❑❑❑

(یہ مضمون گیارہ قسطوں میں 'دانشور' گورکھ پور میں شائع ہوا تھا۔آخری قسط اکتوبر نومبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی تھی)

حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی
کا ایک دلچسپ مباہلہ

فیض آباد آصف الدولہ کی راجدھانی تھا، اس لیے نوابی تہذیب، شیعی عقائد اور مسائل نیز لکھنؤ طرز و انداز کا شہر بن گیا تھا، جس کی نظیر مشرقی یوپی میں نہیں تھی۔ بڑے بڑے تعلقہ دار، زمیندار پورے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔ تعزیہ اور شیعی رسوم کی ادائیگی کے لیے اوقاف اور جاگیریں مقرر تھیں۔ حکام تک ان کی بڑی رسائی تھی۔ اس شہر کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے شروع میں وہیں دو شخصیتیں باہر سے بھیجیں۔ ایک تھے مولانا محمود حسن کے شاگرد مولانا ضرغام الدین جو مظفرنگر کے باشندہ تھے، لیکن شیخ الہند نے ان کو فیض آباد میں کام کرنے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ دوسری شخصیت تھی حاجی عبدالرحیم صاحب کی جن کو مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے خلیفۂ ارشد مولانا عبدالکریم صاحب نے فیض آباد کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

ان دونوں بزرگوں نے وہاں اسلامی زندگی کو فروغ دیے اور بدعت، رسم و رواج اور شیعی اثرات کو ختم کرنے کے لیے اہم رول ادا کیا۔ حاجی صاحب کے کام کرنے کا انداز صوفیانہ تھا اور مولانا ضرغام الدین کا عالمانہ۔ چنانچہ مولانا نے شہر میں انجمن حمایت الاسلام قائم کیا، اور جب شیعہ حضرات نے غذائے روح کا عام جلسہ کیا تو مولانا نے شفائے روح نامی اجلاس کا سلسلہ شروع کرایا جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک جاری ہے۔

۱۹۳۷ء میں شفائے روح کے اجلاس کا اعلان ہوا، اس میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب جیسے نامی علما مدعو کیے گئے، تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے شیعہ حضرات نے غذائے روح کا اجلاس بلالیا، اور اس میں اپنے مجتہد حضرات کو

دعوت دی، اوران تاریخوں میں دنگل جمایا گیا۔سنیوں کا اجلاس سرائے پختہ میں تھا اور شیعوں کا وثیقہ اسکول کے پاس، دونوں طرف سے تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔

سُوّر یا آدمی:

حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی نے شیعہ حضرات کو مخاطب کر کے ایک اعلان لکھا اور جلسہ گاہ کے قریب لگوادیا، اس میں تحریر تھا کہ:

''سنی اور شیعہ میں جو تنازعہ ہے، وہ اس طرح بھی طے ہوسکتا ہے کہ کسی مجتہد صاحب کو میرے ساتھ کسی کمرے میں بند کردیا جائے اور تین دن کے بعد اسے کھولا جائے۔ہم دونوں میں سے جو شخص سور بن جائے اس کا مذہب باطل۔''

عبدالرحیم فضلی متصل پولیس لائن

اعلان اور حاجی عبدالرحیم صاحب جیسے مشہور صوفی بزرگ کی طرف سے، ان شیعہ حضرات کے خلاف جن کی پہنچ اعلیٰ حکام تک اور حکومت تک تھی، اور وہ بھی مجاہد کا اعلان۔اس سے پورے شہر میں ہلچل مچ گئی۔غذائے روح کے ذمہ داروں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی، کیوں کہ وکیل کے مقابلہ وکیل آسان ہے، عالم کے مقابلہ مجتہد آسان ہے، لیکن ایک صوفی بزرگ کے مقابل کسی صوفی عالم، مجتہد یا علامہ کا تلاش کرنا مشکل تھا، سخت مشکل۔چنانچہ کوئی عالم یا مجتہد اس کے لیے آمادہ نہیں ہوسکا کہ کمروں میں بند ہوکر سور بن جانے کی دھمکی کا مقابلہ کرسکے، اور یہ بھی مشکل تھا کہ اپنی راجدھانی میں اتنی سخت توہین برداشت کی جاسکے۔اس لیے کپتان، کلکٹر اور کمشنر تک دوڑ بھاگ شروع ہوگئی کہ حاجی صاحب اپنا اعلان واپس لیں۔یہ سخت توہین آمیز اعلان ہے، اور اشتعال انگیز ہے۔جب اوپر کی سطح پر ہنگامہ شروع ہوا تو غلام حسین اور جنگی خاں وغیرہ نے حاجی صاحب کے پاس آکر دریافت کیا کہ ایک اعلان اس طرح کا لگا ہے، جس سے پورے شہر میں ہلچل ہے، کیا آپ نے واقعی لگوایا ہے؟ حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں نے لگوایا ہے، آپ لوگوں کی مناظرہ بازی سے اچھا یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے دودھ کا دودھ و پانی کا پانی الگ ہوجائے۔اعلان میں نے لگوایا ہے، اور میں شیعہ حضرات سے مقابلہ کے لیے بالکل تیار ہوں جو لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے ہیں، ان کی توہین کرتے ہیں، خدا کی عدالت میں ان کا

حشر یہی ہوگا۔ پھر فرمایا کہ مناظرہ کرنے سے حق و باطل کا فیصلہ جلد نہیں ہوتا، اس لیے میں نے اعلان کر دیا ہے اور کسی بھی بڑے سے بڑے مجتہد کے ساتھ مناظرہ کے لیے تیار ہوں۔

پولیس کی مداخلت:

جب فضا بہت گرم ہوگئی تو کپتان پولیس کو فکر پیدا ہوئی۔ اس وقت کپتان، کمشنر........ انگریز ہوتا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ پہلے حاجی صاحب کو سمجھانا چاہیے۔ یہ ایک بے تکا اعلان ہے اس کو واپس لے لیں۔ چنانچہ کپتان پولیس لائن کی کورٹ کار میں آیا، اور ایک مسلمان افسر کو حاجی صاحب کے پاس بھیجا کہ حاجی صاحب کو بلا لاؤ۔ وہ آیا اور اس نے نرمی سے حاجی صاحب کو وہاں جانے کے لیے آمادہ کر لیا اور ساتھ لے کر گیا۔ حاجی صاحب انگرکھا پہن کر چھتری لے کر پہنچے تو کپتان کھڑا ہو گیا۔ ساتھ لے جا کر اندر معاملہ اور شہر کی صورت حال بتا کر ان سے پوچھا کہ یہ اعلان آپ نے کیا ہے؟ جی ہاں میں نے لگوایا ہے۔

حاجی صاحب! کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ حاجی صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ چلیے، کسی شیعہ کی تازہ قبر کھودوایے، اس میں خود آپ کو سور نہ دکھاؤں تب کہیے گا تو کپتان کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ 'بابا! بیٹھیے بیٹھیے، میں ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے اعلان کے مطابق کوئی انتظام کریں'۔

کپتان نے کمشنر اور کلکٹر سے کہہ دیا کہ بابا ٹھیک آدمی ہیں، وہ مجھ سے کہتا ہے کہ چلو تمھیں قبر میں سور دکھاؤں گا۔ اس لیے بابا کو نہیں، ان حضرات سے کہیے کہ اپنے کو حق ثابت کرنا ہے تو کسی عالم یا مجتہد کو بلا کر ان سے فیصلہ کرائیں۔

چنانچہ شیعہ حضرات سے کہہ دیا گیا اور وہ حکومت اور پولیس کی مداخلت سے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد نہ کوئی شیعی عالم آیا نہ کوئی مجتہد حاجی صاحب سے مباہلہ کے لیے تیار ہوا۔

سارے شہر کو انتظار تھا کہ لکھنؤ اور جون پور تک کے مجتہدین میں سے کوئی نہ کوئی مقابلہ کے لیے ضرور تیار ہو جائے گا مگر انھوں نے توہین برداشت کر لی، مقابلہ کی ہمت نہ کر سکے۔ اس طرح حاجی صاحب نے نوابان اودھ کی ساکھ ہمیشہ کے لیے گرا دی۔

مباہلہ:

قرآن پاک میں اس کا تذکرہ ہے۔اہل کتاب نے جب پیغمبر اعظم ﷺ کو بہت تنگ کیا اور حق کا کسی طرح اقرار نہ کرسکے تو آخری فیصلے کے لیے حق و باطل کا معیار قرار پایا کہ آں حضرت ﷺ سے مباہلہ ہو جائے، مگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص تیار نہیں ہوا، اور حضور کی دعوت حق، مباہلہ اور برتری کی سنت باقی رہ گئی، جسے فیض آباد میں محترم حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی نے میدان مناظرہ میں اتر کر تازہ کر دیا، اور اہل حق کو تقویت و فتح نصیب ہوئی۔

❏❏❏

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۱۹۹۵ء

قاری ضیاء الحق قاسمی

لکھیم پور کھیری سے دیوبند خط گیا کہ ایک عالم چاہیے اور مہتمم صاحب نے قاری ضیاء الحق اعظمی (۱۹۲۰-۱۹۵۱ء) کو لکھ دیا کہ آپ برور ضلع لکھیم پور پہنچ جائیں۔

قاری صاحب اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ آخر میں ایک حافظ صاحب نے پوچھا 'آپ قاری صاحب ہیں؟' اور انھوں نے پوچھا کہ 'آپ حافظ نبی احمد ہیں؟' اس تعارف کے بعد دونوں قصبہ برور پہنچ گئے اور قاری صاحب نے مکتب میں مہتمم صاحب کا کام شروع کر دیا۔

تقریباً ۸ ماہ بعد وہاں برور میں ہندوؤں کا ایک بڑا میلہ لگا، اس میں پانچ لڑکوں کو تماشا بنا کر پورے میلے میں گھمانے کا رواج تھا۔ اس مرتبہ میلہ والوں نے جن لڑکوں کو تماشا بنایا، وہ قاری ضیاء الحق قاسمی کے شاگرد تھے۔ جب قاری صاحب نے ناغہ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ میلے میں تھے اور یہ کام سپرد تھا۔ قاری صاحب نے لڑکوں کے ورثا کو بلوایا اور پوچھا کہ ہندوؤں کا میلہ ہے، اس میں صرف مسلمان بچوں کو کیوں تماشا بنایا جاتا ہے؟ کیا ہندو بھائیوں کے پاس بچے نہیں ہیں؟ پھر قاری صاحب نے جمعہ کے خطبہ سے پہلے اس پر ایک گرما گرم تقریر کر دی۔ ماشاء اللہ اچھے مقرر تھے، اس لیے برور جیسے قصبے میں ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ ہندو لوگ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا رواج چھوڑ دیں، یہ غلط ہے۔

ہندو نیتاؤں کو معلوم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے کہ ہم ہمیشہ اسی طرح کرتے آئے ہیں، آج اس کو ہندو مسلم رنگ دے دیا گیا۔ انھوں نے قاری صاحب سے شکایت کی، قاری صاحب نے کہا کہ اگر یہ عبادت ہے تو اپنے بچوں کو استعمال کیجیے اور اگر صرف تماشا ہے تو ہم مسلمانوں کو ذلیل مت کیجیے۔ ہم کم ضرور ہیں مگر عزت میں آپ کے برابر ہیں۔ اس پر وہاں کے حکیم صاحب

نے بھی قاری صاحب کا ساتھ دیا۔اس لیے یہ شکایت کلکٹر تک پہنچا دی گئی کہ قاری صاحب نوعمر ہیں،ان کو حالات کا علم نہیں۔اس لیے خواہ مخواہ ایک مسئلہ بنا کر ہندو مسلم فیلنگ پیدا کر دی ہے۔

ایس پی نے قاری صاحب کے پاس پولیس بھیجی کہ جا کر سمجھا دو مگر قاری صاحب نے پولیس کو سمجھا دیا تو انھیں لکھیم پور بلایا گیا۔راستے میں ایس پی نے سمجھایا مگر قاری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہندؤوں کے میلے میں مسلمان بچے کیوں تماشہ بنائے جاتے ہیں؟

لکھیم پور بلا کر ان سے کہا گیا کہ آپ لکھیم پور چھوڑ کر چلے جایے، ورنہ ہم آپ کو جیل میں ڈال دیں گے۔قاری ضیاء الحق قاسمی صاحب نے کہا میں ضلع بدر نہیں ہوسکتا،جیل جا سکتا ہوں۔میرے استاذ مولانا حسین احمد مدنی کا طریقہ یہی ہے۔

آخر قاری صاحب لکھیم پور کھیری جیل پہنچا دیے گئے۔حکیم جعفر صاحب اور حکیم رمضان الحق صاحب جیسے حضرات نے قاری صاحب کو بھی سمجھایا، پولیس کو بھی۔مگر اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا اور قاری صاحب ایک مہینہ تک جیل کی ہوا کھاتے رہے۔

اتفاق سے ضلع کلکٹر حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فیض آبادی کا مرید تھا۔ان کو جب معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کا پوتا ضیاء الحق ہماری جیل میں بند ہے تو اس نے بات کی اور انھیں عزت و آبرو کے ساتھ قصبہ برور واپس کرایا۔جب گھر والوں کو معلوم ہوا کہ قاری ضیاء الحق جیل سے چھوٹ کر باعزت واپس آ گئے تو سب کو خوشی ہوئی کہ وہ عزت سے واپس آ گئے اور مجھ کو خوشی ہوئی کہ میرا بڑا بھائی سنت یوسفی پر عمل کر کے لوٹا اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کے لیے تختہ دار پر پہنچنے کی کوشش کی۔یہ واقعہ ۱۹۴۱ء کا ہے جب ہم لوگ دیو بند سے فارغ ہو کر واپس آئے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد لکھیم پور کھیری میں ایک بڑا جلسہ ہوا۔اس میں استاذ محترم حضرت مدنی تشریف لائے تھے۔حکیم رمضان صاحب حضرت مدنی کے گھریلو معالج تھے۔بڑے نباض، نہایت مخلص اور مہمان نواز۔انھوں نے قاری ضیاء الحق کا حضرت سے تعارف کرایا کہ یہ ایک مہینہ برطانوی جیل کاٹ کر واپس آئے ہیں۔

حضرت مدنی نے مسکرا کر کہا کہ ابھی کیا ہے،ابھی ہتھیلی پر چراغ جلایا گیا ہے۔پھر اس کی

تشریح فرمائی ''پہلے زمانے میں ستی کی رسم ہوتی تھی، اس دور میں اگر کوئی عورت اپنے شوہر پرستی ہونا چاہتی تھی تو خاندان کے لوگ ہتھیلی پر گھی رکھ کر اس میں چراغ جلاتے تھے، اگر وہ عورت اس کو برداشت کرلیتی تھی تو اس کو ستی کی اجازت ملتی تھی، ورنہ نہیں۔''

یہ بات حضرت شیخ ہی فرماتے تھے جنھوں نے مصر کی جیل دیکھی اور مالٹا کی سلاخوں میں رات رات بھر کھڑے رہے۔ اس لیے حضرت نے اپنے انداز کی داد دی، اور خوب دی۔

یہ تھے ہمارے بڑے اور یہ تھے ہمارے چھوٹے! کہ اسلام پر آنچ آنے لگے تو تھانہ پولیس اور جیل کچھ نہیں، اسلام اور مسلمان اصل ہیں۔ ہم کچھ نہیں ہیں، ہمارے بڑے اس پر خوش ہوتے تھے کہ شاگرد جیل کی ہوا کھانے اور اس سے آگے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

قاری ضیاء الحق وہاں سے ہنسور فیض آباد آ گئے اور وہاں تین سال تعلیمی کام کرتے رہے، پھر دق کے مرض میں ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۲۰۰۴ء

مولانا محمود الحسن بستوی

۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علمائے ہند نے ممبئ میں دینی تعلیمی کنونشن کر کے ہندوستان کے بچوں کو دینی تعلیم کی طرف متوجہ کیا تھا تو سارے ملک میں حرکت سی پیدا ہوگئی تھی۔ کہیں دینی تعلیمی بورڈ، کہیں کونسل، کہیں کانفرنس اور کہیں کسی نام سے کام شروع ہوگیا تھا۔ اس میں قابل ذکر تحریک قاضی عدیل صاحب عباسی مرحوم کی تھی جو اپنے ضلع بستی میں 'انجمن تعلیمات دین' کے نام سے انھوں نے شروع فرمائی تھی۔ پھر بستی کانفرنس میں 'دینی تعلیمی کونسل' بن کر سامنے آگئی۔

اس کونسل کی تشکیل مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی شخصیت اور قاضی عدیل صاحب عباسی کی فکر ونظر سے ہوئی تھی۔ مگر اس کام کو تحریک کی شکل دینے والی ہستی کا نام تھا مولانا محمود الحسن بستوی۔ جو پوری تحریک میں بال کمانی کی طرح متحرک، بے چین اور خود کار تھے۔ کونسل ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ کسی ضلع میں کانفرنس کراتے تو ابتدائی میٹنگ سے لے کر کانفرنس کے خطبہ صدارت کی طباعت تک کے سارے کام اپنی ذمہ داری سے پورے کراتے اور ہر کام سلیقے، فکر اور وقت مقررہ پر انجام دینے کے لیے بے قرار رہتے۔ اور یہ ساری ذمہ داریاں اپنے سر لینے اور دوسروں کا بار ہلکا کرنے میں ان کو لطف آتا تھا۔ پھر وہ اپنی عمر، اپنی صحت اور بیماری بھی بھول جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جہاں بھی انھوں نے اجتماع، کنونشن یا کانفرنس طے کرلی وہاں وہ ہو جاتی تھی اور صرف جاننے والے جانتے تھے کہ یہ سارا کام ایک ایسے آدمی نے کیا ہے جس کا نام کہیں نہیں ہے جب کہ وہ سب کچھ ہوتے تھے۔

مولانا محمود کو خدا نے دفتری صلاحیت بے پناہ دی تھی۔ اس لیے کونسل کو ایک فعال دفتر مل گیا تھا جس میں ہر قسم کے فارم، رجسٹر، کاروائیاں، نصاب تعلیم، ریمارک، خطبے اور مباحث مل

جاتے تھے۔دفتری نظم کسی جماعتی تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔اس کے بغیر جماعتیں اپاہج ہوکر بیٹھ جاتی ہیں مگر مولانا محمود نے دفتری نظم کو کارگزار بنا کر کونسل میں جان ڈال دی تھی۔

مولانا محمود کونسل کے سکریٹری تھے اور راقم الحروف دینی تعلیمی بورڈ کا سکریٹری تھا۔مگر حسب سابق ہمیشہ بھائیوں کی طرح ملتے رہے۔جب کبھی میں ان کے دفتر پہنچ گیا تو اپنے یہاں کی تمام مطبوعات میرے سامنے ڈال دیتے تھے اور میں اپنی پسند کے مطابق منتخب کر لیتا تھا۔اسی طرح تعلیمی مشوروں میں کبھی بخل نہیں لیتے تھے۔نومبر ۱۹۸۵ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

مولانا محمود کی موت سے ایک مخلص ذمہ دار، ذہین کارکن، قابل اعتماد دوست، فعال شخصیت اور بے تکلف ساتھی چلا گیا جو جماعتی کاموں کے وقت بہت دنوں تک یاد آتا رہے گا۔

میں دسمبر ۱۹۸۵ء میں عزیزم فرید عباسی کے ساتھ ببارہ قاضی گیا تو دیکھا کہ قاضی عدیل مرحوم کے پائتنی مولانا شکیل عباسی کے بغل میں ابدی نیند سو رہے تھے۔برداللہ مضجعہ

جان کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

❑❑❑

ماخذ:'الریاض' گورینی۔۱۹۸۵ء

دارالمصنفین کی شام غم

سید صباح الدین عبدالرحمان

وگر دانائے راز آید نہ آید

۱۹۴۱ء میں تعلیم ختم کر کے لاہور سے اعظم گڑھ آ رہا تھا، ریل میں چند سفید پوش حضرات خوش گپی کر رہے تھے مگر ان کا انداز بحث جیسا ہو گیا تھا۔ اس میں موضوع بحث تھی اردو زبان، اور بحث کرنے والے دونوں ادیب تھے۔ ایک نے دوسرے کو جواب دیتے ہوئے برجستہ کہا، اور ایسا کہا کہ وہ فقرہ ذہن میں سما کر رقص کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ:

''جناب! اردو دہلی میں پیدا ہوئی، لکھنؤ میں جوان ہوئی، اور دارالمصنفین میں بیاہی گئی۔''

اس مبالغہ سے مجھے حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی کہ لاہور کے ادیب دارالمصنفین کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اور انھوں نے علامہ شبلی کی اس تعمیری خدمت کو کس قدر داد تحسین دی ہے۔ نیز علامہ نے اردو زبان کو علمی لب ولہجہ اور عصری شناخت دے کر جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ کیسا عجیب کارنامہ ہے اور کتنی دور سے نظر آتا ہے۔

اب نومبر ۱۹۸۷ء کے تیسرے ہفتہ میں جب صباح الدین عبدالرحمان صاحب کا لکھنؤ میں حادثہ پیش آیا تو مجھے وہ دارالمصنفین بہت یاد آیا، بہت یاد آیا۔ کیوں کہ مرحوم ہی اس کی آبرو تھے۔ مرحوم کا تاریخی ذہن، تحقیقی مزاج اور علمی سلیقہ انھیں ہر محفل میں ممتاز کر دیتا تھا، اور لوگ محسوس کرنے لگتے تھے کہ یہ مشت پر، بلبل ہزار داستاں ہے۔ افسوس کہ وہ مرغ خوش الحان ہمیشہ کے لیے باغ قدس کی طرف اڑ گیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سووہ بھی خموش ہے

صباح الدین صاحب بہار میں پیدا ہوئے، ڈالی گنج لکھنؤ میں وفات پائی، اعظم گڑھ میں پیوند خاک بنائے گئے۔ مگر ان میں کوئی بات اتفاقی نہیں تھی، انتظامی تھی۔ وہ اتنی ہی مہلت لے کر آئے تھے، جو ڈالی گنج جاتے جاتے پوری ہوگئی، اور گھڑی کی چابی جہاں بھی ختم ہوجاتی ہے، وہیں رک جاتی ہے۔ اسی طرح عمر جہاں پوری ہوگئی، پھر آدمی ایک قدم آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔ مجھے خوشی اس کی ہے کہ مرحوم سفر آخرت پر گئے تو شہادت کا سنہرا تمغہ لے کر خدا کے دربار میں حاضر ہوئے جو انسانی عظمت کا عظیم ترین تمغہ ہے، جس کی لوگ آرزو کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور نہیں ملتا۔ مگر انھیں اللہ کی حکمت وقدرت نے تحفہ میں عنایت کردیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

صباح الدین صاحب کی موت ایک آدمی کی موت نہیں، ایک طبقے اور ایک ادارے کی موت تھی۔ چنانچہ دارالمصنفین سونا ہوگیا، اب اس کی ترجمانی کون کرے گا اور کس حد تک کرے گا؟ معلوم نہیں۔

و ما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

دارالمصنفین ایک آئیڈیل ادارہ ہے، جسے شبلی مرحوم نے فکر ونظر بھی دیا تھا، زندگی بھی۔ پھر ان کا دوسرا سب سے بڑا تحفہ سید سلیمان تھے، جو علامہ شبلی کا علم بھی تھے، زبان بھی۔ انھوں نے شبلی کے خواب کو مجسم کردیا تو دارالمصنفین سارے عالم میں چمک گیا۔ آج دنیا کی کوئی اردو لائبریری نہیں جو دارالمصنفین کے رسالے یا کتابوں کے بغیر مکمل ہوسکے۔ سید صاحب کے بعد شاہ معین الدین صاحب اس کے ناخدا تھے، جو اپنی پیرانہ سالی، ضعف اور مجبوریوں کے باوجود جوانوں کی طرح اس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے تھے۔ پھر اسی فرض کی ادائیگی میں وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور دارالمصنفین کے ہر بہی خواہ کو سوگوار چھوڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

سوال یہ ہے کہ دارالمصنفین کا جہاز کون پار لگائے گا؟ مگر اس سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فکروفن کی اس کرسی پر کون بیٹھے گا؟ جو شبلی اور سید سلیمان کی کرسی ہے۔ یا چار پشتوں کے بعد صرف ان کی خانہ پری کی جاوے گی، جیسے تمام اداروں میں ہوا کرتا ہے؟ یہ سوال بہت پیچیدہ اور دوررس سوال ہے۔ لیکن یہاں ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ شبلی منزل کا قیام جن مقاصد کے لیے ہوا تھا، ان منزلوں کو دارالمصنفین نے حسن وخوبی سے طے کرلیا ہے۔ اب تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے بعد اس کا موضوع فکر اور روئے سخن کیا ہوگا؟

ضرورت ہے کہ شبلی اسکول اسے طے کرے، پھر دارالمصنفین کو نیا موضوع فکر دے کر اس کا سمت سفر متعین کرے، تاکہ یہ عالمی ادارہ اپنی افادیت، ضرورت اور عظمت کو قائم رکھ سکے۔ ورنہ یہ تاریخی ادارہ ایک کتب خانہ اور مکتبہ بن کر رہ جائے گا۔ اور یہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہوگی، جو اپنے کو شبلی اسکول کا نمائندہ اور امین کہتے ہیں۔

خدا اس مسافر کی ہمت بڑھائے
جو منزل کو ٹھکرا دے منزل سمجھ کر

ضروت ہے کہ ان تمام ہی حضرات سے رابطہ پیدا کیا جائے جو دارالمصنفین کو ایک علمی تحریک کہتے ہیں اور شبلی اسکول کو عصر حاضر کا ترجمان خیال کرتے ہیں۔ پھر ان سب کے مشورے سے دارالمصنفین کی نشأۃ ثانیہ کا انتظام کیا جائے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیا جائے۔

خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

❑❑❑

ماخذ: 'الریاض' گورینی۔ ۱۹۸۷ء

تاریخ ساز شخصیت اور ہمارا سلوک
سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان

دولاکھ انسان روز پیدا ہوتے ہیں مگر عبدالغفار خان کبھی کبھی جنم لیتا ہے۔ وہ جب آجاتا ہے تو چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے اور جب چلا جاتا ہے تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایسے افراد کو کون بناتا ہے؟ ماں باپ، ماحول، تعلیم، زمانہ یا اساتذہ؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں بناتا، ورنہ ان جیسے بہت سے اور افراد بنائے جاسکتے تھے۔ مگر برصغیر کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اس صدی میں دوسرا غفار خان نہیں بنایا جاسکا۔ حالاں کہ وہی آسمان، وہی زمین، وہی آب وہوا آج بھی ہے۔ وہی علی گڑھ، وہی پشاور، وہی ہندوستان اس وقت بھی ہے بلکہ اس سے بہتر۔

بات یہ ہے کہ قدرت نے فیصلہ کرلیا تھا کہ برصغیر کو غلامی سے آزاد ہونا ہے تو اس نے شاہ عبدالعزیز ایسا دور اندیش، حاجی امداداللہ ایسا سپہ سالار، شیخ الہند جیسا مدبر، گاندھی جی جیسا سیاست داں، ابوالکلام ایسا ہوش مند، عبدالغفار ایسا مرد مجاہد اور جواہر لال ایسا جرأت مند اس زمین کو عطا کردیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں کھولیں، حالات کا جائزہ لیا، ہمت کی، جیلوں کے دروازے کھولے، مصیبتوں کو گلے لگایا اور ظالم کو ظالم کہتے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ سارا زمانہ ان کے ساتھ نعرے لگانے لگا حتی کہ نہ صرف برصغیر آزاد ہوگیا بلکہ مصر سے انڈونیشیا تک آزادی کا سورج طلوع ہوگیا۔

(۲)

عبدالغفار خان کی زندگی گاندھی جی سے نہیں، حاجی ترنگ زئی سے شروع ہوتی ہے۔
حاجی ترنگ زئی سرحدی قبائل کا وہ شیر مرد تھا جس نے سو برس تک برطانوی سامراج کو اپنے

علاقے میں قدم نہیں جمانے دیا۔ حالاں کہ چرچل کہا کرتا تھا کہ 'اگر آسمان ہم پر پھٹ پڑے تو ہم اپنی سنگینوں پر اسے روک لیں گے۔' لیکن ایسے ایسے تمام فرعون بھی ان سنگینوں کو سرحدی قبائل میں چمکا نہیں سکے۔ کیوں کہ اس مرد مجاہد نے طے کرلیا تھا کہ ہمیں آزاد رہنا ہے اور اپنی آزادی کو بہر قیمت باقی رکھنا ہے۔ ان غیور پٹھانوں کی گود میں عبدالغفار خاں نے پرورش پائی، جوان ہوئے اور پشاور میں ملازم ہو گئے۔

ایک دن ان کے ایک انگریز دوست نے خان صاحب کے انگریزی لباس پر طنز کیا کہ ''غفار خاں انگریز بننا چاہتا ہے.......'' یہ طنز نہیں تیر تھا، زہر آلود تیر۔ وہ خان صاحب کے دل میں ترازو ہو گیا۔ ان کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ غلام اور آزاد میں کیا فرق ہے؟ اور غلام کی برطانوی سامراج میں کیا قیمت ہے؟ انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور میدان جنگ میں اتر آئے۔ اس وقت ان کے سامنے سب سے بڑا میدان جنگ حاجی ترنگ زئی کی کمان میں تھا۔ ان کے مسلح نوجوان تمام علاقوں میں ہتھیلی پر سر رکھ کر برطانوی سامراج کی ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی فوجیں دم کے دم میں ختم کر دیتے۔ بڑے بڑے افسر کو سگریٹ جلاتے ہی نشانہ بنا دیتے تھے۔

حاجی ترنگ زئی کو سب سے بڑی امداد شیخ الہند مولانا محمود حسن سے اور ان کے شاگردوں سے ملتی تھی جو اس علاقے میں علم لے کر پہنچے تھے اور جاہل پٹھانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ حاجی ترنگ زئی اور شیخ الہند کے درمیان والی مضبوط کڑی کا نام تھا عبدالغفار خان۔ جو سرحد سے چل کر آتے تھے اور دیوبند میں شیخ الہند سے ملاقات کر کے حاجی صاحب کا پیغام پہنچاتے تھے اور آپ کا پیغام ان تک لے جاتے تھے۔ حضرت شیخ الہند ان سے بات کرنے میں اس قدر راز داری فرمایا کرتے تھے کہ کبھی مجلس میں اپنے مکان پر ان سے گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کو لے کر دیوبند سے باہر عیدگاہ کے میدان میں نکل جاتے اور وہاں دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی پوزیشن سمجھاتے تھے۔ اس طرح ایک طرف حاجی صاحب کو پڑھے لکھے علما ملتے رہے، ہندوستان سے کمک ملتی رہی۔ دوسری طرف حضرت شیخ الہند کی ریشمی رومال تحریک کے لیے کابل اور ہندوستان کے درمیان کا علاقہ سر ہو رہا تھا۔ جب یہ سارا علاقہ سر ہو گیا تو حضرت شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھی کو اس سرحدی علاقے سے کابل بھیج دیا اور خود ترکی حکومت سے گفتگو کرنے کے لیے عرب

تشریف لے گئے۔اس درمیان میں مولانا عبیداللہ سندھی نے ریشمی رومال تحریک مرتب کر کے اپنی پوری اسکیم سرحدی علاقوں میں، کابل میں اور ہندوستان میں پہنچادی۔

اس پوری اسکیم میں خان عبدالغفار خان صاحب نے سب سے اہم رول ادا کیا تھا۔ کاش کوئی صاحب اس رول سے پردہ اٹھاتے تاکہ دنیا معلوم کر سکے کہ خان صاحب نے ۱۹۱۵ء کے آس پاس کیسے شاندار کارنامے انجام دیے تھے۔مگر اس وقت تلوار ان کے ہاتھ میں تھی، گولیاں ان کے جیب میں اور شاملی کا میدان ان کی نگاہوں میں۔

(۳)

حضرت شیخ الہند ۱۹۱۹ء میں مالٹا کی قید فرنگ سے ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے چندمہینوں میں یہاں بنیادی تبدیلیاں کیں:

۱) انقلابی ذہن رکھنے والوں کے لیے جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈالی۔

۲) انقلاب کے لیے مسلح تصادم کا راستہ ترک کر کے ہندو مسلم اتحاد اور عدم تشدد کی راہ اختیار فرمائی۔

۳) علما کو جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم پر جمع کر کے انھیں اپنا رول ادا کرنے کی تلقین کی۔

ان تبدیلیوں کا سب سے خوشگوار اثر صوبہ سرحد پر پڑا۔حضرت شیخ کے حکم سے جو لوگ اب تک جگہ جگہ اسلحہ جمع کر رہے تھے، سپاہی بھرتی کر رہے تھے، وہ اب خان عبدالغفار صاحب کے ارد گرد جمع ہو کر عدم تشدد کے ہتھیاروں سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہونے لگے۔ اور خان صاحب نے اپنی بے مثال حوصلہ مندی اور عزم سے ایسے جنگجو پٹھانوں کو لا کر اس محاذ پر اس طرح جمع کر دیا کہ قصہ خوانی کے بازار میں برطانوی سامراج کی گولیوں کے سامنے سرحدی پٹھانوں نے سینے تان دیے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔حتی کہ سات سو پٹھان شہید ہو گئے۔اس طرح خان صاحب نے صوبہ سرحد کی کایا پلٹ دی۔ جنگ آج بھی جاری تھی مگر اس کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔اس انداز میں ریشمی رومال تحریک کی ناکامی کے تجربہ، حضرت شیخ الہند کے مشوروں اور خان صاحب کی ذاتی عظمت کا بڑا دخل تھا۔ان تینوں باتوں نے خان صاحب کو جنگ آزادی کا سپہ سالار بنا دیا اور پھر سرحدی گاندھی کے لقب سے تاریخ عالم کا ایک اہم عنصر بن گئے۔خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

(۴)

میں ۲۱؍جنوری کو گورکھ پور سے آرہا تھا۔ بس میں ایک جوان آدمی نے ایک صاحب سے پوچھا کہ ''یہ سرحدی گاندھی کون ہے؟ کیا راجیو گاندھی کے خاندان کا کوئی شخص تھا؟ جس کی وجہ سے سارا ہندوستان ماتم میں بند کر دیا گیا ہے۔'' اس نے کہا ''نہیں، وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے پٹھان تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی جی کے ساتھ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ وغیرہ''

مجھے اس گفتگو سے بڑا صدمہ ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ ہندوستان کی بدقسمتی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو بھلاتا چلا جا رہا ہے۔ جو لوگ اہنسا کے بنیادی پتھر تھے جن پر جنگ آزادی کی پوری عمارت کھڑی ہے، آج آزاد ہندوستان کے ان معماروں سے آزاد ہندوستان ناواقف ہوتا جا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ جنگ آزادی کی تصویر نہرو خاندان نے ایسی بنائی ہے جس میں خود گاندھی جی کی تصویر نہرو کے بعد آتی ہے۔ نہرو کی پالیسیاں، نہرو کے فیصلے، نہرو کی حکومت نے وہ ماحول پیدا کر دیا کہ لوگ بھول گئے ان لوگوں کو جنھوں نے نہرو کو نہرو بنایا تھا۔ چنانچہ آج کی کونسل، آج کی حکومت، آج کا حکمراں طبقہ عبدالغفار خاں، ان کی شخصیت، ان کی عظمت اور ان کے اصولوں سے واقف ہی نہیں۔ اس پر چلنے اور اسے اپنانے کی تو کوئی بات ہی نہیں کی جا سکتی۔

(۵)

عبدالغفار خان کا سب سے بڑا، سب سے اہم اور سب سے نادر کارنامہ یہ ہے کہ وہ سپاہی بن کر اٹھے، سپاہی کی طرح زندہ رہے، سپاہی کی طرح اس دنیا سے سدھار گئے۔ مگر ان کی نگاہوں کے سامنے ہندوستان کی ساری حکومتیں، پاکستان کے سارے حکمراں شرمندہ اور جوابدہ رہے۔ کیوں کہ انھوں نے امن، انسانیت، آزادی اور خودداری کا جو پیغام دیا تھا، اس پیغام کو بر صغیر کی تمام حکومتوں نے نہ صرف بھلا دیا بلکہ پامال کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ نکلا کہ انگریز نے بھی انھیں جیل کی ہوا کھلائی، پاکستان میں بھی وہ آہنی سلاخوں میں بند رہے اور ہندوستان بھی آئے تو احمد آباد وغیرہ کے فسادات پر کھری کھری سنا کر اجنبی کی طرح واپس گئے۔ اگر ان کے سائز کا آدمی

نہ ہوتا تو اس وقت کی شرمندہ حکومت نے ان کو بھی جیل کی کوٹھری میں بند کر دیا ہوتا۔ مگر اس مردِ مجاہد کی شخصیت کسی پارٹی حتیٰ کہ کسی اقتدار کی کبھی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ہمیشہ سچ کہا، انصاف کا مطالبہ کیا اور امن کی بات کی اور اس راہ میں ۲۰/جنوری ۱۹۸۸ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خدا انھیں جنت الفردوس تک پہنچا دے۔

خدا کرے برصغیر میں پھر کوئی عبدالغفار خان پیدا ہو، پھر کوئی سپاہی جنم لے، پھر کوئی غیور دماغ پرورش پائے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: 'ریاض الجنۃ' گورینی۔۱۹۸۸ء

ایک روشن ستارہ
حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی

ولادت باسعادت:

آپ کی ولادت ۱۳۱۷ھ کو ضلع پرتاپ گڑھ کے ایک موضع پھولپور میں ہوئی۔

چونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے، تو ہر طرح کے ناز ونعمت میں پلنا ایک فطری بات ہے۔ چنانچہ حضرت کا بچپن بھی اسی ماحول میں گزرا، ابھی ناز ونعمت کا یہ دور چل ہی رہا تھا اور عمر ابھی پندرہ برس ہی ہوئی تھی کہ پے در پے مصائب کا سامنا ہوا، جب والدین کے سایہ سے دو چار روز کے فرق سے محرومی ہوگئی۔ والدین کے انتقال کے بعد نانیہال کے لوگوں نے پرورش کی۔

تعلیم:

ابتدائی تعلیم تو وطن ہی میں حاصل کی، درسیات کی تکمیل اپنے شیخ سید بدر علی شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ سے کی۔ اپنے اساتذہ کا غایت درجہ ادب واحترام فرماتے، اوران کا ذکر انتہائی عظمت سے فرماتے، خواہ وہ استاد ابتدائی درجہ کے ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے وہ ہمیشہ سب کے محبوب نظر رہے۔

بچپن:

ابتدائی زمانہ عموماً کھیل کود کا ہوا کرتا ہے اور بچوں کا رجحان لہولعب کی طرف ہوتا ہے، لیکن جب عشق کی آگ دل میں لگ گئی تو لہولعب میں بھلا دل کیوں کر لگے؟ چنانچہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کو جمع کر کے وعظ وتذکیر شروع فرما دیتے۔ یہی دل کی لگی تھی کہ آگے چل کر وہ ایک روشن ستارہ بنے۔

بیعت وخلافت:

حضرت کا اکابرین سے غایت درجہ کا تعلق تھا۔ چنانچہ سب ہی حضرات کی مجلس میں

تشریف لے جاتے تھے، اور فیض حاصل کرتے۔ اپنا واقعہ اپنی زبانی سناتے ہیں کہ حضرت اقدس تھانوی کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی، حضرت نے خاص معاملہ فرمایا۔ اسی طرح چکر لگاتے لگاتے بالآخر پیاسا حوض کے پاس پہنچ ہی گیا۔ لکھنو کے محلّہ ڈالی گنج میں ٹیلے والی مسجد میں ایک بزرگ مولانا شاہ وارث حسین صاحب نوراللہ مرقدہ سے ملاقات ہوگئی تو چار سال کا مختصر عرصہ حضرت کی خدمت میں گزارا۔ آثار اصلاح تو بچپن ہی سے ظاہر تھیں، اجازت بیعت میں پھر کیا دیر لگنی تھی، مجاز ہوکر انھیں کے ایما پر ایک اور بزرگ کی طرف رخ کیا۔ دل میں ابھی بہت سے سمندر کی گنجائش باقی تھی، ضلع رائے بریلی میں سدھونہ نامی موضع میں ایک اور ہستی مرجع خلائق بنی ہوئی تھی، جنھیں حضرت مولانا سید بدرعلی شاہ صاحب کے نام سے جانا جاتا تھا، اور جو حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے خلیفۂ اجل تھے جو فنا و ہستی میں اپنے شیخ ہی کے مثل تھے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب یہاں آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے، اور اپنے شیخ ہی کی نظیر بن بیٹھے، جہاں ظاہری علوم کی تکمیل فرمائی وہیں باطنی علوم میں بھی اوج کمال تک پہنچ گئے۔ اور ایک اور شیخ کامل سے سند تکمیل حاصل کی تو چشتیت ونقشبندیت دونوں کا حسین سنگم بن گئے۔

ریاضت ومجاہدہ کی حیرت انگیز مثالیں آپ نے قائم کیں۔ سخت ٹھنڈی کے موسم میں بھی غسل کی حاجت ہوتی تو رات ہی میں اٹھ کر غسل فرمالیتے، اور پہنے ہوئے کپڑے کو دھل کر ویسے ہی گیلا پہن لیتے۔ اس لیے کہ بدن ڈھانپنے کے لیے کوئی دوسرا کپڑا ہی نہ تھا۔

حضرت عین شباب کے دنوں میں جو زمانہ کہ سونے کا ہوتا ہے، بسا اوقات ستر ہزار بار اسم باری تعالیٰ کا ذکر فرماتے۔

حضرت کے شیخ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ 'نسبی بیٹے تو میرے چار ہیں لیکن روحانی بیٹا تو فقط ایک محمد احمد ہے۔' اور پھر یہاں تک فرمادیا کہ 'اگر اللہ میاں نے پوچھا کیا عمل لائے ہو؟ تو احمد میاں کو پیش کردوں گا کہ 'بارالٰہا! یہی میری زندگی کی کمائی ہے۔'

کسی شیخ کا اپنے مرید کے بارے میں اس طرح کا حسن ظن رکھنا، اس سے بڑی سند کی بھلا اب ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

آخر کار زمانے نے مشاہدہ کیا کہ ان کی ذات بابرکت سے کتنی کثیر تعداد میں لوگوں کو

فائدہ پہنچا۔ تبلیغ دین کا جذبہ تو گویا پیدائشی ودیعت تھا، انجام کار قرب وجوار واطراف میں میلہا میل تک پیدل تشریف لے جاتے اور وعظ وتذکیر فرماتے۔ انداز وہی سادا سودا جو ہمارے اسلاف کا وطیرۂ خاص ہے، اور تاثیر کا یہ عالم تھا کہ ایک مجلس میں گروہ در گروہ لوگ تائب ہوتے۔

اہلیان الہ آباد بڑے خوش نصیب ہیں کہ آدھی صدی سے زائد عرصہ تک حضرت والا سے استفادہ کرتے رہے۔

حضرت کی عظیم شخصیت کا پتہ کچھ اہل اللہ کے تاثر سے چلتا ہے۔ آپ کے پیر بھائی اور حضرت تھانوی کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری، حضرت پرتاب گڑھی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''اللہ والے سراپا درد ہوتے ہیں، ہمارے دوست مولانا محمد احمد صاحب سراپا درد ہیں، ماشاءاللہ ان کا کلام بڑا دردناک ہے۔'' نیز فرمایا کرتے تھے کہ ''ان سے مجھ کو اس قدر محبت ہے کہ میں ان کی محبت کو اپنے بہت سے پیر بھائیوں کی محبت پر ترجیح دیتا ہوں۔'' چنانچہ حضرت پھولپوری جب ہندوستان سے تشریف لے جانے لگے تو ان کے متعلقین جو حضرت کی جدائی کو سوچ کر بہت غمگین تھے ان کو تسلی دیتے ہوئے مولانا پھولپوری نے فرمایا کہ 'میں تو جا رہا ہوں مگر اپنے سے بہتر بدل تمہارے لیے چھوڑ جا رہا ہوں یعنی حضرت مولانا پرتاب گڑھی کو۔'

اسی طرح اپنے زمانے کی عظیم شخصیت جن کا لقب ہی 'مصلح الامت' تھا، یعنی حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری، الہ آبادی اپنے احباب کو تاکیداً حضرت پرتاب گڑھی کی مجلس وعظ میں بھیجا کرتے تھے۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ 'مولانا پرتاب گڑھی، صاحب نسبت بزرگ ہیں، اور مستجاب الدعوات ہیں۔' اور ان کے وعظ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ 'اللہ والوں کا وعظ ایسا ہی ہوتا ہے۔' نیز فرماتے تھے کہ 'میں نے اس زمانہ میں ایسا متواضع اور بے نفس آدمی نہیں دیکھا۔'

بہرکیف یہ عظیم اور مقتدر شخصیت بمقام الہ آباد ۲/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ۹۳/سال کی عمر میں اس دار فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور حضرت کی زندگی سے کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمائے اور سنت کے کامل اتباع کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

❑❑❑ ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۲۰۰۰ء

محدث عصر علامہ اعظمی
شخصیت اور اس کے عوامل

مولانا اعظمی علمی دنیا کی ان چند ہستیوں میں تھے کہ چودہویں صدی کے شروع میں آئے تو کسی نے دیکھا تو کسی نے نہیں، اور پندرہویں صدی کے آغاز میں جانے لگے تو سارا عالم اسلام دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں افسانوی شہرت پائی، مگر ان کی سادگی، بے لوثی اور خلوت گزینی کی وجہ سے انھیں دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا کہ دنیا کی عظیم محدث یہی شخصیت ہے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم دہلی میں مجھ سے ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا تو میں نے اس سے پوچھا، 'وہ تو اعظم گڈھ کے ہیں، تم مکہ کے لوگ انھیں کیسے جانتے ہو؟' اس مکی عالم نے کہا کہ 'ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے باپ کو جانتے ہیں۔' پھر اس نے کہا کہ میں مئو جا کر حضرت علامہ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ضرور جاؤں گا۔

اسی طرح حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے، مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا۔ جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لیے کہا۔ حضرت مولانا تیار ہو گئے، وہاں پہنچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا۔ کیوں کہ ابن باز نابینا محدث ہیں۔ ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے۔ جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا۔ مولانا نے فرمایا ''حبیب الرحمٰن الاعظمی من الہند''، تو شیخ عرب کھڑے ہو گئے، حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آکر مجھے شرمندہ کیا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر

انھوں نے سکون پایا۔

خودسازی:

ایسی عظیم ہستی، عالمی شخصیت ہندوستان سے اٹھ گئی '' فانا للہ وانا الیہ راجعون''۔فن حدیث اورفن اسماء الرجال میں آج دنیا حضرت مولانا کا لوہا مانتی ہے اورانھوں نے امام عبدالرزاق، امام ابوبکر بن شیبہ، امام عبداللہ بن مبارک، علامہ حمیدی جیسی قدیم علمی شخصیتوں کی نایاب کتابوں کی تصحیح کرکے، اوراتنی بڑی بڑی کتابوں کوتن تنہا آڈٹ کرکے ایسا شاہکار کام انجام دیا ہے کہ دنیا صدیوں حیرت کرے گی۔اور یہ حیرت اس وجہ سے اور بڑھتی جائے گی کہ یہ کارنامہ کسی جامعہ، کسی دارالعلوم، یا کسی لائبریری میں بیٹھ کرنہیں انجام دیا ہے، بلکہ ایک غیرمعروف قصبہ میں ایک ایسے کمرے میں بیٹھ کرانجام دیا ہے جس پرآج بھی کھپریل پڑا ہوا ہے۔ جہاں سے آج بھی موٹر نہیں گزرسکتا۔مگر وہاں ہوائی جہاز سے آنے والے پہنچے اور دیکھا کہ ایک معمولی جثہ کا انسان بیٹھا ہوا ہے جس کے اردگردفن حدیث، فن رجال، فن لغت اورادب کی سینکڑوں کتابوں کا ہجوم ہے اوروہ اس میں اس قدرگم ہے کہ بڑا سے بڑا شخص بھی آجائے تواسے سراٹھانے کی مہلت نہیں ہے۔اس کی دولت اس کا قلم، اس کا آرام اس کا فن ہے۔اس کی شخصیت اس کے وہ مسودات ہیں جو بیروت، بغداد، دمشق، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پہنچ گئے تو لوگوں نے قلم چوم لیے یا دم بخود رہ گئے۔اس طرح حضرت مولانا نے ایک عظیم مقصد کو اپنا موضوع زندگی بنایا اور پھراس کے حاصل کرنے کے لیے موزوں مقام گوشۂ تنہائی کوقرار دے کراس میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے اور دورونزدیک کسی لالچ، تمنا اور جاہ طلبی کو پھٹکنے نہیں دیا۔اوریہی ان کے اخلاص، حسن نیت اور بلندئ کردار کی سب سے بڑی دلیل ہے جس سے ان کی شخصیت کے چند پتھروں کوتراش کرتاج محل کھڑا کردیا ہے۔

دنیا سے اعراض:

حضرت مولانا کا اپنے کچے مکان میں بیٹھ کرکام کرنا یقیناً ایک مجبوری تھی کہ وہاں آبائی مکان تھا، لیکن ایک دوسری مجبوری اورتھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی محل میں جانے کے لیے قطعی طور سے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ تقریباً ۳۵؍برس پہلے مدینہ یونیورسٹی میں صدر کا عہدہ خالی ہوا تو جامعہ کی کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا کہ مولانا اعظمی کو جامعہ کی صدارت کے لیے لایا جائے اورانھیں بیس ہزار

ریال مع لوازم رہائش پیش کیا جائے۔عربوں نے تجویز بڑے شوق سے پاس کی اورحضرت مولانا کی منظوری کے لیے بڑے اہتمام سے بھیجا۔مگر ان کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا نے شکریہ کے ساتھ وہ تجویز واپس کردی اور لکھ دیا کہ 'مجھے یہیں بیٹھ کر یہ خدمت انجام دینے دیجیے۔' غالبًا اس کی اطلاع ان کے گھر والوں کو بھی نہیں ہوئی مگر مولانا ابوالحسن ندوی نے انتہائی حیرت ومسرت اور سربلند کرکے یہ بات مولانا محمد منظور نعمانی کو بتائی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر اطلاع دی کہ 'ہندوستان میں ایسے ایسے علم کے خادم اور دنیا سے بےتعلق حضرات موجود ہیں، اس لیے علم کا بھرم قائم ہے۔' یہ تھی وہ مجبوری جس کی وجہ سے حضرت مولانا ساری عمر اپنے گوشۂ عافیت میں گزاردی اور بڑے بڑے آدمی کی آمد پر کبھی معذرت نہیں فرمائی۔کیوں کہ اس مردِ درویش نے ایسے اہم کام کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔قدس اللہ سرہ العزیز

علمی غیرت وحمیت:

حضرت مولانا شکل وشباہت، تن وتوش، زبان وبیان اور وضع قطع میں اپنے ماحول سے ممتاز نہیں تھے لیکن ان میں جو دینی غیرت اور اسلامی حمیت تھی، اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔اس جذبے نے ہمیشہ بڑے بڑے کارنامے انجام دلائے، اور اسی جذبے نے مولانا کی شخصیت کو ان کے ماحول سے بلند کردیا تھا۔چنانچہ رمضان ۱۴۱۲ھ میں جب حضرت مولانا کے وصال کی خبر بمبئی پہنچی تو اہل علم میں صف ماتم بچھ گئی۔دوسرے دن مولوی جنید بنارسی صاحب نے ایک تعزیتی میٹنگ بلائی، اس میں راقم الحروف بھی تھا۔وہاں ہمارے دوست گلزار اعظمی نے ایک واقعہ بتایا کہ 'حضرت مولانا ایک مرتبہ بمبئی تشریف لائے ہوئے تھے، ایک غیر مقلد صاحب ملنے آئے اور تراویح کی رکعت پر بحث شروع کردی۔مولانا نے انھیں ٹالا مگر وہ بضد ہوگئے تو ان سے چند سوالات کیے، اور وہی سوالات ان کا جواب بن گئے۔' مولانا نے دریافت فرمایا کہ 'تراویح سنت ہے یا مستحب یا بدعت؟' غیر مقلد صاحب نے کہا 'سنت ہے'۔پھر پوچھا کہ 'سنت کو قائم کرنے والا اہل سنت ہے یا اہل بدعت؟' انھوں نے کہا 'اہل سنت'۔حضرت مولانا نے فرمایا کہ 'آپ کے علامہ نے تراویح کو بدعت عمر پھر کیسے قرار دیا ہے؟' وہ غیر مقلد صاحب سکتے میں رہ گئے اور چپ

چاپ چلے گئے۔ مگر حضرت مولانا کو جلال آ گیا کہ چند حدیثوں کو یاد کر کے یہ جاہل لوگ ائمہ ہدیٰ، خلفائے راشدین کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کوئی حد ہے اس جہل و نادانی کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئے، جب قلم رکھا تو ''رکعات تراویح'' مرتب ہو چکی تھی، اور موذن ''حی علی الصلوٰۃ'' پکار رہا تھا۔ رات کی تاریکی صبح کے لیے جگہ خالی کر رہی تھی۔

اس واقعہ میں جہاں مولانا کے علم وفضل، برجستگی واستحضار کی جھلک ہے، وہیں اس جذبے کی نشان دہی ہے جس نے مولانا سے عجیب عجیب کارنامے انجام دلائے ہیں۔ اسی دل و دماغ، اسی جذبۂ غیرت اور اسی اولوالعزمی کا نام تھا ''حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ''

علمی حمیت:

ہندوستان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حدیث کو حجت ماننے سے انکار کرتی ہے، وہ کہتی ہے کہ حدیث ایک تاریخ ہے، غیر مسلسل ہے، نامعتبر ہے۔ یہ آواز جامعہ ملیہ میں بھی سنائی دی اور تمام علما نے سنی۔ کسی نے لاحول پڑھ دی، کسی نے صلواتیں سنائیں، بعض نے ملحد اور بے دین کہہ کر دامن بچا لیا۔ مگر مولانا حبیب الرحمان صاحب نے ایک رسالہ لکھ کر اس کا جواب دیا ''نصرۃ الحدیث''، اس کو پڑھیے تو آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے شیر کو کچھار میں چھیڑ دیا ہے اور وہ ایمانی غیرت اور علمی ولولہ کے ساتھ میدان میں آ گیا ہے۔ اس میں حضرت مولانا نے خالص علمی انداز سے ان سوالوں کا جواب دیا ہے، جن سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر یہ تو ایک تمہید تھی، اصل جواب اس کا اس وقت دیا جب حضرت مولانا نے ساری دنیا کے کتب خانوں سے امام عبدالرزاق کی مصنف کے قلمی نسخے جمع کیے اور ہزاروں ہزار صفحات کی اس کتاب کی تمام جلدیں جمع اور مکمل شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دی۔ مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ۔

امام عبدالرزاق امام بخاری کے استاذ نہیں استاذ الاساتذہ ہیں۔ انھوں نے چودہ جلدوں میں حدیث مرفوع کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا تھا، جو اس کا پختہ ثبوت تھا کہ امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کی تیسری صدی تک حدیثوں کا سلسلہ منقطع نہیں تھا بلکہ ہزاروں ہزار صفحات میں تحریری شکل اختیار کیے ہوئے تھا اور مسلسل تھا، اور کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب حدیث کو یاد کرنے والے، لکھنے

والے اور روایت کرنے والے اور ان پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کرنے والے نہ رہے ہوں۔ اس لیے حدیث قرآن کے بعد سب سے بڑی حجت ہے۔ پھر اسی طرح کا کام مولانا ابوالوفا حیدرآبادی نے امام ابو یوسف وغیرہ کی کتابیں وغیرہ چھاپ کر اور مصنف ابن ابی شیبہ کو شائع کر کے انجام دیا۔ اس طرح ان حضرات نے اسلم جیراجپوری جیسے منہ زور لوگوں کا منھ پھیر دیا اور امت کو حمایت حدیث کا راستہ دکھا دیا۔

جوش وجذبہ:

مہوا بسم اللہ، گونڈہ کا ایک دورافتادہ گاؤں تھا، شہری آبادی سے کوسوں دور مگر مسلمانوں کا علاقہ۔ وہاں ایک نوخیز عالم مولوی حفیظ اللہ صاحب نے ایک باغ میں جلسہ کرنا چاہا مگر وہاں کے زمیندار نے روک دیا۔ کیوں کہ جلسہ کرنے والے حنفی تھے اور باغ کا مالک غیر مقلد تھا۔ اس وقت مولوی حفیظ اللہ صاحب مظاہر علوم سہارن پور میں دورے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے جگہ بدل کر دھرم پور کے باغ میں جلسہ کیا اور اس کے لیے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی جیسی برگزیدہ ہستیوں کے یہاں سفر کر کے انھیں تیار کیا اور غیر مقلدین کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمان صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کو بلا کر لے گئے۔

جلسہ شروع ہوا تو حنفیوں کا جوش اور غیر مقلدوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ اس جلسہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو ''**فاتحہ خلف الامام**'' کا موضوع دیا گیا اور آپ نے یہ کہہ کر تقریر شروع فرمائی کہ 'غیر مقلدین کے پاس کسی اور بات کے لیے کوئی دلیل ہے کہ نہیں اسے میں کچھ نہیں کہتا، لیکن یہ بات اعلانیہ کہتا ہوں کہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ان کے پاس مکڑی کے جالے کے برابر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔' یہ تھی اس تقریر کی اٹھان، اس کے بعد حضرت مولانا حدیث پڑھ کر اس کی سند اور متن پر بحث کر کے جب تقریر شروع کی ہے تو غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے ایک حنفی عالم زبانی حدیث پڑھتا ہے اور اس پر حوالے کے ساتھ بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے تھے کہ حنفی عالم صرف ابوحنیفہ کی فقہ پڑھتے ہیں، حدیث پڑھتے ہی نہیں مگر آج دیکھا کہ ایک عالم ہے، حنفی ہے، جوان ہے اور اسے ایک موضوع پر سینکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں، جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے زبانی پڑھتا چلا جاتا ہے۔ آج ان کے علما کو بھی اندازہ ہوا کہ اس

موضوع پر ایک ہی دو روایات نہیں ہیں، بیسوں حدیثیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر کوئی مسلک طے کرنا پڑتا ہے، تاکہ کسی قول یا فعل رسول کی نافرمانی نہ ہونے پائے۔ اور سارے مجمع نے دیکھ لیا کہ امام ابوحنیفہ کے ماننے والے حدیث وفقہ کے امام ہیں، پھر بھی انھیں امام مان کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

حضرت مولانا نے پرجوش مجمع، پرسکون ماحول اور دم بخود عوام وخواص کو دیکھ کر اپنی پرجوش اور پر مغز تقریر اس وقت ختم کی جب موذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ اس عظیم الشان تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ غیر مقلدین نے حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری جیسے علامہ کو بلایا تھا مگر وہ کوئی جوابی تقریر کیے بغیر واپس چلے گئے۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس باغ میں حنفی کوئی جلسہ نہیں کرسکتے تھے، وہاں آج انوارالعلوم جیسا حنفی مدرسہ چل رہا ہے اور اسی عالم مولانا حفیظ اللہ نے قائم کیا ہے، جن کو جلسہ کرنے سے روک دیا گیا تھا، حتیٰ کہ آج مولانا کی قبر بھی اسی مدرسہ میں ہے۔ اس طرح اب وہ ہمیشہ کے لیے وہاں فروکش ہو گئے ہیں۔

حضرت مولانا کی عظمت کا شامیانہ جن ستونوں پر کھڑا ہے، ان میں قوت حافظہ، غیور طبیعت، علمی مزاج، بے پناہ سنجیدگی اور ناقابل عبور استغنا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان متضاد قسم کے عناصر کو قدرت جب کبھی جمع کر کے کوئی مجسمہ تیار کرتی ہے تو ایسا ہی عجوبۂ روزگار شخص پیدا ہوتا ہے مگر وہ کہاں بنائے گی؟ کب بنائے گی؟ قدرت کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ ''**وهو اعلم بكم اذ انتم اجنة في بطون امهاتكم.**''

مولانا کے استغنا کا ایک عجیب واقعہ دس برس پہلے کا ہے۔ مدینہ منورہ کے بلدیہ کے چیئر مین حبیب صاحب جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ہیں، انھوں نے مولانا سے پیش کش فرمائی کہ آپ مدینہ منورہ آجائیں اور جو کام مئو میں کرتے ہیں، یہیں انجام دیں۔ آپ کی آسائش و آرام کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا، مگر اس مرد دانا نے شکریہ کے ساتھ یہ پیش کش بھی ٹھکرادی، اور مئو میں بیٹھ کر کام کرتا چلا گیا۔ اس میں استغنا کی بھی مثال ہے اور اس فیصلے کی پختگی کی بھی کہ حدیث کا کام سادگی، بے غرضی اور خاموشی سے کرنا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

قوت حافظہ:

حضرت مولانا کوقدرت کے دست فیاض نے حافظہ غضب کا دیا تھا اوراسی قوت سے انھوں نے اپنے اندرفقہ، ادب عربی اور حدیث کے خزانے جمع کر لیے تھے۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں جب دارالعلوم مئو سے دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لیے گئے تو شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کو امتحان داخلہ میں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کیوں کہ مقامات حریری کے مقامات انھیں ازبر یاد تھے اور برجستہ پڑھتے تھے۔ اور جن لوگوں نے مفتاح العلوم مئو کی مدرسی کا دور دیکھا ہے، مثلاً مولانا صفی اللہ صاحب دیوریاوی جیسے حضرات، وہ کہتے تھے کہ 'کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے بھائی، مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقی مفتاح العلوم آجاتے تو مولانا اور فاروقی صاحب اگر عشا بعد بیت بازی شروع کر دیتے تو عربی فارسی شعروں میں سخت مقابلہ ہوتا، اور صبح کی اذان تک کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا' کیوں کہ قوت حافظہ دونوں حضرات کی عجیب و غریب تھی۔ جو طلبہ حضرت مولانا سے قریب تھے ان کے لیے سنہرا موقع ہوتا تھا، اور اس کی گونج ہم لوگوں کو دارالعلوم مئو میں سنائی دیتی تھی۔ مولانا کی قوت حافظہ کی حکایتیں ایسی ایسی ہیں کہ آج سن کر حیرت ہو جاتی ہے اور وہی ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر ہے۔

علمی ذہن:

قدرت نے ان کو جو ذہن عطا فرمایا تھا، وہ خالص علمی اور معروضی قسم کا تھا، نہ شاعرانہ تھا، نہ خطیبانہ۔ وہ اپنی بات کے اظہار پر مختصر سے مختصر لفظوں میں ایسی قدرت رکھتے تھے کہ علمائے مقتدر سر دھنتے تھے۔ فاضل بات ضرورت سے زیادہ گفتگو یا تقریر و تحریر کے قائل ہی نہیں تھے۔ مثلاً شاہ بانو کا مقدمہ سپریم کورٹ نے خراب کر کے متعہ کی بحث میں الجھا دیا تھا، اس پر علمائے مقتدر نے سخت احتجاج کیا، مسلم پرسنل لا بورڈ نے تحریک چلائی اور جمعیۃ علما نے ایک آل انڈیا اجتماع کر کے معاملہ کو مسلم پرسنل لا بورڈ کے حوالہ کر دیا۔ اور اجتماع میں ہر طبقے اور ہر سائز کے علمائے مقتدر، اکابر داعیان نے حصہ لیا تھا۔ میں بھی میڈیکل علی گڑھ سے تین روز کی چھٹی لے کر شریک ہوا تھا اور اصل تجویز کی ترتیب وتسوید میں کافی حصہ لیا تھا۔ اتفاق سے اس کانفرنس میں حضرت مولانا بھی تشریف لے آئے تھے۔ ہم لوگوں نے تجویز مرتب کر کے حضرت مولانا کی تصویب کے

لیے تبرکاً پیش کر دیا تو آپ نے اسے پڑھا اور کچھ نہیں فرمایا۔ پھر قلم اٹھایا اور برجستہ صرف آٹھ اور نو سطروں میں پوری بات لکھ کر ہمارے حوالہ کر دی جو مطبوعہ کاروائی میں آج بھی موجود ہے۔ اس تجویز کا لب ولہجہ میرے لیے عجیب وغریب تھا، اس میں نہ کوئی بحث تھی، نہ معذرت، نہ تسلی وطنز، بلکہ ایک عالمانہ اظہار رائے تھا اور پوری خود اعتمادی اور پوری خودداری کے ساتھ تھا۔ چنانچہ پہلا ہی جملہ مخاطب کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ ''ہم پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں'' اس سے معلوم ہوا کہ اصل ذمہ دار کون ہے؟ اس اعلانیہ کے لیے حضرت مولانا کے علمی دماغ نے ان لائنوں سے الگ ایک راہ نکالی، جس کو ہندوستان کے دوسرے علمائے مقتدر تجویز کر رہے تھے۔ مولانا نے بحث کا بنیادی لفظ ''متاع کا استعمال'' قرار دیا تھا اور اس پر ایک مستحکم رائے کا اظہار فرما کر بحث ختم کر دی تھی جو ایک عالمانہ مجمع کا کام تھا۔ اس طرح جو طویل مباحثہ چل رہا تھا، اس پر تنقید بھی ہوگئی اور ایک مثبت طریقۂ کار نے بحث کو سپریم کورٹ یا پارلیمینٹ سے اٹھا کر علما کی بارگاہ میں بھی پہنچا دیا، جو اس مسئلہ کا آخری حل تھا۔ اس کا نام ہے ذہانت، علمیت اور برجستگی، جو صرف خدا کا عطیہ ہے، کسبی نہیں ہے۔

معتبر تفقہ وتدبر:

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی سے پہلے ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علما کا سہارن پور میں اجلاس ہوا۔ مئی جون کا سخت زمانہ تھا۔ اجلاس کا موضوع تھا ''امارت شرعیہ'' اور مقصد تھا جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے امیر الہند کا انتخاب واعلان۔ اس اجلاس کے لیے جو ایجنڈا تھا، اس کو ان داعیان اجلاس نے مظاہر علوم سہارن پور اور مولویان تھانہ بھون کو بھی بھیج دیا تھا۔ مولانا محمد شفیع صاحب اس وقت دار العلوم کے مفتی اعظم تھے اور حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم اور دونوں تھانہ بھون کے بہترین ترجمان تھے۔ جب ایجنڈا مظاہر علوم پہنچا تو حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا کہ 'ہم مظاہر علوم کے ذمہ داروں نے اس پر بحث کی اور آخر ایک تحریر لکھ کر ہم نے ایک وفد کی شکل میں جا کر جمعیۃ علما کے ذمہ داروں کو خود دی' مجلس عاملہ میں جو تجویز زیر بحث تھی، اس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کا امیر الہند منتخب کر کے اس کا اعلان کر دیا جائے، اب اس کا وقت آ گیا ہے۔ اور مظاہر علوم کی تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ 'امیر الہند کا انتخاب موجودہ غلامی کے

ماحول میں جائز نہیں، جب کہ ہم کسی معنی میں بااقتدار نہیں ہیں۔ امارت کے لیے اقتدار شرط اول ہے۔' پھر اس پر قرآن وحدیث اور احکام السلطانیہ جیسی اہم کتابوں کے حوالے تھے۔ اس پر اکابر علمائے ہند کے دستخط تھے جو تھانہ بھون اور مظاہر علوم سے متعلق تھے۔ پوری تفصیل ''مضامین شیخ الحدیث'' میں چھپ چکی ہے۔

تحریر اجلاس میں پیش ہوئی، پڑھی گئی اور ذمہ داروں کی موجودگی میں ان ذمہ داروں نے پڑھ کر سنائی۔ اس پر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان صاحب نے برافروختہ ہو کر فرمایا کہ 'اب تک یہ حضرات کہاں تھے؟ جب ہم بحث کرتے کرتے آخری منزل پر ہیں تو ان حضرات نے الگ سے ایک رائے کا اظہار فرمادیا۔' شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسا بزرگ، مجاہد عالم اور فیصلہ کن شخص مجلس عاملہ کی صدارت کر رہا تھا۔ یہ مجلس اکابر کا نازک مرحلہ تھا، دونوں کے دلائل سن کر فیصلہ فرمایا کہ علمائے سہارن پور نے ایک عالمانہ اختلاف رائے کیا ہے اور آپ اس وقت اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے اجلاس ملتوی کیجیے اور اس بحث کو کسی نتیجہ تک پہنچانے کے لیے ایک کمیٹی بنا دیجیے، جس میں آپ کے منتخب افراد ہوں جو ان حضرات سے بحث کر کے کوئی آخری شرعی حل تجویز کریں۔ اس مجاہدانہ فیصلے پر اجلاس عام کو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان نے آخر ملتوی کر دیا اور جن تین حضرات کی کمیٹی بنائی گئی اور متفقہ طور پر اعلان کیا گیا، ان کے نام تھے مولانا عبدالحکیم صدیقی لکھنوی، حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری اور مولانا حبیب الرحمان الاعظمی۔ جب کہ حضرت مولانا الاعظمی اس اجلاس میں شریک بھی نہیں ہو سکے تھے، مگر ایسے سنگین مسئلہ میں فقہی نقطۂ نظر کو علمی انداز سے حل کرنے کے لیے حضرت مولانا کی تلاش لازم تھی۔ اس لیے تلاش کر کے آپ کا نام شامل کیا گیا، کیوں کہ حضرت مولانا کی علمیت، ذہانت اور تفقہ پر پوری جماعت کو اعتماد تھا۔ یہ تھا علمائے ہند میں حضرت مولانا کا علمی مقام۔

مجتہدانہ نقطۂ نظر:

راقم الحروف ریاض العلوم گورینی جون پور میں درس حدیث دے رہا تھا اور احباب کے اصرار پر وہاں کے چند احباب کے ساتھ ''الریاض'' رسالہ بھی نکالتا تھا۔ اس میں افتتاحیہ اور درس حدیث کا عنوان میرے ذمہ تھا، نیز دوسرے موضوعات پر بھی حسب عادت لکھا کرتا تھا۔ یہ رسالہ

حسب معمول حضرت مولانا کی خدمت میں لازمی طور سے جاتا تھا مگر اس کا وہم بھی نہیں تھا کہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں میں اس پر نظر ڈالتے ہوں گے الاّ ایں کہ کبھی نظر سے گزر جائے۔

۱۹۸۶ء میں ایک صاحب نے آ کر پیام دیا کہ حضرت مولانا نے تم کو مئو بلایا ہے۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر حاضر ہوا، ویسے چار چھ مہینے میں ضرور حاضری دیتا تھا۔ اس مرتبہ طلبی پر حاضر ہوا تو فرمایا کہ تمہارا ''الریاض'' دیکھا کرتا ہوں، اس میں تم نے امارت اور قضا وغیرہ کی اچھی بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک مضمون لکھا ہے، اسے دیکھ لو، شام کو بات ہوگی، حوالے کی دو کتابیں یہ ہیں۔ پھر گفتگو ہوئی تو قاضی کی شرعی حیثیت پر کلام فرمایا تھا اور علامہ ماوردی کی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ قضا ایک شرعی عہدہ ہے جسے کوئی صاحب اقتدار کسی اہل کو سپرد کرتا ہے۔ میں نے حوالہ دیکھ کر کتابیں واپس کر دیں اور مضمون لا کر 'الریاض' میں شائع کر دیا۔ (دیکھئے الریاض ۱۹۸۶ء)

الریاض میں بحث اس کی چل رہی تھی کہ جمعیۃ علمائے ہند نے امارت شرعیہ کا جو اعلان کیا ہے اور اس کی بیعت کا جو وجوب ثابت کر کے اس پر علمائے دیوبند وغیرہ سے تصدیق کرا کے ایک استفتا بھیجا ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ تو ہندوستان کے تمام علما نے وجوب اطاعت کی توثیق فرما دی لیکن مفتی ریاض العلوم مولانا محمد حنیف مولانا عبدالحلیم اور ذمہ داران ریاض العلوم گورینی نے ''حیلہ ناجزہ'' کے موقف سے تجاوز کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس لیے ان کو امارت کے وجوب اور وجوب بیعت دونوں سے اختلاف تھا، اور وجہ وہی تھی کہ بلا اقتدار اعلیٰ کے امارت کا وجود نہیں ہوسکتا۔ الریاض نے اس پر کافی بحث کی تھی، اس کے ساتھ شرعی پنچایت اور قاضی کے موضوع پر حیلہ ناجزہ کے موقف کی پوری وضاحت کی تھی۔ کیوں کہ امارت شرعیہ بہار نے حیلہ ناجزہ ہی سے شرعی پنچایت کو باطل قرار دیا تھا۔

قضا کی اس بحث کو مولانا نے پسند فرمایا تھا، اس لیے نیا استدلالی مضمون لکھ کر تائید فرمائی تھی کہ اسے جمعیۃ علما کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کرا دو، تا کہ پورے ملک میں صحیح بات پہنچ جائے۔ حضرت مولانا نے اس مضمون کو کسی سے خوشخط نقل کرایا تھا، اس پر ان کا نام نہیں تھا مگر اس کی اکثر عربی عبارتوں کا ترجمہ میں نے کیا تھا، اس لیے بحیثیت مترجم اپنا نام شائع کر دیا ہے۔

حرف آخر:

حضرت مولانا کی ایک عجیب بات یہ تھی کہ مئو سے چل کر الہ آباد جاتے تو وہاں کئی کئی دن قیام فرماتے، اور قیام ایک ایسی ہستی کے پاس ہوتا تھا جو فقہ، حدیث یا ادب عربی میں کسی فن میں ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی تھی، مگر اس ہستی میں معلوم نہیں وہ کون سا جادو تھا کہ مولانا حبیب الرحمان ایسا شیخ الحدیث والفقہ ان کی خدمت میں سعادت مند مریدوں کی طرح خاموش باادب اور سنجیدہ رہتا تھا۔ وہ ہستی تھی حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کی۔ رحمۃ اللہ علیہ

مولانا پرتاپ گڑھی میں جو کمال تھا، وہ ان کی روحانیت تھی۔ اتنی بلند، ایسی طاقت ور اور اس قدر عظیم درجات کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی، قاری محمد صدیق صاحب اور مولانا ابرارالحق صاحب جیسے اکابر ان کے یہاں ضرور تشریف لاتے اور اپنی مشیخت کو بالائے طاق رکھ کر آتے۔ ہردوئی کے مولانا ابرارالحق صاحب کو دیکھا ہے کہ وہاں بھی معمول کے مطابق مجلس کو گرم رکھتے تھے مگر حضرت مولانا بالکل خاموش رہتے تھے، نہ کبھی حدیث بیان کرتے، نہ فقہ پڑھاتے، نہ مذاکرہ کرتے، بلکہ مجلس میں رہتے اور کئی کئی دن خاموش رہتے۔ ایک صاحب نے مجھ سے نقل کیا کہ 'حضرت مولانا سے مولانا محمد احمد صاحب کی ایک مجلس میں عرض کیا گیا کہ کچھ فرمایئے تو عجیب وغریب جواب دیا۔ فرمایا کہ 'میں یہاں کان لے کر آتا ہوں، زبان لے کر نہیں' مگر یہ تو مجلس کا جواب تھا۔ دراصل مولانا وہاں دل لے کر جاتے تھے، دماغ لے کر نہیں۔ اس لیے ان کا دل مولانا محمد احمد صاحب کی روحانیت اور ان کی عظمت سے خوب خوب سرشار اور ان کے فیض سے سیراب ہوتا تھا۔

حضرت مولانا کی یہی روحانی پیاس تھی جو انھیں باری باری فتح پور تال نرجا لے جاتی تھی اور وہاں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری کی خدمت میں رہ کر فیض اٹھاتے تھے، روحانی فیض۔ مگر یہ سارا کام اتنی خاموشی سے کرتے تھے کہ ہم جیسے لوگ اس کی بھنک بھی نہیں پاتے تھے۔ البتہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اکابر اہل ذکر کے پاس پوری بشاشت اور سکون سے خاموش رہا کرتے تھے، جو ذکر اللہ کی لذت کا بلند مقام ہے۔

روحانیت کا مسئلہ انتہائی نازک ہے، پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی سعادت

مندی تھی، جو ان کو ابتدا میں حضرت تھانوی کی خدمت میں لے گئی تھی اور ان سے فیض صحبت اٹھانے کے بعد ان کے ارشد تلامذہ میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی خدمت میں برابر تشریف لاتے رہے۔ پھر ان کے بعد مولانا محمد احمد صاحب کے پاس آ کر اپنی روحانی پیاس بجھاتے رہے۔ ظاہر ہے کہ جو روحانیت تھانہ بھون سے الٰہ آباد تک انھیں لیے پھرتی تھی، وہ کوئی عظیم روحانیت ہوگی۔ اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ علم ظاہر چاہے کتنا ہی عظیم ہو جائے، علم باطن اور روحانیت کے بغیر وہ نامکمل ہے۔ اس لیے ایک محدث عصر کو ایک روحانی پیشوا کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض صحبت اٹھانا پڑا۔ ایسے میں ہم جیسے پڑھے لکھے جاہلوں کو اپنی روحانیت بڑھانے کے لیے دو چار قدم ضرور چلنا چاہیے اور علم ظاہر کے حجاب سے باہر آنا چاہیے۔

حضرت مولانا کی یہی روحانیت تھی جس نے ان کو سادہ مزاج بنا دیا تھا۔ وہ تصنع و تکلف اور شان و شوکت سے کوسوں دور رہتے تھے۔ کپڑوں کی سجاوٹ، مکان کی رونق یا رہن سہن کے ٹھاٹ باٹ کو ان کی روحانیت ایک بار محسوس کرتی تھی۔ اس لیے انتہائی نازک مزاجی، نفاست پسندی کے باوجود انتہائی سادہ اور ''**البذاذة من الایمان**'' کی تصویر بن کر زندگی گزارتے تھے۔ قدس اللہ سرہ العزیز

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان الاسلام' بنارس۔ محدث اعظمی نمبر۔ ۱۹۹۲ء

مولانا محمد مسلم اعظمی

ایک صاحب نے کہنا شروع کیا کہ مولانا محمد مسلم صاحب کا...... تو میں نے ٹوک دیا، آپ انھیں پہچانتے بھی ہیں؟ جی ہاں بمہور کے مولانا صاحب۔ان کے مدرسہ ہی کے ایک طالب علم نے یہ اطلاع دی ہے،تب یقین آیا کہ ایک جواں سال،تندرست اور چلتے پھرتے انسان کو بھی فرشتہ اجل کبھی اس طرح اٹھالے جاتا ہے۔فانا للہ وانا الیہ راجعون

لیکن خدا نے ان کو جتنی عمر دی تھی،اس کا لمحہ لمحہ جس تندہی سے وہ خدمت دین پر نچھاور کرتے ہوئے گزرے ہیں،اس میں انھیں مہلت نہیں ملی کہ لیٹ بیٹھ کر موت کا انتظار کرتے۔اس لیے گزرتے ہوئے سیدھے جوار رحمت میں پہنچ گئے اور ایک دنیا کو سناٹے میں چھوڑ گئے۔

وفی سبیل اللہ مالقیتَ

مجھے پہلی ملاقات یاد نہیں لیکن آخری ملاقات گورکھ پور میں ہوئی تھی۔وہ جمعیۃ علما کے پروگرام پر مولانا محمد عارف صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم مئو کے ساتھ اصلاح معاشرہ کے لیے چند ہفتے ہوئے سفر کرتے ہوئے حکیم وصی احمد صاحب کے یہاں تشریف لائے۔ڈاکٹر شعبان صاحب کے فون پر حکیم صاحب کے یہاں اچانک مل گئے،کہنے لگے تم موجود ہو تو میں ابھی آرہا ہوں۔پھر حکیم صاحب انھیں روکتے رہے کہ ایک بج رہا ہے،کھانا کھا کر جایے،مگر رکے نہیں۔ان کا تعلق خاطر انھیں دارالعلوم رسول پور کھینچ ہی لایا۔ان کا یہ سفر جماعتی سفر تھا اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جمعیۃ علمائے ہند سے اس کی پالیسیوں کے بنا پر اختلاف رائے کی وجہ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں بلکہ دوسری جماعت کا رکن ہوں۔پھر بھی ان کے تعلق خاطر،ان کی محبت اور ان کے خلوص میں کوئی فرق نہیں آیا۔اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ دوست کی طرح آئے اور بھائی کی طرح لپٹ گئے۔ان کے دل

پر اس کا خطرہ بھی نہیں گزرا کہ اگر دہلی خبر گئی تو کیا عتاب نازل ہو۔ وہ اس خطرے سے بہت بالاتر تھے۔ ایسا مخلص انسان دنیا سے اچانک اٹھ گیا، اور دیکھنے کو نہیں ملے گا، اس کا مدتوں صدمہ رہے گا۔

مولانا کا بشاش چہرہ، دلچسپ گفتگو، محبت بھرا انداز، بے تکلف نشست و برخواست، ہمہ تن خدمت اور بے غرض تعلق ایسا نہیں تھا کہ خبر سن کر آدمی ٹال جائے۔ اس لیے مجھے گورکھ پور سے رگھولی اور گھر سے بمہور لے گیا، جب کہ تیسرے دن بمبئی کے لیے میرا ٹکٹ تھا۔ مگر گیا تو بمہور سونا سونا دکھائی دیا، ان کا گھر، ان کا کمرہ، ان کا مدرسہ، ان کا خاندان اور ان کی سڑکیں اداس اداس نظر آئیں۔ نگاہیں ڈھونڈھتی رہ گئیں، وہ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ جب شہرخموشاں حاضر ہوا تو وہاں مٹیالے لحاف میں سبھی سو رہے تھے، مولانا محمد مسلم بھی محوخواب تھے، حتیٰ کہ میں نے سلام کیا، مگر جواب نہیں سن سکا کہ تسکین ہو جاتی۔ سورہ یٰسین پڑھی تو یقین تھا کہ آئیں گے مگر دکھائی نہیں دیے۔ وہ ضرور آئے ہوں گے مگر میری دل کی آنکھیں روشن نہیں تھیں، اس لیے افسوس کہ میں ان پر نگاہ نہ ڈال سکا۔ یہ آدمی کی کیسی مجبوری ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہیں مگر ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے، نہ سن سکے اور دوسرا ہر حرکت وعمل دیکھتا چلا گیا ہو۔

گورکھ پور سے گھر واپس گئے تو وعدہ لے کر گئے تھے کہ میں ضرور بمہور جاؤں گا، اور میں گیا بھی وہاں، مگر اس وقت جب خود بمہور ان کی تلاش میں سرگرداں تھا بلکہ رو رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو کیا معلوم تھا کہ گورکھپور کی ملاقات آخری ملاقات ہے۔ آدمی اپنے مستقبل سے کس قدر ناواقف، جاہل اور لاپرواہ ہے۔ استغفر اللہ

مولانا محمد مسلم اس وقت ابھرے جب وہ دارالعلوم میں مولانا صفات اللہ صاحب کے ہمراہ درس اور انتظام دونوں میں دخیل تھے، اور خوب کام کرتے تھے، لیکن ان کی پوری شخصیت اس وقت نمایاں ہوئی جب وہ جون پور پہنچ کر بڑی مسجد میں رہنے لگے، اور اس کے مکتب کو انھوں نے مدرسہ بنا دیا۔ اور نہ صرف شہر جون پور بلکہ ضلع کو اور پڑوس کے اضلاع کو مدرسہ کی طرف متوجہ کرایا، اور مدرسہ صرف طلبہ، اساتذہ اور کارکن ہی نہیں، بلکہ اہل علم وفضل اور اکابر دین کا گہوارہ بن گیا تو سوال پیدا ہوا کہ ایک نیا آدمی آ کر سب سے نمایاں کیوں ہو گیا؟ ہر نگاہ اس کو کیوں تلاش کرتی ہے؟ کسی کی جمجانی میں مداخلت تو بہر حال کھل جاتی ہے، لیکن اس جاہلانہ سوال کا مولانا محمد مسلم کے

پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے خاموشی سے سنتے رہے مگر یہ سوال جب کھل کر سامنے آگیا تو جواب دینے کی دو شکلیں تھیں۔

پہلی شکل یہ کہ مدرسہ کو اکھاڑا بنا دیا جائے، پھر اقتدار کی کبڈی کھیلی جائے یا اسے تقسیم کر دیا جائے۔

دوسرا راستہ یہ کہ اہل شوق اور کار کن حضرات کو سپرد کر کے اپنے کو علاحدہ کرلیا جائے، تا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے برباد نہ ہو۔

پہلا راستہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کا، اوران کے ذمہ داروں کا ہے مگر بہت خطرناک ہے، دنیا سے آخرت تک خطرات ہی خطرات ہیں۔ معاذ اللہ

دوسرا راستہ حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی کا ہے کہ مفتاح العلوم کو اپنے دونوں دوستوں اور رفیقوں کے سپرد کر کے گھر بیٹھ گئے اور بالکل یکسو ہو گئے۔ یہ مخلصانہ یکسوئی اسی کا نام ہے کہ ساری حکایت وشکایت چھوڑ کر چلے گئے۔

سمت سفر:

پہلا راستہ بہت آسان ہے اور خود دارالعلوم مئو میں وہ اس کو آزما کر آئے تھے جس کا مقدمہ لکھنؤ تک گیا تھا۔

دوسرا راستہ بہت مشکل ہے جس کا تجربہ محدث اعظمی نے مفتاح العلوم میں کیا ہے۔ مگر اس راستہ سے کم لوگ گزرتے ہیں بلکہ گزر سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے لیے بڑا اخلوص، بڑا حوصلہ اور بڑی قوت برداشت چاہیے، جو سب کو میسر نہیں۔

خلوص کی تعریف امام غزالی نے بہت البیلی کی ہے، فرماتے ہیں کہ ''جس کام کو کر رہے ہو اگر اسی کو دوسرا کرنے لگے اور تم کو برا نہ لگے، تب تم اپنے کام میں مخلص ہو۔'' (کیمیائے سعادت) واللہ کیا تعارف ہے خلوص کا۔

جب مولانا محمد مسلم نے یہی مشکل راستہ اختیار کیا تو مدرسہ حوالہ کر کے بالکل یکسو ہو گئے، شکایتوں کے سارے رجسٹر، بنڈل اور منصوبے دفن کر کے آگے بڑھ گئے۔

پسپائی:

یہ راستہ پسپائی کا راستہ ہے مگر اس میں اپنی دیانت، امانت، ذہانت اور اعتدال پسندی سب محفوظ رہ جاتی ہے، جب کہ دوسرے راستے میں سب داؤں پر لگ جاتی ہے اور ہم خالی ہو جاتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جس ادارہ کو ہم نے خون پسینہ ایک کر کے چلایا ہو، اس کی ایک ایک اینٹ چن کر اس کی عمارت کھڑی کی ہو، اسے کس دل سے ایسے لوگوں کے سپرد کر دیں جو صرف اقتدار کے بھوکے ہوں! یہ صحیح ہے، لیکن ان کے دلوں کو داد دیجیے کہ جنھوں نے ایسا کر کے دکھایا ہے! چنانچہ مفتاح العلوم کو ہندوستان کے مدارس میں صف اول کا مدرسہ بنانے والے مولانا حبیب الرحمان صاحب نے جب اس ادراہ کو مولانا ایوب صاحب وغیرہ کو سپرد کیا ہے تو اسی نہ سمجھ میں آنے والی بات کو انھوں نے اپنی حوصلہ مندی سے قابل عمل بنا دیا تھا، تاکہ مدرسہ قائم رہے، برباد نہ ہو اور میری صلاحیتیں بھی برباد نہ ہوں۔ یہ ایک طرح کی پسپائی ہے مگر ہزار اقدام سے بڑھ کر ہے۔ اس کی تصدیق اس حدیث سے ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ایک صاحب کی نزاع حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئی تو حضرت ابوبکر نے سب کے سامنے حضور ﷺ سے عرض کیا 'حضور! مجھ سے خطا ہو گئی، مجھ سے خطا ہو گئی' اور حضور ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹا کہ ابوبکر کو جو صدمہ پہنچائے گا، مجھے صدمہ پہنچائے گا۔ واہ رے پسپائی۔

محدث اعظمی:

مجھے یاد ہے جب گونڈہ میں فرقانیہ کا مہتمم تھا تو وہاں سے ۱۷ ر برس بعد جب سابق مہتمم رحمۃ اللہ علیہ کے بچے جوان ہو گئے تو انھوں نے خاندانی وراثت کا مسئلہ اٹھایا، اور ایک اعظمی شخص کو جو ان کا استاد بھی تھا، غیر ملکی کہنے لگے۔ معاملہ طول کھینچا تو مولانا اسعد صاحب کو ثالث مان لیا گیا، پھر بھی کشاکشی ختم نہیں ہوئی تو دہلی میں مجلس عاملہ کے موقع پر میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب سے مشورہ کیا۔ کیوں کہ فرقانیہ کی لڑائی طشت از بام ہو چکی تھی، فرمایا 'تم نے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟' عرض کیا کہ 'صرف یہ چاہتا ہوں کہ حق، ناحق کا فیصلہ ہو جائے۔ کیوں کہ ۱۸ ر برس

خدمت کر چکا ہوں۔' فرمایا' مولوی افضال! مدرسوں میں حق و ناحق کا فیصلہ کبھی نہیں ہوتا، اپنے کو ضائع مت کرو، یہ انتظار فضول ہے۔' چنانچہ میں نے مولانا عبدالحی چشتی کو مدرسہ حوالہ کر دیا اور اعظم گڑھ چلا گیا۔ مولانا عبدالحی چشتی کو میں نے چارج حوالہ کر دیا، کنجی وغیرہ دے دی تو انھیں بڑا تعجب ہوا، پھر مزید حیرت اس وقت ہوئی، جب چارج دے کر بھی ایک ہفتہ قیام کیا، تا کہ حضرت شیخ مدنی کے خلیفہ کو کوئی پریشان نہ کر سکے۔ اس لیے شہر کے تمام معززین سے ان کا تعارف کرایا اور جب وہ مطمئن ہو گئے تو اس فرقانیہ کو سلام کر کے چلا آیا، جس کی خدمت میں نے بحمد للہ اس طرح کی تھی جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کی خدمت کرتا ہے۔ خدا اسے قبول فرماوے۔

معمہ:

جانے کے بعد مولانا عبدالحی چشتی نے کہا کہ' آپ نے جس ہنسی خوشی سے مدرسہ مجھے حوالہ کر دیا ہے، وہ آپ کے اس مزاج کے مطابق ہے، جو بچپن سے دیکھ رہا ہوں، مگر جو صاحبزادہ (مولانا اسعد) صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ تم کو چارج نہیں دیں گے، مگر جاؤ ضرور۔ یہ کیا بات ہے؟' میں نے کہا ایسی ایسی باتیں سمجھنے کے لیے تجربہ ضروری ہے، یہاں دو چار سال رہیے تو معلوم ہو جاوے گا کہ لوگوں کے معاملات سمجھنے کا انداز کیا کیا ہے۔ ایسے ماحول میں گونڈہ سے آیا اور آج بھی مطمئن ہوں۔ یہ اطمینان دَین ہے محدث اعظمی مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی۔

یہی وجہ ہے کہ گونڈہ کے بعد ۱۹۶۷ء سے آج ۱۹۹۳ء تک مدرسہ چھوڑنے میں نہ کوئی تامل ہوتا ہے، نہ وقت لگتا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ اس فضا میں دیانت، امانت کو خطرہ ہے، اسے سلام کر کے الگ ہو جاتا ہوں۔

صحرائی مسجد:

اسی لیے جب میں نے مولانا محمد مسلم کو اس جنگل میں مطمئن دیکھا تو بہت مبارکباد دی کہ تم نے مدرسہ حوالہ کر دیا، اسے اپنی حد تک تباہی سے بچا کر بڑا کام کیا۔ جزاک اللہ

اس اطمینان خاطر کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے جو صلاحیت، بردباری اور مشکلات کو مسکرا کر جھیل جانے کا گر سیکھ لیا تھا، اس نے ان کے سامنے کام کا دوسرا میدان کھول دیا۔ چنانچہ انھوں

نے شہر سے باہر جنگل میں ایک ویران مسجد میں جا کر ڈیرا ڈال دیا، لق ودق مسجد کہ برسوں سے کوئی گھاس کاٹنے کے لیے بھی نہیں آیا تھا، اذان، نماز دور کی بات ہے۔ اس ویرانہ کو آباد کرنے کا دل گردہ مولانا محمد مسلم ہی کا تھا۔

رند جو ظرف اٹھالے وہی پیمانہ بنے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میخانہ بنے

اصغر

آج وہ صحرائی مسجد جامعہ حسینیہ کی مسجد ہے، آباد، لالہ زار اور خوش منظر۔ جب اس جامعہ اس کی عمارت اور اس کی شاندار مسجد کو دیکھتا ہوں تو اس میں سے آواز آتی ہے اور مولانا محمد مسلم کی آواز محسوس ہوتی ہے۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصل بہار پر

جامعہ حسینیہ ماشاءاللہ پھل پھول رہا ہے اور مولانا توفیق احمد اسے پوری محنت، گرم جوشی اور سلیقے سے لے کر چل رہے ہیں۔ خدا مدرسہ کو اپنے کام کے لیے، اسلام کی اشاعت کے لیے قبول فرمائے۔ آمین

شخصیت کے عناصر:

مولانا محمد مسلم کو قدرت کے دست فیاض نے تعلیم، انتظام اور خدمت کے تینوں عناصر سے بنایا تھا، اور ایسا بنایا تھا کہ انھیں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ جن لوگوں نے ان سے پڑھا ہے، وہ انھیں عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ کیوں کہ اسباق کی تیاری کر کے پڑھانا، طلبہ کو ہر سبق میں مطمئن رکھنا، انھیں پورے سبق میں متوجہ رکھنا اور ہر فن میں طلبہ پر اپنی برتری قائم رکھنا، نیز طلبہ سے خود دلچسپی لینا، انھیں کچھ بنانے کے لیے ان کی ذہن سازی کرنا مولانا محمد مسلم کا فن تھا۔ وہ متوسطات تک کی تعلیم کے لیے بہترین مدرس تھے۔

درس کے ساتھ دوسرا فن تربیت کا ہے جو بہت کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ تربیت کے تین جز ہیں۔ اول بچوں کی مزاج شناسی، دوم ان کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر مندی، سوم ان سے

شفقت، یعنی ماں کی مامتانہیں، بلکہ باپ کا لطف وکرم۔ یہ تینوں عناصر جب مل جاتے ہیں تو اس مشین سے انسان ڈھالنے کا کام خوب ہوتا ہے۔ ذہین، توانا اورفن کار لوگ پیدا ہوتے ہیں۔اس لیے کہ ان کی تربیت بچوں کی صلاحیتوں کو دباتی نہیں ابھار دیتی ہے اوراس ابھار میں ان کی ذہانت اورفن کاری ایک حسن اجاگر کردیتی ہے۔

مولانا محمد مسلم کی تربیت کے نمونے وہ علما ہیں جوان کی آغوش تربیت میں پل کر جوان ہوئے اور ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔خود مولانا محمد مسلم کے بیٹے محمد راشد سلمہ بھی ان کے بہترین ترجمان ہیں اوران کی وضع قطع، ان کے افکار و رجحان، ان کی نشست وبرخواست کے نمونہ ہیں۔خدا ان کی عمر دراز کرے۔ان کی لیاقت نے ماشاء اللہ دارالعلوم دیوبند پہنچا دیا ہے، جہاں وہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہیں۔الولد سر لابیہ

خدمت،ہی خدمت:

بچوں کی دیکھ بھال، ان کی بیماری، راحت اوران کی ہر ضرورت کا خیال، ان کی حیثیت کے مطابق ان سے برتاؤ اور بہر حال ان کی اسلامی ذہنیت کی عکاسی کی فکر ان کی خدمت کا بہترین مصرف تھا۔مدرسہ کے مہمانوں کو ذاتی مہمانوں کی طرح رکھنا، ان کے ہر طرح کے آرام کی فکر کرنا اورانھیں مطمئن کر کے روانہ کرنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

کمرہ بالکل سادہ، مگر صاف ستھرا، معمولی لباس کھدر نما اوررومال ضروری تھا۔گفتگو شگفتہ، ہنسی دلچسپ، مسکراہٹ دل نواز، چال درمیانی، مزاج معتدل تھا۔اس لیے جو بچے ان کے یہاں داخل ہوجاتے وہ ان کے بچوں کی طرح رہتے تھے اورانھیں مولانا محمد مسلم کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔

دہلی کا سفر:

جامعہ حسینیہ ان کی جوانی، حسن انتظام اورفن تعمیر کی بہترین یادگار ہے، اور عالم آخرت کا بہترین زادراہ ہوگا ان شاء اللہ۔جب آخر میں کچھ بددل سے رہنے لگے تو مولانا سید اسعد صاحب نے انھیں جمعیۃ علمائے ہند کے مرکزی دفتر میں بلالیا اوران کی جگہ بیٹے مولانا راشد سلمہ کو بیٹھا دیا۔

اورانھیں دفتر میں ایک کمرہ اور نظامت عطا کر دی۔ مجھے بھی خوشی تھی کہ دفتر کو ایک سلیقہ مند منتظم اور مخلص نصیب ہو گیا، مگر مولانا محمد مسلم کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں وہاں کیا کروں؟ سیر وتفریح ان کا مزاج نہیں، تقریر بازی ان کی فطرت کے خلاف ہے، سونا، کھانا، پڑے رہنا عمر بھر انھوں نے سیکھا نہیں۔

امارت شرعیہ کے دفتر میں کوئی مصروفیت نہیں تو ایک متحرک آدمی کا وقت کیسے کٹے؟ اس لیے سخت پریشان تھے۔ وہ جب دہلی میں ملتے تو یہی شکایت کرتے، پھر انھیں دفتر کے لوگوں میں جمعیۃ علما سے خلوص اور لگاؤ کی بھی کمی نظر آ رہی تھی، حتیٰ کہ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ جمعیۃ کے مخلصین اور معاونین کو جمعیۃ سے دور کرتے جاتے ہیں۔ اس سے سخت کوفت رہتی ہے، شعبان آیا تو یہ کوفت بیزاری تک پہنچ گئی۔ پھر ایک ورق درخواست لکھ کر مولانا اسعد صاحب کو دی اور دفتر سے گلوخلاصی کرا کے بمہور پہنچ گئے۔ وہاں ان کے پہنچنے سے مسجد اور مدرسہ میں جان پڑ گئی، مسجد کی توسیع، مدرسہ کی تعمیر، وہاں تعلیم وتربیت کا نظم وضبط اور پورے علاقہ میں مدرسہ کا تعارف ان کا موضوع زندگی بن گیا۔ وہاں جا کر دیکھئے تو وہ ۲۴ر نہیں بلکہ ۲۵ر گھنٹے مصروف رہتے ہیں اور اسی بے پناہ مشغولیت سے ان کو توانائی، دلچسپی اور زندگی ملتی ہے۔

ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

بمہور کا قیام:

عین اسی انہماک کے دور میں ایک دن ۱۲ر بجے تک دفتری کو حساب سمجھایا، گھر آ کر کھانا کھایا، ۳، ۴ کے درمیان غسل کرنے چلے گئے۔ موسم بہت گرم تھا، پھر مغرب تک ان کا پتہ نہیں چلا تو تلاش ہوئی کہ کہاں ہیں؟ نہ مدرسہ میں، نہ گھر میں، نہ سڑک پر، نہ مسجد میں، تو گئے کہاں؟ عورتوں نے بتایا کہ غسل خانے کے سامنے چپل پڑی ہے اور وہ دیر سے بند ہے۔ اسے کھٹکھٹایا گیا تو آواز آئی کہ کھولتا ہوں، مگر نہیں کھلا تو پھر آواز دی گئی اور پھر وہی آواز آئی مگر نہیں کھلا، تو دروازہ کھول کر دیکھا گیا تو فالج نے معطل کر دیا ہے، مگر ہوش حواس قائم ہیں۔ پھر ہوش بھی کم ہوتا چلا گیا، ڈاکٹروں نے دماغ کی رگ پھٹ جانے کی تشویش ظاہر کی۔ کشاکش میں لکھنؤ گئے اور تقدیر الٰہی کے نظام

سے ۲۰؍جولائی ۱۹۹۳ء کو کالج کے اسپتال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بمہو روا پس لا کر ۲۱؍جولائی کو اس حرکت و عمل انسان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ **منها خلقناكم وفيها نعيدكم**

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مرحوم:

مرحوم مولانا محمد مسلم عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے، تقریباً بیس پچیس برس، لیکن میں نے ہمیشہ انھیں بھائیوں کی طرح سمجھا اور وہ بھی مجھے بڑے بھائی کی طرح عزت دیا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے سامنے میری موت آئی ہوتی تو وہ میری مغفرت کے لیے بہت دعائیں کرتے، خوب دعائیں کرتے۔ ایسے ہی لوگ زندگی کا سہارا ہوتے ہیں اور ان ہی کے اٹھ جانے سے دنیا سونی لگنے لگتی ہے اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان سے اپنے مخلص بندوں کا معاملہ فرماوے، ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دے اور ان کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنادے۔ بار الٰہ! ان کی اولاد، ان کے شاگرد، ان کے خاندان اور اہل تعلق کو ان کے لیے زاد آخرت بنادے اور سب کو ان کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

❑❑❑

ماخذ: 'علم و دانش' گورکھ پور۔۱۹۹۳ء

انجینئر نورالدین مرحوم گورکھ پور

وہ پیشے کے لحاظ سے کامیاب انجینئر تھے، اور طبیعت کے لحاظ سے فقیر منش۔ آپ ان کے ساتھ ہفتوں رہیے، مگر کسی وقت لغو باتوں، فضول تکلفات اور بے جا غرور میں انھیں مبتلا نہیں پا سکتے۔ کام کی باتیں کرنا اور روزانہ صبح سے شام تک کا پروگرام بنا کر وقت پورا کرنا ان کا مشن تھا۔ بے نفسی، خدمت خلق، خدمت علم اور فکرمندی کے لیے وہ نمونے کے آدمی تھے۔

ابھی ہفتہ عشرہ ہوا چند دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے خود کہنے لگے کہ ہم لوگ اپنے اعزہ اور دوستوں کی خیریت معلوم کرنے جایا کرتے ہیں، کیا کبھی غریبوں کی مزاج پرسی بھی کوئی کرتا ہے؟ پھر اٹھے عبدالباقی صاحب وغیرہ کو ساتھ لیا، محلے کے غریبوں کے گھر پہنچے۔ خود اپنے نوکروں کے دروازے پر جا کر ان کی خیریت پوچھی، چند منٹ ان کے ساتھ رہے اور پھر آگے بڑھتے چلے گئے۔ وہ ایسے غریب لوگ تھے کہ ان کو آج تک یہی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ نورالدین بابو ہمارے دروازے پر کیسے آ گئے؟ حال چال پوچھا اور بغیر کوئی فرمائش کیے، کوئی آرڈر دیے اور کام بتائے چلے گئے، تو کیوں چلے گئے؟ کچھ کہا کیوں نہیں؟ انھیں کیا معلوم کہ مزاج پرسی کا مقصد کیا تھا۔

پچھلے جمعہ کو عصر کی نماز کے بعد کھڑے ہوئے، ایک اعلان کیا پھر معمول کے مطابق گھر گئے، سینے میں درد ہوا، اور ان کے بھائی ڈاکٹر عزیر ایسے مشہور سرجن جب تک آویں، دنیا کا مسافر آخرت کی پہلی منزل کی طرف چلا گیا تھا۔ کیا عجیب بات ہے کہ آخری نماز جماعت سے پڑھی اور بغیر کسی نماز کے قضا کیے اپنے مالک کے یہاں چلے گئے۔ ۶۲ر برس کا یہ مسافر تھک کر ابدی نیند سو گیا تو ان کی والدہ محترمہ ان کے لیے دعائے مغفرت کر رہی تھیں۔ ضرور قبول ہوئی ہوگی دل سے

نکلی ہوئی دعائے مغفرت۔ وہاں جانے سے ایک روز پہلے ہم لوگوں کے ساتھ ایک ولیمہ میں شرکت کے لیے کمپیر گنج جانے لگے تو ایک صاحب سے اپنی والدہ محترمہ سے کہلا دیا کہ چند احباب کے ساتھ دعوت میں جا رہا ہوں، آپ کھانے پر میرا انتظار نہ فرماویں گی۔ شام کو جب واپس آئے تو والدہ کے پاس جا کر ان سے معافی مانگی کہ مجھے آ کر آپ سے اجازت لے کر جانا چاہیے تھا مگر میں نے دوسرے سے کہلا دیا۔ یہ غلطی ہوگئی آپ معاف فرما دیں۔ کیا عجب محبت تھی اس بوڑھے بچے کو! ان کی والدہ اپنے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں۔ خدا انھیں صبر جمیل عطا کرے اور نورالدین بابو کو فردوس بریں بخشے۔

ولیمہ میں جاتے ہوئے گاڑی میں کہنے لگے کہ 'وقت آ گیا ہے کہ ایمان کی دعوت برادران وطن کو دی جائے اور اپنے مذہب سے ان کو واقف کرایا جائے۔ انھیں معلوم تو ہو کہ ہمارے پاس ہمارے خدا اور ہمارے نبی نے کیسا علم اور کتنا اچھا علم چھوڑا ہے۔' فرمانے لگے 'میرا جی چاہتا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر اب میں یہی کام کروں۔ رات خواب بھی دیکھا ہے کہ ایک بزرگ فرما رہے ہیں کہ تم کو دو فرقوں کے درمیان کام کرنا چاہیے۔'

بابو نورالدین اپنی اس تمنا کو پوری کرنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہوگئے مگر قرآن پاک کے ہندی ترجمے اور کتابیں منگا کر لوگوں کو قیمت لے کر، یا تحفے میں دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور زیادہ تر ان کے ہندو دوست تھے جو شوق سے پڑھتے تھے اور ان سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کسی مولوی صاحب نے اعتراض کیا تو مجھ سے دریافت کیا کہ ہندو بھائیوں کو قرآن پاک پڑھنے کو دینا ناجائز ہے؟ ......صاحب کہہ رہے تھے، میں تو سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں۔ پھر کہنے لگے کہ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ طہارت کے بغیر قرآن چھونا حرام ہے، تب میں نے کہا کہ انھوں نے صحیح بتایا ہے مگر مسلمانوں کے لیے ایسا حکم ہے جو اصول اور احکام دونوں کے مکلّف ہیں۔ مگر غیر مسلم بھائیوں کے لیے یہ حکم اس لیے نہیں ہے کہ وہ صرف ایمان کے مخاطب ہیں، احکام کے نہیں۔ جب ایمان قبول کر لیں گے تو احکام کے مکلّف ہوں گے۔ ایسے میں وہ بھی صحیح کہتے ہیں اور آپ بھی ٹھیک کام کرتے ہیں۔ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور مختلف مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا۔ کیوں کہ اس سے ان کا راستہ بالکل کھل گیا اور ذہن کی تشویش ختم

ہوگئی تو ہندو بھائیوں کو قرآن پڑھانا آسان ہوگیا۔

ایک مرتبہ دارالعلوم گورکھ پور تشریف لائے کہ ہمیں ایک معلم دیجیے جو لوگوں کو عربی پڑھا دے۔ میں نے پوچھا کہ بچوں کو، یا بوڑھوں کو؟ کہنے لگے جوانوں اور بوڑھوں کو۔ میں نے عرض کیا کہ سفید داڑھی کو سکھانے کے لیے کالی داڑھی مناسب نہیں ہوگی، چلیے میں خود چلوں گا۔ چنانچہ ہر منگل کی صبح کو ۷؍ بجے ان کی ناصر لائبریری میں پہنچ جاتا تھا، وہاں وہ موجود رہتے تھے اور چند بوڑھے اور جوان بھی۔ نورالدین صاحب برسہا برس نائیجیریا وغیرہ میں انجینئر تھے، اس لیے عربی سے خوب واقف تھے، پھر بھی اس کے احترام میں برابر کتاب لے کر شرکت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں جانے کی ضرورت تھی تو مجھ سے چھٹی لے کر تشریف لے گئے۔ ایسے اصول کے پابند، درس کے اہتمام سے واقف اور علم کے قدرداں تھے، اب خواب وخیال ہوگئے۔

اس کلاس کی مختلف صحبتوں میں انھوں نے ذہن کو صاف کیا کہ عربی کلاس کا مقصد کیا ہے؟ کہنے لگے کہ میرا صرف ایک مقصد ہے کہ ہمارے اندر قرآن سے مناسبت پیدا ہوجائے، تا کہ ایمان واسلام میں تازگی آئے، گہرائی وپختگی پیدا ہو، ورنہ عربی زبان، عربی ادب اور عربوں کی ملازمت ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔ چنانچہ اپنی تصحیح نیت کا کبھی کبھی اظہار بھی کیا کرتے تھے اور ہر کام سے پہلے اس کا جائزہ بھی لیا کرتے تھے کہ ہماری نیت کیا ہوگی؟ پھر اس کے مقاصد میں سے کسی اہم مقصد کو اس کا عنوان بنا کر سب کو اس میں مشغول فرما دیتے تھے۔ یہ کام بظاہر آسان ہے مگر دراصل بہت مشکل ہے تصحیح نیت کا اہتمام کرنا۔ اس دور میں مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار تھے۔ اس لیے تبلیغی جماعت اس کو اپنے سبق کا ایک نمبر بنا کر بیان کرتی ہے لیکن نورالدین بابو عملی طور پر ہر جگہ ہر کام کے لیے تصحیح نیت کا اہتمام کرکے اور اپنے دوستوں سے گفتگو کرکے اسے معین کیا کرتے تھے، تا کہ لوگ رواداری میں کوئی کام نہ کریں بلکہ جو کام کریں اس کو اعلیٰ مقصد سے دل لگا کر کریں۔

ولیمہ کی اس دعوت میں انھوں نے بڑی تشویش سے یہ بات کہی کہ تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ جب تقریر کرتے ہیں تو اس پر زور دیتے ہیں کہ کارنبوت صرف ہم انجام دیتے ہیں، بلکہ بعض حضرات مدارس وغیرہ کا نام لے کر ان کے خلاف ذہن بنا دیتے ہیں، حالاں کہ کارنبوت تبلیغ

بھی ہے، تعلیم بھی ہے، ذکر بھی ہے، جہاد بھی، اصلاح معاشرہ بھی ہے، خدمت خلق بھی ہے۔کون سا کام ہے جس کو حضور ﷺ نے یا آپ کے صحابہ نے نہیں کیا ہے؟ ہر کام کیا ہے اور اپنے وقت پر کیا ہے۔اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کے ہر کام کو کار نبوت سمجھ کر کریں اور اس کے لیے دوسرں کا ہاتھ بٹائیں، ورنہ اس طرح کی باتوں سے دین کو سخت نقصان پہنچے گا۔کہنے لگے کہ اب کی دہلی جاؤں گا تو وہاں حضرت جی وغیرہ کو اس پر توجہ دلاؤں گا، کیوں کہ یہ سخت رجحان ہے۔

نورالدین صاحب جب سے ریٹائرڈ ہوئے انھوں نے ناصر لائبریری اونچوا کو اپنی زندگی کا محور بنالیا تھا۔وہاں پر درس قرآن، ہفتہ وار نشست کا اہتمام کرتے تھے۔گورکھ پور میں کہیں سے کوئی علمی یا دینی شخصیت آجاتی تو اپنی لائبریری میں وہ ان کا استقبال کرتے تھے اور اس میں شہر کے منتخب افراد کو جمع کر لیتے تھے۔مولانا ابوالحسن ندوی اور اسی طرح مولانا سجاد اڈیٹر الفرقان اور سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا مجیب اللہ صاحب جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ جیسے حضرات سے لوگوں کو قریب کرنا، ان کی باتوں کو سمجھنا اور ان کے مشن کا تعارف کرانا ان کا معمول تھا۔

ان کا کوئی بے تکلف دوست یا عزیز کہیں باہر رہتا تو اس سے وہاں کی بہترین کتابیں منگواتے اور لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔

دینی مسائل میں طبیعت میں وسعت بہت تھی، اس لیے جہاں 'الفرقان' منگوا کر لوگوں کو دیا کرتے تھے، وہیں 'الرسالہ' بھی منگاتے، اور میرے رسالہ 'دانشور' کے لیے طے کیا تھا کہ مجھ کو اس کی دس کاپیاں بھیجا کرو، میں اپنے حلقہ میں لوگوں کو پڑھنے کے لیے دوں گا۔اسی طرح 'الرشاد' 'معارف' وغیرہ منگاتے تھے، اور جہاں کسی اچھی کتاب یا کتابچہ یا رسالہ کا ذکر آتا، اسے منگاتے اور دوسروں کو پڑھوانے کا پروگرام بنالیتے تھے۔

ناصر لائبریری کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ہندی ترجمہ قرآن مجید منگا کر اپنے ہندو دوستوں کو تحفہ کم قیمتاً زیادہ دیا کرتے تھے، وہ اسے پڑھتے اور شکرگزار ہوتے۔اور ان لوگوں سے تبادلۂ خیالات میں کوئی بات تشفی بخش نہ ہوتی تو اسے علما سے حل کراتے اور صفائی سے کہہ دیتے کہ مسائل کی مزید تشریح کرنا علما کا حق ہے۔

اس لائبریری میں سنیچر کے دن مغرب بعد قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کرایا کرتے تھے۔ مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ اوران کی تشریحات لوگوں کو پڑھ کر سناتے تھے اوراگر اس میں کہیں حل طلب سوال ہوتا تو اسے بڑی سعادت مندی سے مل جل کر حل کرتے تھے۔اس طرح پڑھا لکھا طبقہ مطمئن ہوکران کے درس قرآن میں شریک ہوتا تھا۔

مرحوم کے جانے کے بعدان کے بڑے بھائی صاحب نے مجھ سے بھی ذکر کیا کہ ترجمہ کلام اللہ کا کام کیسے جاری رکھا جائے؟ میں اپنے مختلف النوع مشاغل اوراسفار کی وجہ سے اس کی پوری ذمہ داری کو نبھا نہیں سکتا، پھر بھی ان کے بھائی صاحب کے کہنے سے اورنورالدین صاحب کے تعلق سے نیز خود خدمت قرآن کے تقاضے سے کوشش کروں گا کہ ہفتہ میں ایک گھنٹہ کا یہ مفید پروگرام جاری رہے اور میں اپنی سعادت سمجھ کراس میں شامل رہا کروں گا۔

نائیجیریا وغیرہ میں عمر گزارنے اوروہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیمی، تبلیغی اوردینی خدمات انجام دینا اوراس کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کومخاطب کرنا، انھیں مطمئن کرنا اوراپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دینا ان کا عجیب وغریب کارنامہ تھا۔وہ ٹھہر ٹھہر کر، سوچ سمجھ کرایک ایک لفظ زبان سے ادا کرتے تھے،اورمعقول سے معقول بات بولنے کے عادی ومشاق ۔اس کے ساتھ مخلصانہ انداز ان کی بات میں وزن پیدا کردیتا تھا۔اس طرح اپنے دل کی بات وہ دوسروں کے دلوں تک بہت آسانی سے پہنچادیا کرتے تھے۔

نورالدین صاحب گئے اورعین اسی منٹ پر چلے گئے جو قضاوقدر میں ان کے لیے،ار شعبان کومقررکردیا تھا۔اس لیے اچانک نہیں، پروگرام سے گئے اورانتظام سے گئے،اوروہاں گئے جہاں جانا سب کے لیے مقدر ہے۔

ان کے چھوٹ جانے کا غم سب کو ہے اور ہونا چاہیے،لیکن مجھے خوشی اس کی ہے کہ ان کو جتنا وقت دیا گیا تھا، اورجتنی صلاحیتیں خدا نے بخشی تھیں، ان دونوں کو انھوں نے اپنی حرکت وعمل سے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کرکے دکھادیا کہ وقت کا ایک ایک منٹ اورصلاحیت کا ایک ایک گوشہ کس طرح کارآمد بنایا جاتا ہے۔ان کی صاف ستھری زندگی ہم جیسے لوگوں کے لیے نمونہ ہے اوران کے ہم پیشہ دانشوروں کے لیے عبرت کی چیز ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کو استعمال

کر کے جس قدر دولت، شہرت اور حیثیت حاصل کرلیں گے، اتنے ہی قابل قدر رہوں گے۔ حالاں کہ دولت اور شہرت کو زندگی کا مقصد بنانا ایسا ہی ہے جیسے اشرفی دے کر مٹی کے کھلونے خریدنا۔ نورالدین صاحب نے زندگی جیسی سب سے قیمتی متاع کو دے کر اس سے خدمت خلق، خدمت قرآن اور اللہ کی خوشنودی حاصل کی، جس سے بڑھ کر دوسری کوئی کمائی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسی کمائی ہے جس کے لیے خدا کی طرف سے اولیا اور انبیا مبعوث کیے جاتے تھے، اور وہ پوری زندگی کو فکر آخرت میں صرف کر دیتے تھے اور اس کی تعلیم دیتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوجاتے تھے۔

آدمی ختم ہوجاتا ہے مگر مقاصد باقی رہتے ہیں، ان کے لیے تگ و دو چلتی رہتی ہے اور مقاصد کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کا حوصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس لیے نورالدین صاحب کے عزیزوں، دوستوں اور واقف کاروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مقاصد کے لیے وقت فارغ کریں اپنی صلاحیتوں کا انھیں موضوع بناویں۔ اس کے لیے نورالدین صاحب کی حرکت وعمل میں بڑے نمونے موجود ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مخلص بندوں میں شمار کرے، اور ویسا ہی معاملہ کرے جیسا اپنے مخلصین سے کرتا ہے۔ اہل علم سے ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۱۹۹۹ء

علم واخلاق کی دنیا اجڑ گئی
مولانا وحیدالزماں کیرانوی

مرنا جینا روزمرہ کا کام ہے لیکن قدرت ایسے افراد کم پیدا کرتی ہے، جن کی زندگی زمانہ میں ہلچل ڈال دیتی ہے، اور جن کی رحلت ''**موت العالم موت العالم**'' کا مصداق ہوتی ہے۔

(۱)

مولانا (وحیدالزماں) شروع سے ایک ہونہار آدمی تھے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے تعزیتی پیغام میں لکھا ہے کہ ''میں نے پہلی مرتبہ دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ نوجوان کس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس لیے اس کو دارالعلوم میں آنا چاہیے اور وہ دارالعلوم کے مدرس بنا دیے گئے۔''

دارالعلوم دیوبند میں آئے تو انھیں جو کتابیں ملیں، پڑھاتے رہے، مگر عربی زبان وادب کو اپنی فن کاری سے زندہ زبان کی طرح پڑھانے لگے، جیسا کہ مصری استاد شیخ عبدالمنعت النمر وغیرہ درس دیا کرتے تھے۔

وہ ادب کی کسی کتاب کو بطور ادب نہیں، بطور فن پڑھاتے تھے۔ اس لیے عربی کے لفظوں کو استعمال کرانا، ان کا متبادل تلاش کرنا، کسی جملے کی طرح دوسرے جملے بنانا، کسی انوکھے فقرے پر مضمون لکھوانا، لغت اور نحوی وصرفی قواعد کی مثالوں سے مشق کرانا، ان کا فن اور ذوق تھا۔

وہ عربی کے مکالمے سنا کرتے تھے اور زور دیتے تھے کہ جو جملہ ادا ہو اس کا لب ولہجہ عربی ہو، زبان صاف اور نحوی وصرفی غلطیوں سے پاک ہو۔ پھر عربی تقریر وتحریر کے لیے 'النادی الادبی' بنا کر ایک نظام کے ماتحت طلبہ کو مشاقی کا موقع دیا اور اس کی نگرانی کرتے رہے۔ چنانچہ دارالعلوم

کی دیواروں پر عربی اخبار و رسائل چمکنے لگے۔

اس جدت طرازی اور مشق و تمرین کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ ازہر کے شیخ عبدالحلیم محمود دیوبند تشریف لائے تھے تو انھیں دو چیزوں پر سخت حیرت ہوئی تھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اتنا بڑا ادارہ صرف عوامی چندوں سے چلا کرتا ہے تو انھیں مبالغہ نظر آیا۔ اس لیے ڈابھیل جا کر ایک بزرگ سے پوچھا کہ 'دارالعلوم کیا واقعی صرف عوامی چندوں سے چلتا ہے؟' جب انھوں نے اثبات میں جواب دیا تب یقین آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ دوسری حیرت ناک بات یہ تھی کہ استقبالیہ جلسہ کا اناؤنسر درجہ ہفتم کا ایک چھوٹا سا طالب علم تھا، جس کی عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی اور بے تکلف عربی بول رہا تھا اور خالص عربی لب و لہجے میں کاروائی چلا رہا تھا۔ جلسہ کے بعد شیخ عبدالحلیم محمود نے اظہار حیرت کیا کہ 'ایک بچہ، اور ہندوستانی بچہ اتنی صاف عربی اور خالص عربی لہجہ میں کیسے بول رہا ہے؟' انھیں بتایا گیا کہ دارالعلوم میں عربی تربیت کا ایسا ہی انتظام ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بچہ تھا محمد راشد اعظمی، اور اس فن کے استاد تھے مولانا وحیدالزماں جو خود ڈائس پر تھے، اور اپنے شاگرد سے وہ کام انجام دلا رہے تھے جسے دارالعلوم کا بڑے سے بڑا استاد نہیں کرسکتا تھا۔ مگر وہ اس طرح کررہا تھا کہ شیخ محمود حیرت زدہ رہ گئے۔

(۲)

مولانا کو قدرت نے جدت طراز نظر، مجتہدانہ فکر اور فاضلانہ انداز دیا تھا، اس لیے وہ اپنے ماحول سے بلند ہوکر، عام انداز کار سے اوپر اٹھ کر اور معمولات زندگی کے اندر گھس کر تلاش کرلیتے تھے کہ بہتر سے بہتر انداز طریقہ اور موضوع کا کیا ہے یا کیا نہیں؟ اس لیے:

۱) نصاب تعلیم کو بدلے بغیر صرف طریقۂ تعلیم بدل کر دارالعلوم کے عربی شعبہ میں ہلچل پیدا کردی تھی، اور اچھے اچھے علما کو نمونہ کا عربی داں بنا کر اپنا فن دکھا دیا تھا۔

۲) انھوں نے بچوں کو صرف ادب کا علم نہیں دیا بلکہ عربی زبان بھی دی۔ اس طرح صرف پڑھا کر چھوڑ نہیں دیا بلکہ اپنے مشن کے لیے پرجوش، پرحوصلہ اور فکر مند بنا دیا۔ اس لیے دارالعلوم میں ان کا درس، ان کا طالب علم، ان کا کمرہ سب سے ممتاز تھا۔

۳) انھیں ناظم تعلیمات بنایا گیا تو انھوں نے طلبہ کی حاضری کے ساتھ اساتذہ کو بھی حاضری

کا پابند بنا دیا، اور بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو اساتذہ کو ناگوار تھیں مگر تعلیم وتربیت کے لیے ضروری تھیں۔

۴) جشن صد سالہ کے موقع پر انتظامیہ کی طرف سے ان پر تعمیرات کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں تو انھوں نے رات دن ایک کر کے دار جدید کو وسیع، آرام دہ اور خوب صورت بنا دیا۔ بہت سے نئے دروازے، سیڑھیاں، وغیرہ بنا کر اور خوش گوار تبدیلیاں کر کے اچھے اچھے آرکیٹکٹ اور انجینئر وں کو حیرت زدہ کر دیا۔

(۳)

مولانا کی اس اجتہادی نظر نے فضا میں بار بار ہلچل پیدا کر کے لوگوں کو دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کے لیے اکسایا۔ دارالعلوم کا نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم اور نظام تعلیم بدلنے کی فکر پیدا کی۔ کتابی تعلیم کو فنی تعلیم سے بدلنے کا عزم دیا، طلبہ کو جمعیۃ الطلبہ کی اجتماعیت دینے کا حوصلہ بخشا۔

پھر جلسۂ دستار بندی کے بعد قائم کی جانے والی مؤتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کے لیے آمادہ کیا لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے حالات رونما ہوئے جن کے نتیجہ میں دارالعلوم میں تصادم پیدا ہوا، دارالعلوم کیمپ قائم ہوا اور پورا ملک موافق مخالف کیمپوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا، اور سنگین سے سنگین حالات پیدا ہوئے مگر دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ اور اصلاح کے سلسلہ میں مولانا کے پایۂ عزم وثبات میں کوئی لرزش نہیں ہوئی، تا آں کہ مولانا، ان کے رفقا فضلائے قدیم اور جانباز طلبہ کی جد جہد کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اور دارالعلوم دوبارہ کھل گیا۔ مولانا کے ساتھ دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کا نعرہ جس شخص نے سب سے بڑھ کر بلند کیا، وہ مولانا اسعد صاحب تھے، جنھوں نے مولانا وحیدالزماں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے مؤتمر ابنائے قدیم کو، دارالعلوم کی جمعیۃ الطلبہ کو، ملک کے منتخب افراد کو، القاسم رسالہ کو، اخبار الجمعیۃ دہلی کو اور پوری جمعیۃ علمائے ہند کو داؤں پر لگا دیا۔ آخر کار دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی جگہ اہتمام کی ذمہ داری مولانا مرغوب الرحمان صاحب کو سپرد کر دی۔ مولانا وحیدالزماں کو پہلے ناظم تعلیمات اور پھر مددگار مہتمم بنا دیا۔ اور مولانا اسعد صاحب ۲۵؍سال کی انتھک جدوجہد کے بعد مجلس شوریٰ کے ممبر بنا دیے گئے۔ اس پورے انقلاب میں اگر مولانا وحیدالزماں نہ ہوتے

اورنشأۃ ثانیہ کے لیےان کا نعرہ نہ ہوتا تو دیوبند میں ہندوستان کی کوئی طاقت یہ انقلاب نہیں لاسکتی تھی۔

انقلاب کے بعد کیا ہوا؟ اورکس طرح ہوا؟ اس کی داستان بہت تلخ اور بہت دل گداز ہے۔مؤرخ کا قلم کانپ جائے گا، سیاہی سرخ ہوجائے گی اورلفظوں کا جگر چاک ہوجائے گا، جب وہ دیکھے گا کہ مولانا اسعد صاحب نے دارالعلوم کے دروبست پر قبضہ جما کر پہلے مؤتمر ابنائے قدیم کوختم کیا، پھر رسالہ القاسم کو بند کردیا، پھر جمعیۃ الطلبہ کودفن کردیا، پھر طبیہ کالج کواس لیے دفن کردیا کہ مولانا وحیدالزماں کے دست وبازو وہاں سے مل سکتے تھے، پھر مولانا کو دفتر اہتمام سے باہر کردیااورآخرآخر میں دل ٹھنڈا نہ ہوا تو تدریس سے بھی سبکدوش کرکے ان کی ابتدائی ملازمت ختم کردی۔صرف اس وجہ سے کہ وہ دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھااورمولانا اسعد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا تھا۔ اور جب مولانا وحیدالزماں کوانھوں نے اس طرح نکال دیا تو پھر ہم جیسے جانبازوں کووہ کس شمار میں لاسکتے تھے۔ ہم سب دم بخود رہ گئے، ایسا اس وجہ سے ہوا کہ مولانا اسعد کے نزدیک دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کا مطلب تھا اپنی جاگیرداری کا قیام، جب کہ مولانا وحیدالزاں کی نظر میں نشأۃ ثانیہ کے معنی تھے دارالعلوم میں رجال کار کی تربیت۔مولانا اسعد صاحب جیت گئے،اور یہ جیت انھیں مبارک ہو۔ مولاناوحیدالزماں ہار گئے،اور یہ ہارانھیں مبارک ہو۔

(۴)

زندگی میں ایسے لمحات کبھی کبھی آتے ہیں، جب زندگی کی ساری توانائیاں لگا کر آدمی ناکام ہوجاتا ہےمگر جب یہ لمحہ آتا ہےتو ان آخری لمحات کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قیمت ہوتی ہے۔مولانا وحیدالزماں نے ۱۵؍ذی قعدہ کوسفرآخرت اختیار کیا لیکن جب انھیں اپنے جانے کا یقین ہوگیا تو اپنے بچوں سے بلا کرفرمایا کہ ’دیکھو! مولانا اسعد سے میری کوئی ذاتی لڑائی نہیں تھی بلکہ دارالعلوم کی خاطر اصولی اختلاف تھا،تمہارااس سے کوئی واسطہ نہیں۔‘ پھر فرمایا ’دارالعلوم سے میری کوئی لڑائی نہیں تھی،اس کی پوری خدمت کرنااورتم کسی سے کوئی اختلاف نہ رکھنا۔‘فرمایا کہ ’اگر عیادت کرنے کے لیے مولانا مرغوب الرحمان تشریف لائیں تو ان سے کہنا کہ ’مولانا! میں نے

یک طرفہ طور پر سب کو معاف کیا، اب وہ جانیں ان کا ضمیر جانے۔'

اس وصیت پر میں مولانا وحیدالزماں کو سلام کرتا ہوں، انھیں مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے تمام متعلقین، تلامذہ اور محبین کے لیے نقوش قدم شمار کرتا ہوں۔ یہ دل گردہ ایسے ہی مجتہدین اسلام کا ہوتا ہے۔

(۵)

مولانا کے فضائل وکمالات پر اگلے پچاس برسوں میں بہت سی کتابیں اور کتابچے لکھے جائیں گے اور نمبرات نکلیں گے۔ خود ترجمان دارالعلوم کا وحیدالزماں نمبر ان شاء اللہ بہت جلد شائع ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا کے علم وفضل، ان کے عزم وثبات، نظم وضبط اور ان کی جرأت و بے باکی کا کیا عالم تھا۔

فکر عجم ، زبان عرب ، روح دیوبند
تنہا تھا ، اس کے ساتھ مگر کارواں گیا

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۱۹۹۵ء

ایک دنیا اجڑ گئی

مولانا وحید الزماں صاحب

آدمی روز مرتے ہیں، مگر انسان کامل کی موت کبھی کبھار ہوتی ہے، اور جب ہوتی ہے تو دونوں جہاں کے سردار نے شہادت دی ہے کہ 'اس کے مرنے سے ایک دنیا اجڑ جاتی ہے۔' فرماتے ہیں "**موت العالم موت العالم**" نیز فرمایا ہے کہ 'قیامت قریب ہوگی تو علما کو اٹھا کر اسلام اٹھالیا جائے گا، اگر باقی رہ جائے گا تو رسوم ورواج۔' یہ ہے اسلام میں مرد کامل کا مقام بلند۔

مولانا وحید الزماں دیوبند کی اس خاک سے پیدا ہوئے تھے، جس نے ایک سے ایک نائب رسول، محدث، مفسر اور فقیہ پیدا کیے تھے، مگر ایسا ماہر عربی، درس وتدریس کا ایسا مجتہد، عربی ادب کا ایسا فن کار جس کے شاگرد ساری دنیا میں اس کا فن پھیلاتے ہیں، اور اس کی نقل اتار کر دنیا کو علم وادب کا نمونہ دکھاتے ہیں، صرف ایک پیدا ہوا "وحید الزماں"۔ لوگ کہتے ہیں کہ سنیچر کی شام ۱۴؍ ذی قعدہ کو سپرد خاک کر دیے گئے، مگر ان کا لب ولہجہ ان کا انداز کار، ان کا نظم وضبط اور ان کی شوخی گفتار اس وقت بھی نگاہوں میں رقصاں ہے، اور کانوں میں گونج رہی ہے اور دماغوں کو فکر بلند عطا کر رہی ہے، تو میں کیسے کہہ دوں کہ وہ فنا ہو گئے۔

اے غائب از نظر! کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

مولانا وحید الزماں کا خمیر جن عناصر سے اٹھایا گیا تھا، وہ چار تھے۔ علم وفضل، نظم وضبط، فکر ونظر اور جرأت وبے باکی۔ ان کے شاگرد ان کے علم وفضل کا نمونہ ہیں، دار العلوم دیوبند کا دار الاہتمام، دار جدید کی عمارتوں کے نقشے ان کے نظم وضبط کے گن گا رہے ہیں، جمعیۃ علما کی مجلس

عاملہ ان کے فکر ونظر کی گواہ ہیں، اور جرأت و بے باکی کے دوست و دشمن سب شاہد ہیں۔ اس لیے وہ صدیوں زندہ رہیں گے اور ملک ملک ہماری نسلوں کی اصلاح وتربیت کرتے رہیں گے۔

وہ کئی بار جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر بنائے گئے، اور اس میں شرکت بھی کرتے تھے مگر مسائل حاضرہ پر جب بولنے لگتے تو انھیں کچھ معلوم نہیں رہتا کہ ہمارے اردگرد کون لوگ ہیں؟ عزیز ہیں یا ساتھی؟ یا بزرگ ہیں؟ بس وہ تھے اور فکر ونظر کی سچائی تھی، یا بے باک رائے تھی۔ پھر جناب صدر صاحب یا کوئی صاحب اپنی شخصیت کا زور ڈال کر انھیں خاموش نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ خاموش ہو سکتے تھے تو کسی انوکھی رائے سے، فکر بلند سے اور جرأت گفتار سے، دوسری کوئی طاقت ان کے لیے طاقت نہیں کمزوری تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ جب اجودھیا میں بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا، اور مسجد پنڈتوں کے حوالہ کر دی گئی تو جمعیۃ علما کے ایک طبقہ نے محسوس کیا کہ جمعیۃ علمائے ہند مفاد پرستی کی وجہ سے بزدلی دکھا رہی ہے۔ آج اگر حضرت شیخ ہوتے تو میدان میں ہوتے۔ چنانچہ ہم چند لوگوں نے مظفر نگر، میرٹھ میں اور پھر غازی پور میں اکٹھا ہو کر اس پر غور کیا کہ جمعیۃ علما کدھر جا رہی ہے؟ اور حق کا راستہ کیا ہے؟ ہماری کوئی میٹنگ خفیہ نہیں ہوئی، جلسے کی شکل میں کہتے سنتے رہے۔ غازی پور کی روداد دہلی گئی اور آناً فاناً عاملہ کی میٹنگ بلا کر مولانا ہاشمی، مولانا عبداللہ، مولانا باقر حسین، افضال الحق جوہر، ناز انصاری اور مولانا وحید الزماں کو جمعیۃ کی ممبری سے نکال دیا گیا، تو اس وقت سے آج ۱۹۹۵ء تک خوش تھے کہ ہم نے خوشامد، مداہنت یا بزدلی نہیں دکھائی، جو بات تھی کہی اور کہیں گے۔ یہ تھے مولانا وحید الزماں اور ان کے شوخ گفتاری کے نمونے۔

مولانا وحید الزماں بالغ نظر انسان تھے، اپنے گرد وپیش سے اوپر اٹھ کر دیکھنا ان کی عقابی نگاہ کا معمولی کرشمہ تھا۔ انھوں نے دارالعلوم میں پرورش پائی تھی، اکابرین اسلام کی جوتیاں سیدھی کی تھیں، نظم وضبط ان کے خون میں شامل تھا اور خدا نے عربی ادب اور زبان کے لیے انھیں مجتہدانہ بصیرت دی تھی۔ اس لیے وہ نہ صرف مسائل اور دلائل سے بات کرتے تھے، بلکہ مسائل کا ماہرانہ تجزیہ کرنا اور مقاصد کے لیے ضروری وسائل تلاش کرنا ان کی فطرت تھی، جس سے کوئی مصلحت انھیں باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

وہ محسوس کرتے تھے کہ دارالعلوم لکیر کا فقیر ہے، اس کو کتابی تعلیم سے اٹھ کر فنی تعلیم پر لگانا چاہیے، جس کی دارالعلوم میں بڑی گنجائش ہے۔ اس لیے اگر طریقہ تعلیم، نظام تعلیم بدل دیا جائے اور نصاب میں جزوی ترمیم ہو جائے تو دارالعلوم سے ایسے افراد اٹھ سکتے ہیں جو عصر حاضر کے تمام تقاضے اسی شکل و شباہت، اسی انداز فکر سے پورا کر سکتے ہیں۔ آپ ان سے اس موضوع پر باتیں کیجیے تو ان کی نگاہوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگتی تھیں، اور آپ محسوس کرتے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شیخ چلی کا منصوبہ نہیں ہے، بلکہ ایک مفکر کا حوصلہ اور ایک رہنما کا درد دل ہے۔ اس لیے بقول اقبال کے کہ وہ رجز پڑھتے ہوئے بڑھنا چاہتے تھے۔

گفتند جہاں ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

ان کے نزدیک اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی موجودہ اہتمام کی جاگیرداری، اور دارالعلوم کا اندرونی نظام جو بے مقصد تھا۔

مولانا کے ان تصورات وعزائم کو جس شخص نے عملی طور سے لبیک کہا وہ مولانا اسعد صاحب تھے، انھوں نے دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کا نعرہ دے کر مولانا کے خلوص اور افکار کو طوفان بنا دیا، اور مولانا کے ارد گرد مؤتمر ابنائے قدیم جیسی تنظیم اور بہت سے متحرک افراد جمع کر دیے۔ اس لیے دارالعلوم کے بالمقابل ایک علمی اور اجتماعی محاذ کھل گیا، جس کی وجہ سے دارالعلوم میدان جنگ بن گیا۔ اس میدان میں ایک طرف دارالعلوم کیمپ تھا، جس کے ناظم اعلیٰ مولانا وحید الزماں صاحب تھے، اور دوسری طرف دارالعلوم تھا، جس کے سربراہ مولانا سالم صاحب تھے، اور مولانا اسعد صاحب ریفری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ نکلا کہ دارالعلوم پر مؤتمر ابنائے قدیم کا قبضہ ہو گیا اور مولانا سالم صاحب بے دخل ہو کر جامع مسجد میں محصور ہو گئے۔ تیسری سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ مولانا وحید الزماں معاون مہتمم بنا دیے گئے۔ مولانا اسعد صاحب کو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی ممبری اور طلبائے دارالعلوم کو جمعیۃ الطلبہ کا اجتماعی نظام مل گیا، جسے حضرت شیخ الاسلام دارالعلوم میں رائج کرنا چاہتے تھے۔

مولانا اسعد صاحب مجلس شوریٰ میں داخل ہونے کے بعد اپنے خول سے باہر آ گئے،

انھوں نے سب سے پہلے مؤتمر ابنائے قدیم کو دفن کیا، پھر جمعیۃ الطلبہ کا جنازہ نکال دیا، اس کے بعد طبیہ کالج کو ختم کر دیا، اور آہستہ آہستہ مجلس شوری میں اپنی غالب اکثریت بلکہ جھنڈہ بردار برادری جمع کر کے مولانا وحیدالزماں صاحب کو دودھ کی مکھی کی طرح دارالعلوم سے باہر نکال کر سڑک پر کھڑا کر دیا۔ کیوں کہ وہ دارالعلوم کو نشأۃ ثانیہ کا خواب یاد دلاتے تھے، اور اس کے لیے اقدام کرنا چاہتے تھے، جب کہ مولانا اسعد صاحب نے اس کو صرف ایک نعرہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ نشأۃ ثانیہ نہ ان کا مقصد تھا، نہ منزل، نہ اس کی ابجد سے وہ واقف تھے، نہ اس کی نشأۃ ثانیہ کے بعد مولانا اسعد صاحب اپنی کوئی حیثیت منوا سکتے تھے۔ ایسے میں وہ اقتدار، جسے وہ اپنا آبائی حق سمجھتے تھے، حاصل کر چکے تھے تو اس اقتدار کو چیلنج کرنے والی کسی بھی شخصیت یا طاقت کو برداشت کرنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

جب صورت حال دو، دو کی طرح واضح ہوگئی تو مولانا وحیدالزماں کو اور ہم جیسے تمام عہدے داران اور جھنڈہ برداران کو یقین آ گیا کہ مولانا سالم کو جاگیرداری کا ملزم بنانے والا ایم پی خود اپنی جاگیرداری کے لیے سارے ڈرامے کر رہا ہے، اور جب وہ اسے حاصل ہو گیا تو اس نے پوری ذہانت، ڈھٹائی اور دوربینی سے تمام حجابات اتار دیے اور تمام راستے صاف کر دیے۔

مولانا وحیدالزماں صاحب دھوکہ کھا سکتے تھے، دھوکہ دے نہیں سکتے تھے "المومن غر کریم" اس لیے جب انھیں یقین آ گیا کہ جس کو وہ پانی سمجھتے تھے، وہ سراب تھا، اور جسے وہ رہنما سمجھتے تھے، وہ رہزن تھا تو مبہوت رہ گئے۔ اور یہ صورت حال ان کے لیے سوہان روح بن گئی، حتیٰ کہ وہ ۱۴/ ذی قعدہ کی شام کو اللہ کے پیارے ہو گئے، تب مولانا اسعد نے ٹھنڈی سانس لی ہوگی۔

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل کا
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

مولانا وحیدالزماں نے ہمارے ساتھ ۶۶ برس گزارے اور سخت سے سخت حالات میں گزارے۔ دارالعلوم میں ہر قدم پر ان کے سامنے رکاوٹیں لائی گئیں مگر کسی کی خوشامد نہیں کی، مایوس ہو کر نہیں بیٹھے، بلکہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہے، اور جو کام بھی ملا اسے سلیقہ، محنت اور سوجھ بوجھ

سے نمایاں طور پر انجام دے کر دارالعلوم کو حیرت میں ڈال دیا۔ان کی اولوالعزمی ہی انھیں ہمیشہ بڑھاتی رہی، اور دارالعلوم میں ان کا امتیاز قائم کرتی رہی، حتیٰ کہ قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہزار مخالفت کے باوجود انھیں بارہا کام دیے، اور وہ کام کر کے دکھاتے رہے۔اس لیے آخر عمر میں کہا کرتے تھے کہ ''مولانا طیب اور مولانا اسعد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ایک نے ہزار مخالفت کے باوجود اعتبار کیا، دوسرے نے ہزار دوستی کے باوجود اعتبار نہیں کیا۔''

خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، تاکہ ٦٦ برس کی تکان دور ہو جائے اور انھیں اپنے اکابر وائمہ کے ساتھ سکون، خوشی اور اطمینان کی دولت ہاتھ آ جائے۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۱۹۹۵

مولانا امانت اللہ معروفی صاحب نوراللہ مرقدہ

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اذکروا محاسن موتاکم'' جانے والوں کا تذکرہ ان کی خوبیوں کے ساتھ جاری رکھو۔ اس تعمیل ارشاد اور دل کے تقاضے سے چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

گورکھ پور سے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کئی دن ہوئے مولانا امانت اللہ صاحب جیسا گوہر یک دانہ سپرد خاک کر دیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مولانا کے گاؤں پورہ معروف پہنچا تو جس مدرسہ میں پندرہ سال پہلے وہ ملے تھے، وہ مدرسہ نہیں ملا، اس کی جگہ ایک شاندار بلڈنگ، خوبصورت اور وسیع عمارت مسکراتی ہوئی نظر آئی۔

(۱)

عمارت نے گواہی دی کہ مولانا امانت اللہ صاحب عالم، مدرس ہی نہیں بلکہ منتظم اور مہتمم بھی تھے۔ ان کی محنت، توجہ اور سلیقہ مندی نے کھپریل کے مکان کو آرام دہ عمارت بنا کر اسے صدقہ جاریہ بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تعمیر کو تازگی، طلبہ کی مسرت اور علم دین کی خوشبوؤں سے ان کو مالا مال کرے۔ یہ صدقہ جاریہ ان کی کمائی ہوئی دولتوں میں ایک قیمتی سرمایہ ہے جس سے وہ ہمیشہ سربلند ہوتے رہیں گے۔ ان شاءاللہ

(۲)

جمعیۃ علمائے ہند کے عربی ترجمان ''الکفاح'' سے ہندوستان، پاکستان اور عرب کی دنیا واقف ہے کہ اس کے ایڈیٹر دو تھے۔ مولانا وحید الزماں مرحوم اور عزیزم مولانا الطاف الرحمٰن قاسمی جن کی ادارت میں الکفاح پھلا پھولا اور کافی شہرت پائی۔ الطاف الرحمٰن سلمہ نے مولانا امانت اللہ

صاحب ہی کی آغوش تربیت میں پرورش پائی اور الحمدللہ وہ اپنی ذہانت، سوجھ بوجھ اور علمیت میں اپنے والد محترم کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے والد کے نقوش قدم پر چلائے کہ ’الولد سر لابیہ‘۔

(۳)

ضلع اعظم گڈھ اتر پردیش کا مردم خیز خطہ ہے، مگر اس کی مردم خیزی میں بڑا حصہ پورہ معروف کا ہے، جہاں قرّا، علما اور حفاظ کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے کہ کسی ایک شہر، قصبے یا گاؤں میں ایسی تعداد کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اگر مولانا نعمت اللہ اعظمی کو دارالعلوم دیوبند میں لوگ شیخ الحدیث، علامۂ وقت اور محقق بے بدل کہتے ہیں تو ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اسی پورہ معروف گاؤں کی دَین ہیں، اور ان کے برادر بزرگ مولانا امانت اللہ کی سرپرستی نے ان کو پروان چڑھا کر اس جگہ پہنچا دیا ہے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔

(۴)

بہت سے لوگ بڑے طمطراق سے رہتے ہیں، دور سے وہ دیکھ کر ایک تعزیہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دس آدمیوں میں مولانا امانت اللہ موجود ہوں تو ان کا سادہ لباس کسی کو بتا نہیں سکتا کہ مولانا کون ہیں؟ حالاں کہ اس شخص نے سینکڑوں علما، حفاظ اور قرّا کو بچوں کی طرح پالا، دلہنوں کی طرح سنوارا اور بیٹوں کی طرح عمر بھر ان کی ناز برداری کرتے رہے، مگر اس طرح خاموش تھے جیسے موج صبا، اور اس قدر خفیہ جیسے بنیادی پتھر۔ عام طور سے مسکراتے رہتے اور کبھی کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ وہ دوستوں میں بے تکلف، شاگردوں میں شفیق باپ، دشمنوں میں سنجیدہ، خاندان میں بزرگ اور مدرسہ میں نظم وضبط کے پیکر تھے۔

(۵)

ہمارے گھوسی کی قسمت تھی کہ حاجی محمد علی اور عزیز گرامی مولانا فخر الدین نے کریم الدین پور جیسی سنگلاخ اور بدعت نواز زمین پر احیائے سنت کا ایک پودا لگا دیا اور اسے اپنے خون پسینہ سے سینچ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس اسلامی پودے کا نام تھا ’’دارالعلوم محمدیہ‘‘ جو خوب پھلا اور مولانا

شکر اللہ جیسے حضرات نے یہاں مشکوٰۃ تک حدیث وقرآن کا درس دیا تھا، مگر معلوم نہیں کس ظالم کی نظر لگ گئی کہ آج وہ اسلامی درسگاہ کریم الدین پور کے دو خاندانوں کا اکھاڑہ بن گئی اور قاضی پورہ کے ایک نامی گرامی مقدمہ باز ریفری کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ غنڈہ گردی، طوفان بدتمیزی، پولیس تھانہ اور عدالت کے تمام داؤ آزمائے جا چکے ہیں مگر ابھی تک کسی مخلص نے اس بے چارے ادارے کو معاف نہیں کیا۔ جنگ جاری ہے، مسلسل جنگ، سرد و گرم جنگ، اسی جنگ کو ختم کرانے کے لیے مئو کے علما آئے، اور نہیں ختم ہوئی۔ آخر میں لوگوں نے اس مرد خاموش کو گھیرا، اور مولانا امانت اللہ نے وہاں جا کر وقت لگایا۔ طرفین سے بات چیت کی، پھر قول فیصل لکھا۔ مغرب بعد کچھ لوگوں کو فیصلہ سناتے سناتے فالج نے خاموش کر دیا اور چار دن علاج و معالجے کے بعد اپنے مدرسہ کے پاس آبائی قبرستان میں یکم ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو ابدی نیند سو گئے۔ اس طرح اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ کار خیر میں لگاتے ہوئے گزر گئے۔

ترا خیال ہے تیرا جمال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

(۶)

سعدی چچا کہتے تھے:

دہ مرد دہ مرد را احمق کنند
عقل را بے نور و بے رونق کنند

اور مہاتما تلشی جی نے فرمایا ہے:

تلشی وہاں نہ جائیو جہاں جنم کا ٹھاؤں
آؤ بھگت کا مرم نہ جانیں رکھیں تلشیا ناؤں

مگر اس اصول کو مرد مجاہد مولانا امانت اللہ نے توڑ کر دکھایا۔ وہ پورہ معروف میں پیدا ہوئے، امانت اللہ بن کر بڑھتے رہے، پھر دارالعلوم جا کر مولوی امانت اللہ ہوئے اور پورہ معروف میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تو حضرت مولانا امانت اللہ ہو گئے۔ کیوں کہ وہ سراپا کندن تھے، ان میں کھوٹ نہیں تھا۔ اس لیے جہاں رہے محترم بن کر رہے اور پورے عزت و احترام کے ساتھ۔

ہزاروں ہزار علما، فضلا، حفاظ، قرّ ا اور دین دار لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں رخصت کیا۔ وہ چلے گئے مگر ان کے شاگردوں کا عالمی طبقہ انھیں ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بٹھائے گا۔اس لیے نہیں کہ وہ ان کے استاد تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ ان کے مربی تھے۔انھوں نے ان کو اٹھنا بیٹھنا اور چلنا سکھایا تھا، لکھنا پڑھنا سکھایا تھا، ان کی بول چال سیدھی کی تھی اور ان کے دل ودماغ پر ادب، دین اور بزرگوں کے نقوش ثبت کیے تھے۔اس لیے وہ یاد رہیں گے اور عمر بھر دعا لیتے رہیں گے۔

یادش بخیر جب وہ تصور میں آگیا

اللہ تعالیٰ ان کے ادارے کو ترقی دے، بچوں کو باپ کے نقش قدم پر چلائے اور معرفت کا شوق وذوق عطا کرے۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۱۹۹۶ء

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
حکیم وصی احمد صاحب

۴؍دسمبر ۱۹۹۵ء مطابق ۱۰؍رجب المرجب ۱۴۱۶ھ کو ۱۰؍بجے دن میں اس ہستی کو بھی سپرد خاک کر دیا گیا جس نے ہزاروں ہزار مسلمانوں اور ہندوؤں کو شفا بخشی تھی، اور سینکڑوں کو موت کے منہ سے نکالا تھا، جس کا انعام ان کو اسی دنیا سے ملنا شروع ہو گیا کہ ان کی دعائے مغفرت کرنے کے لیے نارمل کے میدان میں ہزاروں ہزار مسلمان سوگوار کھڑے تھے۔

سینکڑوں علمائے کرام، سیکڑوں حفاظ قوم، ہزاروں وکلا، دانشور، تاجر اور عہدے دار اپنے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ 'بار الٰہا! حکیم وصی احمد صاحب کو اپنی رحمت کی آغوش میں اٹھا لے، جن کی خوش اخلاقی، ہمدردی اور خلوص نے ہم سب کو شاداب کیا ہے۔'

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ 'جس کے لیے ۴۰؍مسلمان مغفرت کی دعا کر دیں گے، وہ بخش دیا جائے گا۔'

خدا کا شکر ہے کہ حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کے لیے پانچ سات ہزار مسلمان اس میدان میں کھڑے تھے، اور لاکھوں مسلمان مرد عورتیں گورکھ پور، مہاراج گنج، دیوریا، پڈرونہ، بستی اور تمام ملک میں دعا کر رہے تھے کہ 'مالک الملک! انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دے، انھیں جنت الفردوس کا مقام بلند عطا فرمائے۔' آمین

حکیم صاحب کی فکر آخرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اہلیہ محترمہ سے وصیت فرمائی تھی کہ 'تبلیغی جماعت کے کسی امیر سے نماز جنازہ پڑھوائی جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے میاں جی محراب علی صاحب کو بھیج دیا تھا کہ وہ ان کی آخری نماز پڑھا دیں۔ وہ ہاٹا کے اجتماع کے لیے دہلی سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہ کے خادم خاص ہیں، بڑے مستجاب

الدعوات اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کا شرف رکھتے ہیں، جن سے خود حکیم صاحب بھی بیعت تھے، تو میاں جی نے ذکر و شغل کی پوری کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سفارش فرمادی کہ وہ حکیم صاحب کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

فکر آخرت:

حکیم صاحب دنیا سے چلے گئے تو اس طرح کہ ان کے ذمہ کوئی نماز واجب نہیں تھی، آخری نماز انھوں نے ۲۹ر نومبر کی رات میں عشا کی پڑھی، اور معلوم نہیں کیوں وقت ہوتے ہی فرمائش کی کہ وضو کرادو، نماز پڑھ لیں۔ پھر پڑھ کر سو گئے۔ ۲ر بجے استنجا کیا اور پھر چادر اوڑھ کر سوئے تو صبح کو چادر سر کی ہوئی تھی اور حکیم صاحب بے ہوش تھے۔ یہ بے ہوشی ۳ر دسمبر تک قائم رہی۔ اور رات میں ساڑھے آٹھ بجے ابدی نیند سو گئے، اور سارا شہر سوگوار ہو گیا۔

علم و حکمت:

حکیم صاحب نے گورکھپور، گھوسی، سہارن پور اور دیوبند میں دینی تعلیم پائی، پھر علی گڑھ طبیہ کالج سے طب کی ڈگری لے کر ۱۹۵۰ء میں گورکھپور آ کر مطب کھول دیا، اور وہ ان کی خوش اخلاقی، فنی دلچسپی اور معالجانہ انہماک کی وجہ سے اس قدر مقبول ہوا کہ شہر و ضلع میں حکیم صاحب کے معنی ہو گئے ''حکیم وصی احمد صاحب''۔ انھیں شروع سے لے کر آج تک نہ فیس کی فکر ہوئی، نہ دواؤں کی قیمت کی، نہ مریض کی شخصیت کی۔ اگر ہوتی تو مرض کی کہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیسے جائے گا؟ ان کے احساس کا اثر مریض اور اس کے تیمارداروں پر پڑتا تو مطمئن ہو کر علاج کراتے اور دوسروں کو بھیجا کرتے تھے۔ اور اس لیے حکومت کے عہدے داران اور بڑے طبقہ کے حضرات بھی حکیم صاحب سے رجوع کرتے تھے، اور حکیم صاحب اپنے یونانی طریقہ علاج کے مطابق ان کا علاج کرتے تھے اور خدا کے فضل و کرم سے شفا ہوتی تھی۔

حکیم صاحب مفردات سے آج بھی علاج کرتے تھے، اور مرکبات خود اپنی نگرانی میں بنواتے تھے۔ بنی ہوئی دوائیں کبھی استعمال نہیں کرتے تھے، اس لیے سبھی دوائیں زیادہ موثر اور قابل اطمینان ہوتی تھیں۔

چھوٹے سے بڑا ڈاکٹر اپنے گھر میں دیکھتا ہے تو فیس لیتا ہے مگر حکیم صاحب اگر کسی کے

گھر جاتے تب بھی فیس نہیں لیتے تھے۔ کیوں کہ یہ خدمت کا پیشہ اب کمائی کا پیشہ بن گیا ہے۔

جرأت گفتار:

شہر میں کوئی شاہ صاحب آئے، بڑی شہرت ہوئی تو چند احباب کے ساتھ حکیم صاحب نے بھی ان کی زیارت کی۔ شاہ صاحب نے لکھنؤ سے تازی تازی مٹھائی منگا کر حکیم صاحب کی خاطر داری فرمائی۔ پھر حکیم صاحب نے فرمایا کہ 'میرے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔' شاہ صاحب کو حیرت ہوئی، وجہ پوچھی تو فرمایا کہ 'مٹھائی تو تازہ ہے مگر اس کی قیمت نہ ہم نے دی، نہ آپ نے دی، اور نہ اس شخص نے دی ہوگی جو کسی بے چارہ کی دوکان سے اٹھالایا ہے۔ ایسی مٹھائی کا کھانا میرے لیے بھی حرام ہے، آپ کے لیے بھی اور سب کے لیے بھی۔ یہ تو سیدھی سیدھی چوری ہے، کرامت نہیں ہے۔' السلام علیکم کہہ کر واپس آگئے۔ کہنے لگے جو شریعت کی پرواہ نہیں کرتے، بزرگ نہیں ہوسکتے، شعبدہ باز ہوتے ہیں، ان سے مذہب بدنام ہوتے ہیں۔

حکیم صاحب لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ صبح سے مطب میں بیٹھتے تو شام تک ان کی محفل گرم رہتی تھی۔ اسی میں مہمان، مریض آمد ورفت والے آتے رہتے تھے اور ان کی دلچسپ، مربوط اور لچھے دار باتوں سے لطف اندوز ہو کر جاتے تھے۔

برجستگی:

حکیم صاحب چلے گئے مگر ان کی باتیں، ان کے لطیفے اور چٹکلے مدتوں لوگوں کا دل گرماتے رہیں گے۔ ایک مرتبہ ایک رئیس صاحب کے یہاں دعوت میں تشریف لے گئے، وہاں سارے شہر کے رؤسا اور زمیندار حضرات خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دسترخوان پر سب حضرات بیٹھ گئے، کھانا شروع ہوگیا، مرغ کا ڈونگا حکیم صاحب کے سامنے آیا، آپ نے آگے سرکا دیا۔ دوسرے صاحب نے کچھ فرماتے ہوئے پھر حکیم صاحب کی طرف مرغ بڑھا دیا تو حکیم صاحب نے یہ کہتے ہوئے آگے سرکا دیا کہ 'مولوی تو مرغ اڑاتے ہی رہتے ہیں، ان حضرات کو دیجیے جن کو بہت کم مواقع ملتے ہیں۔' اس برجستگی پر وہ لوگ دنگ رہ گئے جو دوسروں کی پگڑیاں اچھال کر لطف اندوز ہوا کرتے ہیں، اس طرح حکیم صاحب نے اپنا لوہا منوالیا۔

❑❑❑ ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ۱۹۹۵ء

قاضی اطہر مبارکپوری۔فکروفن
''مجنوں چلا گیا تو جنگل اداس ہے''

آدمی کیسے بنتا ہے؟اورکون بناتا ہے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں، ہاں جب بن کر سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں استاد نے یا فلاں ماں باپ نے یا آبائی خانوادے نے یا ماحول نے بنادیا ہے،لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے کہ ماحول وہی، خاندان وہی، ماں باپ وہی ہوتے ہیں مگر دوسرا بھائی اس طرح نہیں بنتا؟ آخر کیوں نہیں بنتا؟اگر ماحول اور خاندان ہی بناتے ہیں آدمی اورفن کار؟

تخلیق:

صحیح بات یہ ہے کہ شخصیت وہ پہاڑی چشمہ ہے جوزمین پر گرتا ہےتو ہر نشیب وفراز سے راستہ دیتا چلا جاتا ہے، اور جتنے پودے یا درخت اس کے راستے میں حائل ہونا چاہتے ہیں، انھیں بھی جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے، اور وہ ہنستا کھیلتا چلا جاتا ہے، اور اپنے پورے سفر میں جگہ جگہ اسے سہارا ملتے رہتے ہیں اور اسے آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔

آپ دیکھئے بندول میں پیدا ہونے والے لڑکے پر کسی کو شبہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ بچہ شبلی جیسا قدآور، مورخ، ادیب ،شاعر اور دارالمصنفین کا بانی ہوگا،لیکن وہ ہوا،اوراس طرح اپنی شخصیت کا پرچم اڑاتا چلا گیا کہ پھر علی گڑھ اور ندوۃ العلما بھی اس کا راستہ نہ روک سکے۔رحمہ اللہ

قدرت ہر شخصیت کو اپنی نگرانی میں اس کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ان ہی خوش نصیب لوگوں میں مبارکپور میں پیدا ہونے والا وہ بچہ بھی تھا، جو ۱۹۱۶ء میں اسی طرح پیدا ہوا تھا جس طرح دوسرے دولاکھ بچے دنیا میں اسی دن پیدا ہوئے تھے،لیکن کوئی قاضی اطہر نہیں بنا اور جو بنا وہ اپنی سوجھ بوجھ، اپنی انفرادیت اور بے پناہ جدوجہد اپنے ساتھ لایا تھا۔اس لیے احیاء العلوم سے مدرسہ

شاہی مرادآباد تک سینکڑوں طلبہ اس کے ساتھ تھے، مگر کوئی نہ اس کے ساتھ چل سکا، نہ اسے پیچھے کرسکا۔ وہ یکہ وتنہا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ غربت نے اس کا راستہ ضرور روکا مگر وہ پھٹی ہوئی چادر میں سردیاں کاٹ کر وقت گزار لے گیا، جب دنیا کے سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں ''رجال السند والہند'' جیسی نادرۂ روزگار کتاب تھی، جس میں عہد رسالت اور اس کے بعد کے ان رجال کار کا تذکرہ تھا جو برصغیر میں پلے بڑھے تھے، اور آج تک ان کا چہرہ کسی نے کھول کر نہیں دیکھا تھا کہ تم کون ہو؟ کہاں کے ہو؟ مگر اس بندۂ خدا نے تن تنہا پوری تاریخ مدون کردی۔ تاریخ عالم میں بالکل نیا عنوان ہے اور عرب و ہند کے تعلقات کا بہترین ترجمان ہے۔

(۲)

مولانا نامی:

نامی صاحب سے میری پہلی ملاقات مدرسہ نورالعلوم بہرائچ میں اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۴۴ء میں وہاں درجہ علیا کا مدرس تھا، اور ۱۹۴۶ء کا ہنگامہ خیز الیکشن گزر چکا تھا۔ اسی میں نورالعلوم کے بانی اور ناظم تعلیمات مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی تھے، اور صدر مدرس حضرت مولانا حمیدالدین صاحب قدس سرہ العزیز تھے۔ مولانا نامی نے جمعیۃ علمائے ہند کے ٹکٹ پر اودھ و آگرہ کے متحدہ صوبے سے ممبری کا الیکشن لڑنا طے کرلیا تھا، تو قیصر گنج سے بڑی دھوم دھام سے کامیاب ہوئے۔ جب کہ لیگ کے مقابلہ میں پورے صوبے میں چند ہی آدمی کامیاب ہوئے تھے۔ اس الیکشن کے بعد مولانا کو کانگریس سرکار میں پنتھ جی نے پارلیمنٹری سکریٹری منتخب کرلیا اور نامی صاحب سمپورنانند جی کے ساتھ لگا دیے گئے، جو تھے تو کانگریس کے ممبر، مگر انھیں ہندو مہاسبھا کا صدر ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ برہمن تھے اور تنگ نظر۔

''انصار'' اخبار:

مولانا نامی نے اس دور میں ہمت کر کے ''انصار'' ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اس کے لیے مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کو رسڑا، اور قاضی اطہر صاحب کو مبارکپور سے لاکر بیٹھا دیا۔ اس وقت مولانا بلیاوی مصباح اللغات مرتب کررہے تھے۔ اس لیے جب ان کے کمرے میں جائیے تو وہ ہوتے تھے، ایک معمولی چارپائی ہوتی تھی اور کتاب کے مسودات۔ مجھ کو جب معلوم ہوا کہ قائد مرادآباد

کے قلم کار قاضی اطہر صاحب آرہے ہیں تو نام سے ادھیڑ عمر کے محسوس ہوتے تھے، لیکن جا کر دیکھا تو وہ جوان نہیں نوجوان نکلے۔ مجھ سے کچھ عمر زیادہ تھی مگر جثہ میں کمزور تھے۔ چہرہ سنجیدہ، ذہن چلبلا مزاج میں شرافت، بات میں وزن، اٹھنے بیٹھنے میں بے تکلف اور دوست تھے۔ مجھ جیسے کم آمیز آدمی کو اچھے لگے، بہت اچھے۔ وہ ناظر پورہ میں رہنے لگے اور میں نورالعلوم بشیر گنج میں، مگر فاصلہ زیادہ نہیں تھا، اور ہوتا بھی تو کم ہو جاتا۔ اس لیے ملاقاتیں خوب رہتیں۔ میں نے سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور میں ابوسعید بزمی صاحب کے زمانہ میں دو تین مضامین لکھے تھے، اور وہ چھپے بھی تھے۔ اس کے بعد انصار کے لیے بھی کچھ لکھنے لگا۔ قاضی صاحب از راہ کرم چھاپنے لگے۔ پریس مولانا نامی کے بڑے بھائی مولانا احسان صاحب کا تھا۔ اس لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا، انصار چلتا اور خوب چلتا۔

فرقہ پرستی:

چند مہینوں کے بعد مولانا نامی پر فرقہ پرستی کا الزام لگا کہ وہ ہندوؤں کو مسلمان کرتے ہیں کیوں کہ جامع مسجد بہرائچ میں جمعہ کے بعد کسی نے خواہش کی تھی، اور غالباً مولانا نے اسے کلمہ توحید پڑھا دیا تھا۔ یہ خبر اخباروں میں آئی اور اچھل گئی، حتیٰ کہ اترپردیش محکمہ تعلیم کے لیے ایک مسئلہ بن گئی تو سمپورنا نند جی مہاراج نے ان کو ممبری پر واپس کر دیا، تو چند مہینے کے بعد مولانا کی صوبائی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔ آخر ''انصار'' بے چارہ گم ہو گیا تو قاضی اطہر صاحب بھی اس کی تلاش میں کہیں چلے گئے۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اس طرح ۱۹۴۸ء (رجب ۱۳۶۷ھ) میرا اور ان کا ساتھ چھوٹ گیا، مگر یاد نہیں گئی۔

(۳)

بات صاف کہنا اگر جرم ہے تو اس کی سزا مجھے بہت کاٹنی پڑی ہے۔ نورالعلوم میں مفتاح القرآن ایک اچھی کتاب تھی، مگر مولانا نامی اسے بطور تحریک چلانا چاہتے تھے، اور نورالعلوم ان کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس پر ایک مجلس غور کر رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ بطور تحریک تو یہ نہیں چل سکتی۔ یہ بات اتنی گستاخ تھی کہ مولانا نامی نے مجھے برخاست کر دیا، اس کی خبر مجھ کو مولانا نور محمد

ٹانڈوی سے ٹانڈہ میں ملی تھی۔ حضرت شیخ (مولانا سید حسین احمد مدنی) کی درگاہ میں ہم سب حاضر تھے تو مولانا سید حمید الدین صاحب نے مجھے گونڈہ بھیج دیا۔ گونڈہ سے میں بمبئی گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ قاضی اطہر صاحب یہیں قیام پذیر ہیں۔ ایک صاحب کو لے کر ملنے گیا جو جمعیۃ علما بمبئی کا کام کرتے تھے معین الدین صاحب اعظمی۔ میں ان کے ساتھ دوسری یا تیسری منزل میں ایک غار میں گھسا۔ معلوم نہیں اصحاب کہف کا تھا، یا امام غائب کا۔ آگے چل کر روشنی نظر آئی تو دیکھا کہ قاضی صاحب تھے، چٹائی تھی، کتابیں تھیں اور قلم چل رہا تھا۔

میں ہوں اور گوشۂ تنہائی ہے

ملاقات اچانک ہوگئی تھی، اس لیے بہت خوش ہوئے، خوب ملے اور خوب ہنسے اور خوب باتیں کرتے رہے۔ کہاں؟ کیسے؟ کب؟ کیا؟ جیسے سوالات اور جوابات سے دل بہل گیا، اور جلدی چلا آیا کیوں کہ ان کی مشغولیت کا وقت تھا۔

یہ کمرہ قاضی صاحب کی افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ بمبئی کے شور و ہنگامے سے کالے کوسوں دور، زندگی کی آوَ بھگت سے بے گانہ، لوگوں کی عام دلچسپیوں سے بالکل نا آشنا۔ وہ کمرہ بمبئی میں ضرور تھا مگر بمبئی اس کے اندر نہیں تھی، کسی طرف سے نہیں تھی۔ خلوت در انجمن اسی کا نام ہے۔

اللہ رے سناٹا آواز نہیں ہے

یہ جگہ دوسروں کو دی جائے تو مفت نہیں لے سکتے مگر قاضی صاحب کو اگر یہ جگہ نہ ملتی تو ایک سال بھی بمبئی میں نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ زندگی اور جوانی کے بہترین سال انھوں نے اسی غار میں گزار دیے اور بہت مطمئن ہو کر گزارے۔ یہیں جم کر بیٹھے اور ''رجال السند والہند'' لاکر دنیا کو دی۔

غم مجھ کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

(۴)

شخصیت:

قاضی صاحب کو قدرت نے نوازا تو خوب نوازا، سادگی دے دی تو مصنوعی حسن سے بیزار کر دیا، عقل عطا کی تو مالداروں سے بے نیازی بخش دی، دین دیا تو دنیا داروں کا پیوند نہیں لگایا،

علم دیا تو تجارت کے گر نہیں سکھائے، انفرادیت کا جوہر عطا کیا تو کبر وغرور کی گرد اس پر نہیں جمنے دی۔ اس لیے انھوں نے گم نامی کے احاطہ میں اپنی کٹیا بنائی اور اس کے صحن میں کنواں کھود کر پانی نکالا، اس سے ایک باغ کا باغ تیار کر دیا۔ پھر اس پھلواری کے نظارہ کے لیے لوگوں کو دعوت دی تو عرب وعجم کے علما وفضلا، ادیب ودانشور دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس بوریہ نشیں نے اتنا عظیم کام کر ڈالا کہ قالین نشیں اکیڈمیاں آج تک نہیں کر سکیں۔ آج بھی ''رجال السند والہند'' دیکھئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ صدر پاکستان ضیاء الحق مرحوم نے دیکھا اور سنا تو قاضی صاحب کو دیکھتے رہ گئے۔ پھر وہاں سندھ میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی کہ انھوں نے باپ دادوں کے نام روشن کر دیے اسی لیے کسی نے کہا تھا کہ 'ایک فقیر بے نوا نے نئی نسل اور پرانی نسلوں کے درمیان ایک پل باندھ دیا' احسان دانش نے ایسے ہی لوگوں کو آواز دی ہے۔

میرے شہ پاروں کی کھائیں گے قسم اہل ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغ شام سے

مگر قاضی صاحب عجیب آدمی تھے، تاریخ اسلام کی ایسی وادی میں گئے، جہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہاں ایسے چار چاند لگا کر واپس آئے کہ دوسرا وہاں پانچواں چاند نہیں لگا سکے گا۔

مضت الدهور وما أتين بمثله
ولقد أتىٰ فعجزن عن نظرائه

(۵)

قاضی جی کی مسیحائی:

تاریخ ایک خشک موضوع ہے جو بالکل بے نمک کا سالن ہے، مگر قاضی صاحب کی بلند فطرت نے اسی پہاڑ پر اپنا آشیانہ بنایا۔ پھر کھائیوں میں اترے، پتھروں کو چیر کر، سنگلاخ زمینوں کو روند کر، ہزاروں ہزار صفحات کے اندر سے ایسے ایسے بزرگوں کو پہچان لائے جن کے خاندان والے بھی انھیں بھلا چکے تھے۔ یعنی مردوں کو زندہ کر دیا مسیحا نے۔

قاضی صاحب کی انفرادیت کا سب سے بڑا عنصر ان کی مہم جوئی، ان کی ژرف نگاہی اور بے پناہ محنت تھی۔ ان تینوں عناصر نے ان کو خلوت پسند اور خاموش کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اصحاب

کہف کے غار میں چھپ کر رہے، لیکن سوتے نہیں جاگتے رہے،اور اپنی حوصلہ مندی سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے جن کے لیے قدرت نے انھیں تراشا تھا۔اس لیے جس طرح مولانا آزاد اپنی نثر،اس کے اسلوب اور آہنگ کے خالق اور خاتم دونوں تھے،اسی طرح قاضی صاحب اپنے فن کے موجد تھے،اور اب مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد قلندر اس میدان تیہ کو طے کر سکے گا۔

تمہارے قد کا کوئی دوسرا نہیں ملتا

(۶)

تفنن طبع:

قاضی صاحب کے مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوب تھی،اور اسی ظرافت نے ان کے موضوع کے روکھے پن میں بھی ان کی شگفتگی قائم رکھی۔ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے بزرگ ساتھی مولانا عبدالباری قاسمی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو قاضی صاحب مبارکپور میں تشریف رکھتے تھے اور اپنا دانش کدہ بنانے کی سوچ رہے تھے۔لڑکے کام کے مل گئے تھے،اس لیے خدا کا شکرادا کرنا چاہتے تھے''لئن شکرتم لازیدنکم'' میں نے قاضی صاحب کو چھیڑ دیا کہ 'قاضی صاحب! آپ کی منشی پالٹی (میونسپلٹی بورڈ) کیسا مافق ہے؟ نہ سڑک ٹھیک ٹھاک، نہ صفائی ستھرائی،آپ لوگ اس میں کیسا رہتا ہے؟' میرا اتنا کہنا تھا کہ قاضی صاحب پر بمبئی سوار ہوگئی، لگے وہاں کی کھڑی زبان میں بولی بولنے اور میرے کو تیرے کو سناتے چلے گئے۔اس سے معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں رہے تو صرف کوہ قاف اور محلوں میں نہیں رہے بلکہ انقلاب کا کالم نویس وہاں کی سڑکوں پر، گلیوں میں اور محلوں میں آتا جاتا تھا۔اس لیے بمبئی سے خوب واقف تھا۔اس کے لب ولہجہ اور اتار چڑھاؤ کو ابھی تک نہ بھول سکا تھا،اگرچہ بمبئی چھوڑے ہوئے مدت ہو چکی تھی۔

(۷)

اکیڈمی کا موضوع:

میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ 'قاضی صاحب! آپ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے سربراہ ہیں۔یہ بتایئے اس اکیڈمی کا موضوع کیا ہے؟' برجستہ بولے کہ 'یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم،بس ایک دفتر ہے، دو ایک آدمی وابستہ ہیں اور دارالعلوم اسے چلا رہا۔ویسے نہ کسی کو ذوق ہے، نہ

دلچسپی۔' پھر میں نے عرض کیا کہ 'جن لوگوں پر دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کا بھوت سوار تھا، وہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم کی تاریخ، اکابر دارالعلوم کی تاریخ، اکابر دارالعلوم کے علوم وفنون اوران کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ یہ تھاان کا موضوع۔' کہنے لگے کہ 'اس وقت اس کا کوئی مقصد نہیں ہے، مگر ادارہ ہے، چل رہا ہے، میرا بھی تعلق واجبی سا ہے، کیوں کہ کام کا ماحول نہیں ہے۔'

الدیوبندیۃ:

اب کی حج سے واپسی ہوئی تو ہم لوگ ''الدیوبندیۃ'' عربوں کا تحفہ لے کر آئے تھے۔ یہ کتاب نہیں ہے، سلفیان عرب کی عدالت ہے۔ اس میں ایک طرف دیوبندیوں کی دو تین پشتیں کھڑی ہیں، دوسری طرف ندوہ اور تبلیغ والے بھی کھڑے ہیں اور تیسری طرف وہابیان نجد۔ سلفیان عرب اور غیر مقلدین ہند و پاک دربار لگائے تشریف فرما ہیں۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم لوگ صوفیا کے قائل ہیں، تصوف کو حق کہتے ہیں، اولیا کی کرامتوں کو مانتے ہیں، توسل کو مانتے ہیں، خدا کے اجلاس علی العرش کو نہیں مانتے، استواء علی العرش کو مانتے ہیں۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ ہم لوگ 'اشاعرہ' اور 'ماتریدیہ' کو علم کلام کا رہنما مانتے ہیں، حالاں کہ وہ کافر تھے، مشرک تھے، سلفیان حرم کی لغت میں ان جرائم کی سزا یہ سنائی گئی ہے کہ کافر ہیں، مشرک ہیں، زندیق اور ابوجہل ہیں، خارج از ملت ہیں۔ یہ کس کا فتویٰ ہے؟ سلفیان حرم کا، وہابیان نجد کے مذہب جدید کا۔

شیخ الہند اکیڈمی:

یہ کتاب ہم لائے تھے تو خیال تھا کہ شیخ الہند اکیڈمی اس کا جواب دے گی اور پوچھے گی کہ تم کون ہو فتویٰ دینے والے؟ اور تمھیں کیا حق ہے کہ کسی کے دلائل سنے بغیر صرف ایک دو جملے پر قضا علی الغائب کرنے کا؟ مگر افسوس کہ حضرت قاضی صاحب سے ملاقات نہیں کر سکا، جب تک وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر تو شیخ الہند اکیڈمی کو مخاطب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کون سنتا ہے فغان درویش۔ ورنہ اگر قاضی صاحب کتاب دیکھ لیتے تو ان کا خون گرم ہو جاتا اور وہ اس کتاب کے جواب کا ضرور انتظام کرتے۔ کیوں کہ قاضی صاحب بڑے غیور، بڑے اکابر شناس اور مسلک اہل حق کے لیے بڑے جاں نثار تھے۔

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

گدڑی میں لعل:

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ترقی کے لیے مال ضروری ہے، خوش حالی اور اطمینان ضروری ہے، ان کے لیے قاضی صاحب کی زندگی بہترین جواب ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی، اس کی رفتار اور اس کے پھیلاؤ کو چند اوراق میں سمیٹ دیا ہے۔ اسے آپ پڑھیے اور دیکھئے کہ اگر کسی کو ہمت ہے تو:

مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

انھوں نے شاعری شروع کی تو پورا مبارکپور ان کے نغموں سے گونج اٹھا، پھر صحافت میں آئے تو 'قائد' مرادآباد، 'زمزم' لاہور، 'انصار' بہرائچ، 'البلاغ' بمبئی، 'انقلاب' بمبئی اور 'معارف' وغیرہ بڑے فخر سے ان کے مقالے چھاپتے تھے، اور ان کی ادارت میں خوب چھپتے تھے، حتیٰ کہ 'انقلاب' بمبئی میں آج بھی روزانہ جو ترجمہ اور معارف چھپتے ہیں، وہ اس قدر اہم اور شگفتہ ہیں کہ ان کی وفات کے بعد بھی لوگ اسے تازہ تحریر سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ ادب عالیہ حال و ماضی کا پابند نہیں ہوتا، جیسے ابوالکلام اور شبلی کی تحریر پڑھیے، چھاپیے اور نقل کیجیے تو اس کی شگفتگی، تازگی اور تأثرات میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ غالب اور میر کے اشعار ایک صدی کے بعد بھی آج کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے صحافت کے ساتھ تصنیف و تالیف کو موضوع حیات بنایا تو نئے نئے گوشے تلاش کر کے اپنی اولوالعزمی اور انفرادیت سے اس کو بھی ایک نمونہ کی چیز بنا کر رخصت ہوئے۔ اور یہ سب کن حالات میں کیا ہے؟ اسے ان کے سوانحی خاکے میں پڑھیے اور دیکھئے کہ انھوں نے پریشان حالی کے باوجود غربت کی پرواہ نہیں کی، کام کی پرواہ کرتے رہے، اس لیے ان کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا۔ کیوں کہ کام کے لیے دل و دماغ تیار ہوں تو حالات کے زیر و زبر سے بے پرواہ ہو کر آدمی اس طرح گزر جاتا ہے جیسے قاضی اطہر صاحب مسکراتے ہوئے گزر گئے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے فتوحات نصیب فرمائیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

❑❑❑

ماخذ: ماہنامہ 'ضیاء الاسلام' قاضی اطہر مبارک پوری نمبر۔ ۲۰۰۰ء

مولانا محمد منظور نعمانی

برصغیر ہندو پاک کی عظیم اسلامی شخصیت مولانا محمد منظور نعمانی ایک طویل علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے تو ۹۲ر برس کے مسلسل سفر کے بعد ۴رمئی ۱۹۹۷ء کو لکھنو میں ابدی نیند سو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا نے وسطانی تعلیم دارالعلوم مئو اعظم گڑھ میں حاصل کی، پھر حدیث وتفسیر کے لیے خاندان والوں کی منشا کے خلاف دارالعلوم دیوبند گئے۔ سن کر گئے تھے کہ دیوبندی رسول کو نہیں مانتے، رسول کی توہین کرتے ہیں، بدعقیدہ بلکہ کافر ہیں، لیکن جب سنبھل کی فضا سے نکل کر دیوبند پہنچے تو وہاں صحابہ کرام کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھیں، حدیث وفقہ کا چرچا دیکھا، عجیب سے عجیب تر شخصیتیں دیکھیں۔ شاہ انور صاحب کا علم حدیث کا طنطنہ نظر آیا، اور پورا دارالعلوم علوم وفنون ہی نہیں تربیت اور آداب نبوت کا مجسمہ نظر آیا۔

ایک ایسا طالب علم جو مئو سے حمد اللہ، شمس بازغہ اور قاضی مبارک جیسی کتابوں سے منطق وفلسفہ سیکھ کر آیا ہو، مگر اس کے ضمیر نے گواہی دی کہ یہاں علم حدیث اور نبوت کی روشنی ہے، اس لیے اس کو دیوبند میں اتباع رسول کی دولت مل گئی، علوم نبوت کا خزانہ مل گیا اور ایمان واسلام کی لذت نصیب ہو گئی۔ اس لیے عمر بھر کے لیے مسلک دیوبند کا ترجمان، دارالعلوم کا نمائندہ اور اکابر اسلام کا عاشق زار بن گیا۔ پھر اس خوش نصیب پر یہ رنگ اس قدر غالب آیا کہ ۹۲ر سال کی طویل عمر میں کبھی یہ رنگ پھیکا نہیں پڑا، بلکہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

(۲)

دیوبند سے مولانا جب سنبھل لوٹ آئے تو وہاں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولانا

حشمت علی خاں صاحب کا بریلوی مکتبہ فکر اپنے شباب پر تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری اور مولانا معظم علی صاحب جیسے حضرات مسلک دیوبند کی ترویج واشاعت میں سر سے کفن باندھ کر میدان میں کھڑے تھے۔ ایک طرف سے کفر وتکفیر کی موسلا دھار بارش ہورہی تھی، دوسری طرف مولانا مرتضیٰ حسن کی چاندنی پھیلتی جارہی تھی۔ بحث ونظر، مناظرہ اور مجادلہ کا بازار ہی نہیں گرم تھا، میدان جنگ گونج رہا تھا۔ ایسے میں سنبھل کا یہ نوجوان تماشہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے اپنی فطرت کے مطابق میدان میں اتر گیا اور اس جرأت وہمت سے اترا کہ اس نے اپنا دفتر ہی بریلی شریف میں کھول دیا اور وہیں سے ''الفرقان'' جیسے ماہانہ پرچہ کو جاری کرکے کفر وبدعت، بدزبانی اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کی گالیوں پر بند باندھنا شروع کردیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بریلویت کے ہر حملے کا جواب دے کر، ہر نامعقولیت کا پول کھول کر، ہر کفر کی بخیہ ادھیڑ کر اور ہر گالی کا مذاق اڑا کر مولانا نے اور ان کے ہم نواؤں نے کتابوں کا وہ ذخیرہ تیار کردیا جو ہمیشہ کے لیے جنگ کا خاتمہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ آج وہ جنگ سرد ہوچکی ہے اور اس میں بڑا حصہ حضرت مولانا کا ہے۔ اور اسی معرکہ آرائی میں مولانا نے اپنے کو سنبھلی کی بجائے نعمانی کہنا شروع کردیا۔ برداللہ مضجعہ

(۳)

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو بات سامنے آتی، اس کا علمی یا جذباتی یا تجرباتی تجربہ کرکے سمجھنا جانتے تھے کہ حق کیا ہے، باطل کیا؟ مگر اتنا تو ہر صاحب عقل کرلیتا ہے۔ مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ حق کو حق ثابت کرنے اور باطل کا اعلان کرنے کے لیے کمر کس لیتے تھے اور بے سروسامانی کے باوجود اس وادی میں چل نکلتے تھے۔ کیوں کہ احقاق حق اور ابطال باطل کے بغیر دم لینا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

گھیر لیتا ہے جب ان کو باطل کہیں
دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی ، بزن

یہ تھا مولانا کا حال، اور اسی حال میں انھوں نے پوری عمر گزار دی۔ ظاہر ہے کہ ہر معرکے میں اپنا موقف بنانا اور پھر اس کے لیے جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس لیے مولانا کو کئی بار ٹھوکریں لگیں، ناکامیابی ہوئی، اور مسلسل ہوئی مگر وہ کسی حال میں نچلے بیٹھنے والے نہیں

تھے۔ یہی مرحلہ زندگی کا سب سے سخت اور خطرناک ہوتا ہے، اور اگر اس مرحلے میں خدا کی توفیق میسر نہ آئے تو آدمی بہک جاتا ہے، یا برباد ہوجاتا ہے۔ اور توفیق میسر آجائے تو سنبھل جاتا ہے، راستے پر آجاتا ہے اور نفس مطمئنہ کی دولت تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت مولانا اپنی ابتدائی زندگی میں مولانا مودودی صاحب کے ساتھ بھی وابستہ ہوئے اور جماعت اسلامی کی تاسیس میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ وابستگی بڑی پرجوش اور سرگرم تھی، لیکن اس کے باوجود جب ان کو محسوس ہوا کہ ان سے فکرونظر کی غلطی سرزد ہوئی ہے تو مودودی صاحب سے علاحدگی اختیار کرنے میں دنیا کی شرم یا کوئی اور چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، کسی تحریک سے وابستہ ہونے اور اس کی طرف دوسروں کو بھی پوری قوت سے دعوت دینے کے بعد اس سے علاحدہ ہونا نفسیاتی طور پر بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے، اور یہ فیصلہ وہی شخص کرسکتا ہے جو تلاش حق کا سچا جذبہ اور اپنی غلطی کے اعتراف کی اخلاقی جرأت رکھتا ہو۔

(۳)

مولانا کی قوت فیصلہ اور تلاش حق ان کا فن تھی، وہ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے سرپرست تھے، اور راقم الحروف مہتمم تھا۔ مولانا کے بعض مریدین نے مولانا کو باور کرادیا کہ 'افضال یہاں لیڈری کرتا ہے، پڑھاتا کچھ نہیں، اس لیے لڑکے بیزار ہورہے ہیں۔' مولانا کا ذہن میری طرف سے غیر مطمئن کرنے کی یہ باریک چال تھی مگر مولانا اس جال میں اس وجہ سے نہیں آئے کہ انھوں نے اس شکایت میں حقیقت کی جستجو شروع کردی۔ صبح کو مجھ سے فرمایا کہ 'سب سے بڑی جماعت کے بچوں کو میرے پاس بھیج دو۔' یہ اچانک حادثہ تھا، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا امتحان لینے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ اس وقت شرح جامی میں گیارہ لڑکے تھے، میں نے انھیں درسگاہ میں بیٹھا دیا اور مولانا کو بلا کر وہاں سے چلا گیا۔ مولانا نے لڑکوں سے شرح جامی کی عبارت پڑھوائی، ترجمہ کرایا، مطلب پوچھا۔ چونکہ اس جماعت میں بڑے ہونہار لڑکے تھے، سبھی نے بے دھڑک عبارت پڑھی، بے لاگ ترجمہ کردیا اور مطلب بتادیے تو مولانا کو حیرت ہوگئی، اور بہت خوش ہوئے۔ پھر مجھے بلا کر بچوں کی تعریف کی اور اس طرح کی شکایت پر بھروسہ نہیں کیا۔ پھر انھوں نے شکایت کرنے والوں سے کیا کہا مجھے معلوم نہیں، مگر وہ لوگ حیران رہ گئے کہ ان کا نشانہ خطا کرگیا۔ یہ اور

بات ہے کہ وہ لوگ پھر بھی باز نہیں آئے۔

یہ تھا مولانا کا مزاج کہ حق کیا ہے، غلط کیا؟ اس کی کھوج کرتے تھے معمولی سے معمولی کام میں اور بڑے سے بڑے مرحلے میں۔ انھوں نے پوری زندگی اسی تلاش و جستجو اور پھر اس کے استحکام پر خرچ کردی۔ اس لیے اپنی اس خصوصیت میں وہ تمام علما میں ممتاز تھے۔

(۵)

مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے، اور ان کی اسی رکنیت کے زمانے میں وہ انقلاب عظیم آیا جس نے دیوبند کی چولیں ہلا دیں اور ممبران شوریٰ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ جشن صد سالہ کے بعد جب عالمی موتمر ابنائے قدیم اور تنظیم فضلائے دارالعلوم کے نام سے دارالعلوم دو گروپوں میں تقسیم ہوگیا تو مولانا نعمانی غیر جانب دار تھے مگر حالات سے پوری واقفیت رکھنا چاہتے تھے۔

مولانا کا ذہن مولانا اسعد صاحب کی طرف سے صاف نہیں تھا کہ وہ سیاسی ہیں، مگر قاری محمد طیب صاحب کی امانت و دیانت سے مطمئن تھے۔ دارالعلوم کی کشاکش کے بعد جب پہلی مرتبہ مجلس شوریٰ ہوئی تو اس مجلس شوریٰ نے چند ایسے فیصلے کیے جو دارالعلوم کے لیے بنیادی اور ضروری تھے مگر اسے دارالعلوم کی انتظامیہ نے پسند نہیں کیا۔ یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ حضرت مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ کو بلانا بند کردیا تو دستور کی دفعات کا حوالہ دے کر خود اراکین نے مجلس شوریٰ طلب کرلی۔ اور وہ مجلس شوریٰ بھی دارالعلوم کے انتظامیہ کو پسند نہیں آئی تو انتظامیہ نے طے کرلیا کہ مجلس شوریٰ اور دستور اساسی دونوں کو منسوخ کر کے ایک اڈہاک کمیٹی مقرر کردی جائے۔ چنانچہ دہلی کے نمائندہ اجتماع نے مجلس شوریٰ توڑ دی اور دستور اساسی منسوخ کر کے اڈہاک کمیٹی کے ممبران کا اعلان کردیا اور دستور کے لیے ایک کمیٹی بنادی گئی۔

دارالعلوم کی صد سالہ زندگی کا سب سے سنگین مرحلہ یہی تھا کہ مجلس شوریٰ نمائندہ اجتماع کے نام سے توڑ دی گئی، اور اڈہاک کمیٹی بنادی گئی مگر اس پر بھی دارالعلوم میں دو گروہ ہوگئے۔ مفتی عتیق الرحمان صاحب آخر آخر تک کہتے رہ گئے کہ مجلس شوریٰ مت توڑیے، مولانا منت اللہ رحمانی نے فرمایا کہ یہ اتنا غلط کام ہوا ہے کہ ہم لوگوں کا منہ دکھانا مشکل ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود یہ

حضرات علمی طور سے حضرت قاری صاحب کے ہمراہ رہے اور وہ شخص جو بالکل غیر جانب دار تھا، وہ 'الفرقان' لے کر مقابل میں آ گیا۔اس نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے میں کسی کی مطلق پرواہ نہیں کی۔اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ملک کو مطمئن کرنا ممکن نہیں تھا۔

آپ دو سال کا الفرقان پڑھیے تو واضح ہو جائے گا کہ مولانا نعمانی کہاں سے چلے تھے، اور کس کس طرح حضرت قاری صاحب کو معطل اور دارالعلوم سے علاحدہ کیے جانے تک کام کرتے رہے اور اس پر آنسو بہاتے رہے کہ حضرت قاری صاحب کے حواریوں نے ان کو کہاں لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔پھر پنچایت، وفود اور ثالثی وغیرہ کی تمام کارروائیاں سامنے رکھ دی ہیں۔ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم کے مسئلے میں حق کیا تھا، غلط کیا تھا؟ اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت قاری صاحب کی حالت بہت قابل رحم بن گئی تھی؟ اور دارالعلوم تقسیم ہو گیا تھا۔

ان حالات میں اچھے اچھوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں مگر مولانا نعمانی صاحب لکھنو یا دیوبند کہیں خاموش نہیں ہوئے۔برابر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔یہ تھا مولانا نعمانی کا مزاج، ان کا موقف اور ان کا کردار عالی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ سب حضرات خدا کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے، سب کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کو پھر جاگیرداری کے چکر سے نجات دلائے۔

(۲)

ہم حضرت مولانا نعمانی کی رحلت کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور تمام متعلقین کو یقین دلاتے ہیں کہ ان شاء اللہ مولانا کے ایصال ثواب کی پوری کوشش کریں گے۔کیوں کہ یہ ان کا ہم پر حق ہے۔اللہ تعالیٰ سب کو صبر و سکون میسر فرمائے اور مولانا مرحوم کو ان کی طویل دینی و ملی خدمات کا بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے۔

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔۱۹۹۷ء

آہ! مولانا محمد عمر پالن پوری

مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کے انتقال کا غم ابھی تازہ تھا کہ مشہور عالم اور داعی و مبلغ مولانا محمد عمر پالن پوری بھی ۲۱ر مئی ۱۹۹۷ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا مرحوم گذشتہ کئی دہائیوں سے تبلیغی جماعت کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تبلیغ وخطابت کی غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ علمی تبحر اور علوم شریعت پر گہری نظر سے بھی نوازا تھا۔ ان کی وفات سے دعوت وتبلیغ کے میدان میں ایک عظیم خلا پیدا ہوگیا ہے اور خاص طور پر جماعت تبلیغ کے لیے یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے مدارج بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور جماعت تبلیغ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

مولانا محمد عمر پالن پوری کو سب سے پہلے میں نے گونڈہ میں دیکھا تھا، جب وہ کلکتہ سے ایک بڑی جماعت کے ساتھ واپس آرہے تھے، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ میرٹھی سربراہ تھے، کلکتہ وغیرہ میں ان کی عمومی اور خصوصی تقریروں نے دھوم مچادی تھی۔ اس لیے کلکتہ کے ملک التجار خان بہادر صاحب کے منیجر یعقوب بھی جماعت میں شریک تھے۔ گونڈہ کے اجتماعات میں مولانا پالن پوری نے تقریریں بھی کی تھیں، اور خوب کی تھیں، اور مولانا کا طوطی بولتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ہاٹا (گورکھ پور) کے بڑے عالمی اجتماع میں دیکھا اور سنا تقریباً ۴۵ر برس بعد۔ اس اجتماع میں ان کی کئی تقریریں ہوئیں، اور وہ تقریریں نہیں تھیں، جادو تھا، ان کا انداز، ان کی گفتگو، ان کا زور بیاں

اوران کی شفقت نے پوری تقریر کو مچھیروں کا مہا جال بنا دیا تھا، جس میں چھوٹی بڑی تمام مچھلیاں سمٹتی چلی آتی ہیں۔ سات آٹھ لاکھ کا مجمع اور بالکل خاموش، حتیٰ کہ دو کانوں پر گپ لڑانے والے لوگ اٹھ کر مجمع میں آ جاتے تھے کہ مولانا عمر نور برسا رہے ہیں۔ اللہ اکبر! ایسی جادو بھری تقریر میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد کسی کی نہیں سنی تھی، یا کبھی کبھی حقانی صاحب کا جوش بیان دیکھا تھا کہ ہزاروں عورتیں بھی دم بخود ہو کر سنا کرتی تھیں کہ حقانی صاحب کیا چٹکلہ چھوڑتے ہیں، کیسی بے صفحہ کی سناتے ہیں، کیا شعر الاپتے ہیں۔

مگر تبلیغی جماعت کو چھ نمبروں میں محدود رکھ کر اس قدر عمدگی سے اپنی دعوت کو عام کرنا، اپنی بات کو دل نشیں بنانا اور ایک بڑے مجاہدے کے لیے کاروبار، گھر دوار، یار و دوست کو چھڑا دینا ایک کرامت سے کم نہیں، مگر اس مجمع میں یہ کرامت ایسی عام تھی کہ لکھنے والے لوگ نام نہیں لکھ پاتے تھے، جب کہ لوگ چلہ، دو چلہ، چار چلہ اور عمر بھر کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ بس ایک علمی تماشہ اور علمی نمونہ تھا، دیکھنے والوں اور سننے والوں کے لیے ایسا جادو بیان مقرر کسی جماعت کے لیے خدا کا انعام تھا، اور اس انعام سے جماعت نے ساری دنیا کو محظوظ و مسرور کر دیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اذان کی گواہی خدا کے سامنے پیڑ پودے دیں گے، تو مولانا محمد عمر کی دعوت کی گواہی ہزاروں شامیانے، لاکھوں انسان، کروڑوں پیڑ پودے، اینٹ اور پتھر دیں گے کہ انھوں نے اللہ کی وحدانیت، رسالت کے پیغامات، دین کی اہمیت اور خدا ترسی کی مثالوں سے انسانی قلوب کو اس قدر بھر دیا تھا کہ وہ دیوانہ وار خدا کی راہ میں چل نکلتے تھے۔ آج وہ شخص دہلی میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ خدا اس پر فردوس بریں کی کھڑکیاں کھول دے۔ نم کنومة العروس

تبلیغی جماعت کی دوسری شخصیت جس نے مجھے ہاٹا کے اجتماع عظیم میں متاثر کیا، وہ مولانا ابراہیم گجراتی تھے۔ بڑے اطمینان و سکون سے بولنے والے، واقعات سے عبرت و بصیرت پیدا کرنے والے مقرر بھی ہیں، خطیب بھی۔ خدا ان کی عمر دراز کرے، جماعت کے لیے روح پرور، تسکین بخش اور اچھے ترجمان ہیں، نیز تبلیغ کے ہر گر سے واقف ہیں۔ تبلیغی جماعت عجیب جماعت ہے کہ جب کام کر رہے ہیں تو متکلم، رہبر اور دعا گو مل کر ایک یونٹ بن جاتے ہیں اور جب کام ختم کر لیتے ہیں تو پھر ہر شخص الگ الگ تاجر، مدرس، کسان، ملازم، مالک، ٹیچر

اور چودھری ہے، اس کام کی مشق کرتے ہیں، جسے جماعت نے سکھایا ہے۔

ایسی جماعت میں جاگیرداری کے تصورات کہاں سے ابھرے؟ اور کہاں سے پہنچیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر حضور ﷺ کے بعد ثقیفہ بن ساعدہ میں انصار و مہاجرین کی تقسیم سے بالاتر ہوکر سب سے بہتر کی تلاش تھی، اور وہ شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے تو آج تبلیغی جماعت اس اسوۂ حسنہ سے کترا کر کیوں نکل پڑی ہے؟ آخر کہاں جائے گی؟ دارالعلوم اور مظاہر علوم جس خاندانی کشمکش اور جاگیرداری کے غار پر کھڑے ہیں، امید تھی کہ تبلیغی جماعت ان کھائیوں کو پار کر کے جماعت کے سب سے بہتر آدمی پر اتفاق کرے گی اور خاندانی لبادے نوچ کر امت مسلمہ کو صحیح سمت سفر دکھا دے گی، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ یہ صحیح ہے کہ جماعت اشخاص سے نہیں اصولوں سے بنتی ہے، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اصولوں کو اشخاص ہی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ اس لیے شخصیت کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بعد اشخاص ختم ہوگئے تو خلافت راشدہ اصولوں کے باوجود منتشر ہوگئی۔ پھر عمر بن عبدالعزیز ابھر آئے تو وہی خلافت راشدہ پھر زندہ ہوگئی، اور دنیا میں جگہ جگہ زندہ ہوتی رہی۔ مگر یہ سب وہیں ہوا جہاں کوئی شخصیت ہوئی اور خیر امت بن کر آئی اور اس نے خلافت علی منہاج النبوۃ قائم کردی۔ چنانچہ امام مہدی یہی کریں گے۔ ہم سمجھتے تھے کہ امام مہدی کا استقبال کرنے والے یہی تبلیغی جماعت کے لوگ ہوں گے مگر جاگیرداری نظام اس کا رخ بدل دے گا۔ کاش اہل اقتدار ان خطرات کا سگنل دیکھ لیتے۔

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکر عمل بن کر غیب کی صدا بن جا

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ۱۹۹۸ء

اسلام کا سچا خادم اٹھ گیا
قاری صدیق احمد صاحب باندوی

زندگی کا پہلا اتفاق ہے کہ میں کچھ کہنے یا لکھنے بیٹھتا ہوں تو جانے کیوں بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے اور آنسو بھی نہیں نکلتے:

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

قاری صدیق صاحب فرشتہ نہیں انسان تھے، اس لیے گزر گئے۔ مگر ایسے انسان تھے جن کو ڈھالنے کے لیے انبیا و اولیا تشریف لاتے تھے، جن کا سانچہ قرآن پاک تھا یا حدیث پاک تھی اور جن کی روح ذکر الٰہی اور فکر امت تھی۔ ان کا چلنا، پھرنا، پڑھنا، پڑھانا، وعظ و تبلیغ اور تعویذ ودعا جو کچھ تھا، نہ پیسہ کے لیے، نہ عزت کے لیے، نہ شہرت نہ اقتدار کے لیے، صرف خدمت کے لیے۔ اور یہ سارے کام بے تکان اور بے پناہ کرتے تھے، صرف آخرت اور شوق قبولیت کے لیے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں، حضور ﷺ کے سامنے رسوا نہ ہونا پڑے، مسلمانوں کا کام ہوجائے۔

میں نے ان کا بچپن نہیں دیکھا، جوانی دیکھی ہے، بڑھاپا دیکھا ہے اور سفر آخرت دیکھ کر حیران ہوں کہ اللہ کی نعمت ہم سے اچانک کیسے چھن گئی۔ جو شخص اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتا تھا، کیا اسے اتنے ہی لمحات عطا کیے گئے تھے۔ اس لیے وہ انھیں دین وایمان پر نچھاور کر کے چلا گیا۔

جانے والے تجھے ہزاروں سلام

انعام الٰہی:

ہم ہر نماز میں اور اس کی ہر رکعت میں ''اھدنا الصراط المستقیم'' کی دعا مانگتے

رہتے ہیں اور ہر دعا میں ’’انعمت علیھم ‘‘ کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے مگر ہم نہیں سوچ پاتے کہ آج ہمارے اردگرد وہ لوگ ہیں جن کو’’ انعمت علیھم‘‘ کہہ کر خدا نے ، ہمارے رسول ﷺ نے ہم سے تعارف کرایا تھا۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قارون کا خزانہ، فرعون کی شوکت، نمرود کا دبدبہ اور شداد کی جنت انعام الٰہی نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے۔ پھر نعمت الٰہی کیا ہے؟ اور اس کے مستحق کون لوگ تھے؟ تو قرآن کہتا ہے:’’من النبیّین والصدیقین والشھداء‘‘ یعنی علم نبوت، اسلامی زندگی، صدیقی کیفیات، اور شہدا کے جذبات انعام الٰہی ہیں۔ وہ انعام الٰہی جن کے لیے قرآن نے شہادت دی ہے کہ:’’الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا.‘‘

یعنی پیغمبر اسلام کو خدا کا سب سے بڑا اور مکمل انعام جو ملا وہ دین اور اسلام کی شکل میں ملا۔ اس لیے صدیق اکبر، فاروق اعظم، عشرہ مبشرہ اور ہزاروں ہزار صحابہ واولیاء اللہ انعام یافتہ تھے اور ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہر زمانے اور ہر ملک میں ان ہی انعام یافتہ حضرات کو اور ان کے نقش قدم کو تلاش کرنا چاہیے اور جب مل جائے تو اس پر چل کر اللہ تعالیٰ کے انعام کا اپنے کو مستحق بنانا چاہیے۔

ہم اپنے علم، یقین، تجربہ اور دیانت کی حد تک جہاں حضرت معین الدین چشتی، حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی ایسے حضرات کو اہل اللہ، اہل دین، اہل اسلام اور اہل صدق وصفا سمجھتے ہیں، وہیں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی، حضرت مدنی جیسے اولیاء اللہ کو بھی الذین انعمت علیھم میں شمار کرتے ہیں۔ اور مولانا وصی اللہ صاحب، مولانا محمد احمد صاحب، شیخ الحدیث صاحب، مولانا انعام الحسن صاحب اور قاری صدیق صاحب کو ان ہی حضرات کی صف میں شمار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دین و خلوص اور اسلام کی دولت نصیب فرمائے۔

غلط مشورہ:

میں نے بے تکلفی کی وجہ سے ایک مرتبہ ان سے کہا اور ان کے حالات اور ان کی پریشانیوں کو دیکھ کر بطور مشورہ عرض کیا کہ’’ قاری صاحب! آپ دوسروں کی رعایت بہت کرتے ہیں، آخر اپنے ساتھ رعایت کیوں نہیں کرتے؟‘‘ قاری صاحب مسکرا کر رہ گئے۔

میں نے دنیاداروں کی لائن کی بہت نفیس بات کہی تھی مگر قاری صاحب آخرت کی لائن پر چل رہے تھے۔ میری گستاخی پر مسکرا کر آگے بڑھ گئے اور لوگوں کے ہجوم، پروگرام کی کثرت، اور تقاضوں کی بھرمار میں ہنستے ہنساتے گزر گئے اور اس طرح گزرے کہ پچھلے ہفتہ دل کی تکلیف کی وجہ سے ایک نرسنگ ہوم میں داخل تھے، ڈاکٹروں نے آرام کا اور نہ بولنے کا مشورہ دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ......مقام سے........صاحب آئے تھے، انھیں اندر بلالیا اور فرمایا کہ لوگ کتنی محبت سے کتنا سفر کر کے آتے ہیں اور میں ان سے سلام دعا بھی نہ کرسکوں، یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تھے قاری صاحب اور یہ تھی محبت کے جواب میں محبت۔

خلوص:

خلوص کے معنی لغت میں لکھے ہیں، امام غزالی کی کتابوں میں اس کا مطلب اور محمل ذکر کیا گیا ہے، قرآن وحدیث میں اس کا معیار اور آخری نشان بتایا گیا ہے مگر موجودہ زندگی میں تلاش کیجیے تو لوگوں کو نہ اس کی حقیقت معلوم، نہ کیفیت، نہ معنی۔ ایک لفظ ہے جس کے کوئی معنی نہیں، ایک پھل ہے جس میں کوئی لذت نہیں، ایک تصویر ہے جس کا کوئی مجسمہ نہیں۔

مگر قاری صاحب سے ملیے، ان سے معاملات کیجیے، یا ان کے ساتھ سفر کیجیے تو خلوص کے معنی نہیں، اس کی گرمی، اس کی لذت بھی محسوس کر سکتے تھے۔ وہ چکھا دیا کرتے تھے اس کی مٹھاس۔

۵۲ء۔۵۳ء کی بات ہے، میں گونڈہ میں ''مدرسہ فرقانیہ'' کا مہتمم تھا۔ وہیں پہلی مرتبہ قاری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ تیسری ملاقات اس وقت ہوئی جب قاری صاحب نے اپنی ٹوٹی پھوٹی مسجد میں اپنے گھر پر چند لڑکوں کو فارسی، عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور پھر ہتھورا سے گونڈہ کا کئی سو میل کا سفر کر کے انھیں لائے اور میرے سپرد کر کے چلے گئے کہ انھیں پڑھاؤ۔ دوسرے سال پھر چار بچوں کو لے کر آئے اور پہنچا کر چلے گئے۔ ہم پڑھاتے ہیں تو اس کی فکر نہیں رکھتے کہ پھر اس کے بعد وہ کہاں جائے گا؟ اور کیا کرے گا؟ اور قاری صاحب کا خلوص باپ کی طرح نہ صرف مستقبل کے لیے اچھا مشورہ دیتا ہے بلکہ خود انھیں ساتھ لے کر اتنی لمبی مسافت پر پہنچا آتا ہے۔ صرف اس وجہ سے پہنچا آتا ہے کہ بچوں کو وہ جس طرح کی تربیت دینا چاہتے تھے، ان

کے نزدیک وہ ''مدرسہ فرقانیہ'' ہی میں ہوسکتی تھی۔ اس لیے ازراہ محبت واخلاص وہاں لاکر پہنچائے۔ پھرلڑکے پڑھ کر گئے اور وہیں بڑی کتابیں پڑھانے لگے اور مولانا نفیس اکبر جیسے لوگ ساتھ مل گئے۔

ایک بار ہنسور ضلع فیض آباد جلسے میں جار ہے تھے، راستے میں ٹانڈہ سے گزرے تو وہاں کا مشہور مدرسہ'' کنزالعلوم'' سامنے آیا۔ اتر کر اندر گئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ سب لوگ قاری صاحب کو دیکھنے ہنسور گئے تھے۔ قاری صاحب نے مدرسہ کے لیے صحن میں کھڑے ہوکر دعا فرمائی اور پھر ہنسور تشریف لے گئے۔ یہ ہیں خلوص کے معنی ومطلب کہ بے غرض، بے نمود صرف محبت اور للٰہیت کی وجہ سے کوئی کام کردیا جائے۔

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ میں مسجد بن گئی ہے، کسی موقع سے آکر دعا کردیجیے۔ سن کر چلے گئے، اس کے کچھ دنوں کے بعد بہار سے لوٹے تو گورکھپور میں کوئی پروگرام تھا۔ حکیم (مولانا وصی احمد) کے یہاں آئے اور سیدھے دارالعلوم رسول پور مسجد میں گئے۔ دو رکعت نماز پڑھی، دعا کی اور فوراً ہی واپس چلے گئے۔ نہ چائے، نہ بسکٹ، نہ پانی، نہ مصافحہ، نہ اتنی مہلت کہ سب لوگوں کو معلوم ہوسکے کہ قاری صاحب آئے ہیں۔ واپس گئے تو طبیعت خراب ہوگئی، کان پور میں بھرتی ہوگئے۔ میں دہلی سے واپس ہونے لگا تو کان پور اتر کر نرسنگ ہوم میں گیا۔ کسی نے خبر دی تو فوراً بلالیا، بہت خوش ہوئے اور آتے وقت کہنے لگے کہ تم نہیں تھے مگر میں تمہاری مسجد میں ہوآیا۔ اللہ اکبر!

ایک معمولی گذارش پر اتنا خیال کون کرے گا؟ اس لیے یہ باتیں مدتوں یاد رہیں گی، اور آمادہ کرتی رہیں گی کہ اسی نقش قدم پر چلا جائے۔

شفیق استاد:

ہتھورہ کا تیسرا سال تھا، ایک صاحبزادے نے تنگ کردیا تھا، اس لیے سوچا کہ قاری صاحب کے'' کالے پانی'' پہنچادوں۔ ممکن ہے وہاں سدھر جائے۔ یہ تھے حضرت قاری عبد الوہاب صاحب گونڈوی کے بڑے صاحبزادے حافظ عبدالتواب سلمہ۔

وہاں مشکل سے پہنچا، دیکھا تو بہت چھوٹی سی مسجد، ٹوٹی پھوٹی اور اس میں ۱۰؍۱۲ بچے پڑھ رہے ہیں۔ سامنے کسی کمرے میں رہتے ہیں، فجر کے وقت سے مغرب کے بعد تک پڑھتے ہیں۔ باہر سے لکڑیاں توڑ کر لاتے ہیں، اپنے اپنے ہاتھ سے چولھا جلا کر کھانا پکاتے ہیں، پھر پڑھتے ہیں۔ اس بے سروسامانی کو دیکھ کر وحشت ہوئی مگر دن بھر رہا تو نظر آیا کہ بچوں میں نہ مایوسی ہے، نہ گھبراہٹ، نہ اداسی۔ ہنستے کھیلتے بچے، پڑھتے اور یاد کرتے بچے۔ فجر سے ۹؍ بجے تک پڑھنا، پھر لکڑی توڑ کر لانا، پکانا اور پھر کھا پی کر پڑھنے میں لگ جانا اور قاری صاحب کوئی بزرگ نہیں، قاری صاحب تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کا باپ موجود تھا۔ کس کی روٹی کس طرح پک رہی ہے؟ کس کا چاول کیسے پک رہا ہے؟ اور کس بچے کو کیا ضرورت ہے؟ کیسے پوری ہوگی؟ انھیں ہر وقت احساس رہتا تھا۔

تب سمجھ میں آیا کہ قاری صاحب نے اس بے سروسامانی میں بچوں کو کس طرح جمع کر رکھا ہے اور ان کو محنت ومشقت کا عادی بنا دیا ہے۔

چنانچہ عبدالتواب وہاں پڑھتا رہا، اور جو وہاں پہنچ گیا وہاں سے پڑھ کر نکلا، اور جب نکلا تو اس کے پاس علم بھی تھا، دین بھی، اخلاق اور سب سے انمول یہ کہ محنت ومشقت کا عادی بن کر نکلا۔

اس توجہ، اس شفقت اور اتنی محنت کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ ٹوٹا پھوٹا مدرسہ ایک عظیم الشان درسگاہ بن گیا۔ چنانچہ جب قاری صاحب پچھلی جمعرات کو وفات پا گئے اور ہم لوگ رات میں ہتھورا پہنچے تو وہاں ایک علمی قلعہ کھڑا ہے، دومنزلہ، کشادہ وسیع اور مضبوط قلعہ۔ خدا اسے قبول فرمائے۔ (آمین) اور ایسے رجال کار مہیا کرے جو اسی شفقت، اسی محنت اور خلوص سے طلبہ کی خدمت کر سکیں، علم کی خدمت کر سکیں۔ دیکھنا ہے قاری صاحب کے شاگرد اپنے استاد کے نقوش قدم کو کہاں تک اجاگر کرتے ہیں؟ اور انھیں کس طرح زندہ رکھتے ہیں؟

ترک مالایعنی:

قاری صاحب بہت سادہ مزاج انتہائی سیدھے سادے، مگر بیدار مغز تھے۔ اس لیے ترک مالایعنی کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، اتنا اہتمام کہ ہم جیسے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ

دارالعلوم دیوبند جیسا علم کا ادارہ اوراس کی سب سے مقتدر مجلس شوریٰ تھی، جس میں ملک کے مشاہیر علما وفضلا اور دینی حلقوں کے ممتاز لوگ منتخب کیے جاتے تھے۔اس مجلس کی ممبری ایک دنیاوی اعزاز اور دینی خدمت کا اچھا موقع ہے۔مجلس شوریٰ نے حضرت گنگوہی کے وقت سے دارالعلوم کا ایک مزاج بنایا اوراسے سنبھالے رکھا تھا۔

قاری صاحب کو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اس وقت ممبری کے لیے پیش کیا جب دارالعلوم میں گروپ بندی شباب پر تھی لیکن حضرت قاری صاحب کے نام پر پوری مجلس شوریٰ مطمئن تھی۔وہ بحیثیت ممبر مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے رہے، کبھی کبھی علما کو خطاب بھی فرمایا، لیکن چند سالوں کے بعد جب دارالعلوم مولانا اسعد صاحب کی تحویل میں چلا گیا اور پورے نظم وضبط سے چلنے لگا تو معلوم ہوا کہ قاری صاحب نے مجلس شوریٰ سے استعفا دے دیا۔میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ''وہاں وقت بہت ضائع ہوتا ہے، ایک گھنٹے دو گھنٹے کا کام اور دو دو دن ضائع کرنے پڑتے تھے۔'' خود مولانا اسعد صاحب نے سنا تو ان کو عبرت ہوگئی مگر قاری صاحب ہمیشہ کے لیے یکسو ہو چکے تھے، یکسو رہے۔

اسی طرح پچھلے سال جمعیۃ علمائے ہند نے بمبئی میں شاندار اجلاس کیا اور اس میں بڑے بڑے نیتا اور وزرا بھی شریک ہوئے۔میں اس دور میں بمبئی گیا ہوا تھا، دیکھا تو بہت مخلصانہ کوشش کی جارہی تھی کہ حضرت قاری صاحب کو اجلاس میں لایا جائے۔چنانچہ بمبئی سے گجرات تک کوشش جاری رہی مگر قاری صاحب سیاسی جلسوں میں نہ جاتے تھے، نہ اس میں شریک ہو سکے، نہ ان کو شریک ہونے کی کوئی ضرورت تھی۔ بلانے والوں کا بھی مقصد ان کی شخصیت نہیں، ان کی شہرت تھی۔اس طرح میں نے بارہا دیکھا کہ وہ دیکھ سن کر فیصلہ فرماتے تھے۔جب سفر یا شرکت پر آمادہ ہوتے تو جیسے ہی ضرورت پوری ہوتی تھی دوسرے تقاضوں پر روانہ ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ بستی تشریف لے آئے، میں حاضر خدمت ہوا، بستی سے کچھ دور ایک مدرسہ پر جانا تھا۔ ہم لوگ بھی ساتھ ہو لیے۔مغرب کے بعد تھوڑی دیر ہمارے ساتھ چائے پانی کرتے رہے، اس کے بعد مجلسی گپ شپ کی جگہ سے وہ اٹھے اور سامنے کے دوسرے برآمدے میں جا کر ایک مصلیٰ پر بیٹھ گئے اور تسبیح پڑھنے لگے۔تب مجھے سمجھ میں آیا کہ'' **فسبح بحمد ربک واستغفرہ**

انه كان توابا'' کا کیا مطلب ہے؟ اور ذکر الٰہی کا کیا درجہ ہے؟ اور اس کے لیے ترک مالا یعنی کی کتنی ضرورت ہے؟

بے تکلفی:

گورکھ پور کے حکیم وصی احمد صاحب اور قاری صاحب سہارنپور میں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے، اس لیے بچپن سے بے تکلفی تھی۔ اس لیے گورکھ پور سے جب گزرتے تھے تو حکیم صاحب کے یہاں ضرور تشریف لاتے تھے اور عموماً آمد رات ۱۲/ بجے، ۴/ بجے، یا ۳/ بجے ہوا کرتی تھی۔ کسی گاڑی سے اترے اور گھر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹائی، دیکھتے تو قاری صاحب۔

چنانچہ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ رات میں ناوقت جب کبھی کسی نے کنڈی بجانے کی جرأت کی تو وہ قاری صاحب ہوتے تھے۔ میں کہہ دیا کرتا تھا کہ صوفی صاحب آگئے اور ہوتے بھی تھے صوفی صاحب ہی۔

آئے اور کہا کہ روٹی لاؤ، سالن لاؤ، اور جو کچھ ہوتا جس طرح ہوتا، عورتیں حاضر کر دیا کرتی تھیں، تب جا کر .... آ سکتا تھا، بے تکلف تھے تو اس قدر۔ چند مہینے ہوئے کوپا گنج جلسے میں تشریف لائے، ایک بجے جلسے سے فارغ ہوئے، صبح کو دوسرا پروگرام تھا، کہنے لگے کہ گاڑی ہو تو بلتھرا جا کر....... صاحب سے مل آتا ہوں۔ چنانچہ وہاں گئے اور فوراً واپس آئے، کوپا گنج میں فجر کی نماز پڑھی۔

شوق مطالعہ:

ایک جلسے میں آئے اور موقع ملا تو کوئی کتاب ساتھ تھی، مطالعہ شروع کر دیا۔ دیکھا تو شیخ زادہ کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ آج کل طلبہ کو بیضاوی پڑھاتے ہیں۔ کہاں ہتھورا اور کہاں گونڈہ بستی کے اسفار اور پھر مطالعہ کی گنجائش؟ مگر وہ ہر جگہ کتاب ساتھ رکھتے تھے اور اس میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ہم لوگوں کو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہم سے مشغول کیوں نہیں رہتے؟ اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جو وقت مل گیا اسے گپ شپ میں کیوں ضائع کروں؟

جز یاد دوست ہرچہ کنی ضائع است

جوحضرت قاری صاحب کے سفر درسفر سے واقف ہیں، ان کی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ قاری صاحب ملاقات، تعویذ، تقریر، آرام اور سفر کے اندر سے کس طرح سے وقت نکال کر لکھنے اور پڑھنے کی مشق جاری رکھتے تھے اوران کی اسی مشاقی کا اثر ہے کہ انھوں نے ’’سلم العلوم‘‘ جیسی مشکل کتاب کوحل کر دیا۔ ’’شرح جامی‘‘ کی مشکلات حل کر دیں اور ایسے ایسے جانے کتنے رسالے اور کتابچے لکھ ڈالے۔ ایسے کتابچے جن کے لکھنے کے لیے بڑے طویل مطالعہ اور بہت یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تقریروخطابت:

تقریر کے لیے عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حفظ الرحمان، مولانا ابوالوفا اور قاری محمد طیب صاحب مشہور ومعروف ہیں، مگر قاری صدیق صاحب عجیب مقرر تھے، برجستہ بولتے تھے، بے تکان بولتے تھے، اس میں نہ شعر، نہ چاشنی، نہ قرأت کا زور، اس کے باوجود بلا کی چاشنی تھی۔ جو کچھ کہتے تھے قرآن وحدیث کی روشنی میں کہتے تھے اور جب جلال آ جاتا تھا تو اچھے اچھوں کو پسینہ آ جاتا تھا مگر کہنے کا انداز خوب تھا، بہت پیارا، بڑا دل نواز۔

ایک مرتبہ بھیونڈی میں تقریر کرنے آئے، مدرسہ کا جلسہ تھا، آدھی رات کا وقت تھا مگر لوگ شوق میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے کہ ’’آپ لوگوں نے اجلاس کو خوب سجایا ہے، محنت بھی کی ہے، پیسے بھی لگائے ہیں اور خوب لگائے ہیں۔‘‘ تعریف کر کے فرمایا کہ ’’اس سجاوٹ اور ٹھاٹ سے اگر کچھ پیسے بچ گئے ہوں تو غریب مدرسہ کو بھی دے دیجیے، یہاں بچے دین پڑھتے ہیں، دین سیکھتے ہیں، آپ کو دعائیں دیں گے۔‘‘ اتنی سی بات پر بیٹھنے والوں کو اتنی غیرت آئی کہ لوگوں نے چندہ دینا شروع کر دیا اور تقریر شروع ہوتے ہوتے ۲۰؍ہزار روپے برس گئے۔

ایک مرتبہ بستی میں فرمایا کہ ’’قرآن کا دعویٰ ہے ’**کل نفس ذائقة الموت**‘ کہ اچھے ہوں یا برے، امیر ہوں یا غریب، تندرست ہوں یا بیمار، مرنا سب کو ہے، اور مرتے بھی سبھی ہیں۔ تم بتاؤ کس طرح مرنا چاہتے ہو؟ مرنے کی کیا تیاری کر رکھی ہے،؟ گھر والوں کو کیا تیاری کرائی ہے؟ اگر نہیں کی ہے تو اب تیاری کرو، کچھ پتہ نہیں کہ موت کب آئے؟ کہاں آئے؟ جھونپڑے میں مرو

یا کوٹھی میں مرو، مرنا بہر حال ہے۔ خدا صرف یہ پوچھے گا کہ میرے رسول کی اتباع کر کے آئے ہو یا اس کے خلاف چل کر آئے ہو؟ سوچ لو کیا جواب دو گے۔''

قاری صاحب کی تقریر میں تلقین کا پہلو بہت ہوتا تھا۔ اس لیے محبت والے دلوں میں ان کی بات تیر کی طرح پیوست ہو جاتی تھی اور زندگی میں ہلچل ڈال دیتی تھی۔

ایک مرتبہ لوگوں کے ہجوم سے گھبرا کر اسٹیج پر آئے اور خوب جھاڑا کہ تم لوگ مجھ پر کیوں ٹوٹے پڑتے ہو؟ آخر یہاں بڑے علما تشریف رکھتے ہیں، شیخ الحدیث بیٹھے ہوئے ہیں، تم ان سے مصافحہ بھی نہیں کرتے اور میرے اوپر گرے پڑتے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟ اگر علم کی محبت ہے تو علما موجود ہیں، حدیث کی محبت ہے تو شیخ الحدیث موجود ہیں مگر ان حضرات کی تم کو کوئی قدر نہیں ہے۔ یہی تمہاری تباہی کا سبب ہے۔ تم علما کو چھوڑ کر میرے اوپر اس لیے گرتے ہو کہ میں تعویذ لکھ دوں گا، مگر علما کی ناقدری تمہیں تباہ کر دے گی۔

روحانی خلا:

فون پر مولانا ہاشمی سابق ایم پی سے رابطہ ہوا تو بتایا کہ باندہ سے واپس ہوا ہوں، بڑا افسوس اس کا ہے کہ جب لوگ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو قاری صاحب کے پاس دوڑے جاتے تھے کہ دعا فرمائیں اور وہ عوامی آدمی تھے فوراً دعا فرما دیتے تھے، لیکن اب ان کے بعد لوگ کہاں جائیں؟ میں نے کہا بالکل اندھیرا چھا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالحمید سے قاری صاحب کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایسے حضرات امت میں رہتے ہیں تو امت عذاب الٰہی سے محفوظ رہتی ہے۔ تباہی اور بربادی سے ان کی پناہ میں رہتی ہے۔ قاری صاحب کے بعد وہ پناہ ختم ہوگئی اور یہ سب سے بڑا نقصان ہے۔

پروفیسر صاحب کی بات پر مجھے وہ آیت یاد آئی جس میں خدا نے مکہ میں عذاب نازل نہ ہونے کی وجہ بتائی ہے ''**وما کان اللہ لیعذبهم و انت فیهم**'' خدا کی طرف سے ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ کی موجودگی میں بھی ان کی بستی پر عذاب آجائے۔ یعنی ان کی وجہ سے کفار و فجار کو بھی عذاب الٰہی سے پناہ ملی رہتی ہے۔

آخرت کا سفر:

ایک ہفتہ پہلے لکھنؤ سے شفا پا کر باندہ پہنچے تھے کہ اپنے تمام کام حسب سابق کرنے لگے تھے۔ ان کو یاد بھی نہیں رہا کہ وہ دل کے دورے سے چھٹی پا کر آئے ہیں۔ ہفتہ عشرہ آرام کر لیتے، بدھ کی شام کو ہردوئی جانا تھا۔ پیر طریقت مولانا ابرارالحق صاحب کے یہاں مدعو تھے، کہنے لگے ابھی وقت ہے لاؤ کتاب پڑھ لو۔ سلم العلوم جیسی تہ دار کتاب پڑھائی، پھر بھی وقت باقی رہا۔ بخاری منگائی اور پڑھانا شروع کر دیا۔ ظہر بعد کہہ رہے تھے کہ آج موت کے آثار معلوم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ سبق پڑھاتے پڑھاتے طبیعت سست ہوگئی، اس کے علاج کے لیے فرمایا لاؤ پھر وضو کر لیں۔ وضو کے درمیان سردی لگی، لیٹ گئے، بخار چڑھا، پھر قے ہوئی، پھر فالج کا اثر ہوا۔ کان پور جاتے جاتے طبیعت اور خراب ہوئی۔ رات کے ۲ ر بجے وہ لکھنؤ کے راستے میں بے ہوش ہو گئے اور لکھنؤ پہنچ کر ۱۰ ر بجے دنیا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موت کے آثار کا غالباً یہ مطلب تھا کہ وہ موت کے فرشتے نظر آنے لگے جو باندہ سے لکھنؤ لے جا کر وہاں سے سفر آخرت کرانے کا حکم پا کر آ گئے تھے اور اس کے اثرات محسوس ہو گئے تھے۔

قرآن کا صریح حکم ہے کہ موت کا وقت اور اس کی جگہ مقرر ہے۔ اس لیے انھیں لکھنؤ اسپتال پہنچا دیا گیا اور اپنے مالک کے دربار میں چلے گئے۔ وہاں سے ایسے چلے گئے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں جب رات کو تھوڑا پہنچا اور سلام کیا تو کوئی جواب دینے والا نہیں ملا۔ جواب تو ضرور آیا ہوگا مگر میں ابھی سننے کے قابل نہیں ہوں، اس لیے انتظار میں ہی رہ گیا اور ممکن ہے اہل اللہ کی روحوں نے گھیر لیا ہو، اس لیے ادھر توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی ہو۔ خدا مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا۔

موضوع زندگی:

مولانا علی میاں صاحب کا موضوع تاریخ اسلام تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا موضوع زندگی اسلام کی حقانیت ثابت کرنا تھا، مولانا حفظ الرحمان صاحب کا موضوع مسلمانوں کا سیاسی استحکام تھا لیکن قاری صاحب کا موضوع کیا تھا؟ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، ان کا

موضوع تھا خدمت اور صرف خدمت۔ اسلام کی، مسلمانوں کی، علم کی۔ اس خدمت میں ان کے خلوص، ان کی شخصیت اور ان کی بے پناہ محنت نے جادو بھر دیا تھا۔ پھر ہر طبقے کے اکابر کا احترام اور عزت افزائی نے دلوں کو ان کی محبت سے معمور کر دیا تھا۔ وہ جدھر گئے سر آنکھوں پر بیٹھائے گئے، جس مٹی کو چھو دیا سونا بن گئی، جس سمندر میں کود پڑے، پایاب ہو گیا، جدھر سے گزر گئے زمین وآسمان جھکنے لگے۔ علما نے سر پر اٹھا لیا، تاجروں نے مال و دولت نچھاور کر دی، لوگوں نے قدم چوم لیے، عوام نے دل کھول کر اس میں مجسمے نصب کر لیے۔ اس لیے جب وہ چلے گئے، بوڑھے اور جوان رو پڑے، عورتیں اور بچے سر پیٹ کر رہ گئے۔ علم و عمل دعائیں دینے لگے، ملک بھر سے لوگ ان کی قبر پر مٹی ڈالنے کے لیے بڑی بے تابی سے اٹھ کر آ گئے، وہاں دیکھا تو:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ۱۹۹۷ء

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے
قاری صدیق احمد صاحب باندوی

دلی محبت:

قاری صاحب سے لوگوں کو کتنا تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس عجیب وغریب واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب قاری صاحب مفلوج ہوکر ہتھورا سے چلے تو ''سحر نرسنگ ہوم'' لکھنؤ کو اطلاع دے دی گئی۔ پھر کانپور آئے تو مفلوج تھے مگر ہوش میں تھے۔ ان کے معالج نے ایک اور علاج کرنا چاہا مگر لکھنؤ والوں کی رائے ہوئی کہ انھیں لکھنؤ پہنچا دیا جائے۔ معالج نے بھی فالج کے خصوصی حملے کی وجہ سے لکھنؤ جانا مناسب سمجھا۔ راستے میں اناؤ سے آگے قاری صاحب پر دوسرا حملہ ہوا تو بے ہوش ہوگئے اور اسی حال میں سحر نرسنگ ہوم میں اتارے گئے۔ غالبًا ساڑھے تین بجے رات کا وقت تھا۔ ڈاکٹر بے چارہ اپنی محبت اور تعلق خاطر کی وجہ سے انتظار کر رہا تھا اور پورا اسپتال چشم براہ تھا۔ قاری صاحب پہنچے تو انھیں سب سے پہلے لے جاکر ایکسرے لیا گیا، ڈاکٹر نے ایکسرے رپورٹ ہاتھ میں لی اور کھڑے کھڑے زمین پر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو کہنے لگا، افسوس اب قاری صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ دوسرے حملے پر دماغ میں بہت خون بھر گیا تھا، اس لیے بچنے کا بہت کم امکان تھا، یعنی خدا کا فیصلہ آچکا تھا، فیصلے کی تعمیل دھیرے دھیرے مکمل ہوگئی اور قاری صاحب باغ رضوان کی طرف کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

بے نفسی:

الٰہ آباد اسٹیشن پر ایک ٹی ٹی نے بتایا کہ ہم تین آدمی قاری صاحب سے ملنے چلے، دو ٹی ٹی ایک گارڈ۔ ہتھورا پہنچے، سڑک خالی تھی، نہ کوئی سواری، نہ دوکان، نہ آدمی۔ اتفاق سے ہماری بس

سے ایک آدمی اترا تو اس سے راستہ پوچھ لیا گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں سے پیدل ہی مدرسہ تک جانا ہوگا مگر مشکل یہ تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ ایک بریف کیس بھی تھا۔اس بے چارے کو کچھ ترس آیا، اس نے کہا لائیے میں سامان لے لوں۔اس نے سر پر برف کیس لے لیا اور چاروں آدمی ہتھورا کے لیے چل دیے۔آدھ گھنٹہ کے بعد مدرسہ دکھائی دیا، طلبہ نے ہمیں دیکھا تو دوڑ پڑے، اور ہمارے آدمی سے سامان بھی لے لیا۔ہم سمجھے ان کا کوئی عزیز ہوگا مگر جب یقین ہوگیا کہ یہ دیہاتی وہی شخص ہے جس کی زیارت کے لیے ہم گارڈ صاحبان حاضر ہو رہے ہیں تو ہم لوگ پسینہ پسینہ ہوگئے، زمین پھٹ جاتی تو ہم دھنس جاتے مگر زندگی بے حیا ہے۔کیا کہیے اتنا بڑا عالم، ایسا بزرگ، اور اس قدر مشہور انسان اور اتنا بے نفس۔اللہ اکبر!

اظہار محبت:

ہم لوگ قاری صاحب کے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے بستی سے گورکھپور آرہے تھے، خلیل آباد پہنچے تو بائی پاس کے اوپر مولانا سلامت اللہ صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر ہدایت اللہ پرکٹس کرتے ہیں۔ان کے یہاں عشا بعد پہنچے، وہ محمد احمد صاحب قاسمی کے بہنوئی ہیں۔اس لیے چائے بنوائی گئی۔اور چل دیے تو انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ بڑی رات میں قاری صاحب یہاں سے گزر رہے تھے، انھیں میرا گھر معلوم تھا، گاڑی روک کر آئے، زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا کہ گھر بھر کے لوگ جاگ گئے۔میں آنکھ ملتا ہوا آیا اور پوچھا کون ہے؟ پھر دروازہ کھولا تو دیکھا استاذ محترم قاری صاحب کھڑے تھے۔معانقہ فرمایا، خیریت پوچھی اور الٹے پاؤں واپس ہوگئے، گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔میں نے بہت کہا چائے پی لیجیے، پانی پی لیجیے، تھوڑی دیر بیٹھ جائیے مگر ایک نہیں سنی اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ صرف تمھیں دیکھنے کے لیے رک گیا تھا، دیکھ لیا اور بس۔اسی والہانہ محبت کا اثر تھا کہ ہم لوگ باندہ جانے لگے تو وہ بھی تیار ہو کر ساتھ ہو لیے اور ہتھورا تک گئے تھے۔

غریب دوست:

دارالعلوم بستی آئے ہوئے تھے، رات کو میں بھی پہنچ گیا۔حسب عادت کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا، پروگرام پوچھا۔میں نے عرض کیا کہ گورکھ پور ہی جانا ہے، انتظام کار لوگوں نے واویلا

کیا کہ ایک ہی گاڑی ہے اور وہ بھی بھر گئی۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ نہیں یہ میرے پاس بیٹھ جائے گا۔ تین بجے اٹھے، تہجد پڑھی، چائے پی اور روانہ ہوگئے۔ مجھے امبیسڈر میں آگے بیٹھالیا، اس میں قاری صاحب کو دقت ضرور ہوئی مگر ان کی بشاشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چنانچہ جب گورکھ پور سے فاضل نگر جانے لگے تو پھر تلاش کرایا کہ افضال کہاں ہے؟ مگر لمبا سفر تھا، اس لیے بیٹھا ضرور مگر ساتھ نہیں بیٹھا کہ سفر میں زحمت ضرور ہوگی اور گاڑیاں بھی دو عدد تھیں۔ وہاں جا کر دیکھا تو ایک ٹھیٹ دیہات تھا، پھوس اور چھپر کا مکان، وہ لوگ بھی زیادہ تر دیہاتی اور مولوی بے چارہ معمولی حیثیت کا تھا مگر اس کے چہرے پر ایمان کا نور اور تقوی کا اثر تھا، اور اتنا قاری صاحب کے لیے بہت تھا۔ ان مولوی صاحب کے صاحبزادے کی بارات میں کچے راستے پر چالیس کلومیٹر دیہات میں گئے اور پھر واپس آکر ٹرین پکڑی، کانپور چلے گئے، دوپہر میں تھوڑی دیر آرام کیا، اور بس۔

میری تلاش:

دیوبند کے انقلاب کے بعد میں امروہہ سے دہلی آگیا اور محرم کی مجلس شوریٰ کے موقع پر دیوبند آیا تھا۔ ادھر حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے گورینی کے اپنے مدرسہ میں دورۂ حدیث کی ابتدا کی تھی۔ انھیں کسی حدیث پڑھانے والے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے سہارن پور اور جلال آباد کہلایا تھا، دیوبند میں بعض اساتذہ سے کہا تو انھوں نے میرا نام بتا دیا۔ پھر مولانا نے قاری صاحب سے ذکر کیا اور میرے نام کی بات بھی کہی تو قاری صاحب نے کہا کہ آیئے میرے ساتھ چلیے۔ میں ظہر بعد مولانا اسعد صاحب کے مہمان خانے میں تھا، پوچھتے ہوئے آئے اور دونوں حضرات بیٹھ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ قاری صاحب کے ساتھ مولانا عبدالحلیم صاحب کیسے تشریف لائے؟ جن سے میری کوئی بے تکلفی نہیں ہے۔ قاری صاحب نے بعد تمہید کے فرمایا کہ گورینی میں دورۂ حدیث قائم ہوا ہے، ایک مدرس کی ضرورت ہے، تم چلے جاؤ۔ پھر مولانا نے فرمایا اگر مستقل نہیں تو چھ ماہ کے لیے آجایئے۔ میں نے سمجھا کہ یہ چھ ماہ دفتر اہتمام کا احتیاطی جملہ ہے۔ پھر قاری صاحب نے کچھ فرمایا، جس سے میں نے ہاں کرلیا، اور گورینی پہنچ کر بخاری جلد ثانی، شرح عقائد، اصول الشاشی، ہدایۃ النحو جیسی کتابیں پڑھانے لگا۔ صدر مدرس مولانا محمد حنیف

صاحب تھے، جو بچپن کے جان پہچان والے تھے۔ اصرار کے باوجود میں بخاری جلد اول نہیں لی، اوران کے ہمراہ سکون سے کام کرتا رہا۔شعبان آیا تو چھٹی سے ایک روز پہلے مولانا عبدالحلیم صاحب اور مولانا محمد حنیف صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا کہ 'ہم نے تو آپ سے چھ ماہ کے لیے کہا تھا، اب ہماری خواہش ہے کہ آپ مستقل یہیں خدمت کریں۔' میں نے پھر ہاں کرلیا اور مسلسل آٹھ سال جو خدمت ہوسکی، کرتا رہا، پھر گورکھ پور چلا آیا۔

خود شکنی:

ابھی چند مہینہ پہلے حضرت قاری صاحب الٰہ آباد گئے تھے تو مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر جہاں مولانا کی مجلس ہوتی تھی، وہاں پہنچے اور حضرت کی نشست گاہ کے پاس ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ قاری مبین صاحب نے بہت اصرار کیا کہ یہاں تشریف لائیے، وہاں بیٹھیے، لیکن قاری صاحب نے فرمایا کہ میں حضرت کے وقت میں جب آتا تھا، تو یہیں بیٹھتا تھا، اور وہیں بیٹھے رہے اور جب وہاں سے واپس جانے لگے تو پروفیسر عبدالحمید صاحب نے دیکھا کہ قاری صاحب نے قاری مبین صاحب کا ہاتھ چوم لیا کہ شیخ کے داماد ہیں۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''من تواضع للہ رفعہ اللہ'' (ابوداؤد) اسی تواضع نے ان کو چمکا دیا۔

دعا:

قاری صاحب باندہ سے ہتھورا شام کو پہنچے، کئی دیہاتی کھڑے تھے اور ادھر کے دہقانی عموماً بدو ہوتے ہیں۔ قاری صاحب مدرسہ کی طرف چلے تو انھوں نے ڈانٹ کر روکا اور جھولا چھین لیا۔ قاری صاحب نے جھولا انھیں سپرد کر دیا اور چند قدم چل کر رومال بچھایا اور سڑک کے کنارے دو رکعت نماز پڑھنے لگے، پھر دعا کی اور مدرسہ روانہ ہو گئے۔ تب ان لٹیروں نے پھر آواز دے کر روکا، انھیں جھولا واپس کیا اور قاری صاحب سے بہت معافی مانگ کر واپس گئے۔ ان کمبختوں کو عمر بھر سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ مال لوٹ لینے کے بعد گھبراہٹ کیوں ہوئی؟ اور اتنی ہوئی کہ مال واپس کر دیا اور معافی مانگی۔ مگر بات یہ تھی کہ قرآن نے جو فرمایا ہے کہ ''واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ''، یعنی صبر اور نماز کے ذریعہ خدا کی مدد مانگا کرو، تو یہ خدا کی ہدایت کا مظاہرہ تھا کہ قاری

صاحب نماز میں مشغول ہوگئے، دعا میں لگ گئے تو خدا ان کی مدد کر کے لٹیروں کے دل دہلا دیے۔ اس طرح فوراً اعانت بھی ہوگئی۔ یہ ہے صبر اور نماز کی اصل طاقت۔

بددعا:

باندہ ایک جنگلی علاقہ ہے، اس لیے لوٹ مار، قتل، چوری ان کے یہاں ہنر سمجھا جاتا ہے اور قابل فخر چیز ہے۔ اور اس کے لیے پولیس والے ہی کمیشن پر کام کراتے ہیں تو اس میں رکاوٹ کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قاری صاحب کو چوروں، لٹیروں اور ڈاکوؤں سے بہت واسطہ پڑتا تھا۔ کیوں کہ وہ عموماً رات میں ہی کہیں سے واپس ہوتے تھے اور رات چاہے آدھی ہو یا تہائی، بے دھڑک سفر کر لیتے تھے۔

پچھلے سال رات میں کہیں سے جیپ میں آ رہے تھے، میدان میں رات کے وقت ڈاکوؤں نے روکا، جیپ رک گئی۔ قاری صاحب نے ان سے پوچھا، تم ہمارا مال چاہتے ہو، یا جان؟ اگر مال چاہتے ہو تو مال یہ ہے، سارے جھولے وغیرہ ان کے سپرد کر دیے۔ ان میں کپڑے بھی تھے، روپے وغیرہ بھی، اور سب لوگ جیپ سے ہتھورا چلے گئے، خاموش مگر حیران۔

صبح کو جیپ وہاں سے گزری تو دیکھا کہ جہاں سامان سپرد کیا تھا، وہیں سارا سامان پڑا ہے اور ڈاکو چپ چاپ کھڑے ہیں، جو رات ہی سے کھڑے رہ گئے تھے۔

اس واقعہ کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں مگر ایسا اس وجہ سے ممکن ہو سکا کہ قاری صاحب نے وہ آیت ان پر پڑھ کر دم کر دی ہوگی جو حضور نے ہجرت کے وقت تیغ بردار جوانوں پر دم کر دی تھی۔ آپ نے کنکریاں اٹھائیں، ان پر پڑھا ''**وجعلنا من بين ايديهم سدا ومن خلفهم سدا فاغشيناهم فهم لا يبصرون** '' اور ان نوجوانوں پر پھینک دیں، وہ دم بخود کھڑے رہ گئے اور ان کے درمیان سے چل کر اللہ کے رسول پار ہو گئے۔ انھیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ اندر سے چلے گئے۔ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''**وما رميت اذ رميت ولكن الله رمىٰ**'' کہ جب تم کنکریاں پھینک رہے تھے تو ہم پھینک رہے تھے، تم نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی اللہ کے بندے کو خدائی تائید مل جائے تو جو کچھ بھی ہو جائے، وہ تھوڑا ہے۔ ویسا ڈاکوؤں کے ساتھ بھی ہوا ہوگا کہ جن لوگوں کو سامان سپرد کیا ہوگا، وہ مبہوت کھڑے رہ گئے۔ اس سے اس روایت کا مطلب

سمجھ میں آتا ہے جوحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ’جب میں کسی بندے کواپنا ولی بنالیتا ہوں تو اس کے ایک ایک عضو کو میری تائید مل جاتی ہے۔‘ قاری صاحب کی اس ولایت کا اثر تھا کہ پاس پڑوس کے برادر وطن بھی ان پر جان چھڑکتے تھے، حتی کہ ضلع کے کلکٹر اور کپتان بھی بابا کی سلامی اور درشن کے لیے انتظار میں رہا کرتے تھے۔

احترام:

دوسال ہوئے دہلی سے ہتھورا ہوتا ہوا آیا۔قاری صاحب نے صبح کو اپنی جیپ میں سوار کر دیا اوراس سے میں باندہ نہیں فتح پور تک آیا۔راستے میں ایک جگہ پولیس والے گاڑیوں کو روک رہے تھے، ڈرائیور نے بلند آواز سے کہہ دیا کہ ’’بابا کی گاڑی ہے‘‘ اور پولیس والے بابا کی گاڑی سے ہٹ گئے۔حالاں کہ بابا اس گاڑی میں موجود نہیں تھے مگر گاڑی انھیں کی تھی، نام ان کا کافی تھا۔

تعویذ:

قاری صاحب کی سب سے بڑی علامت ان کی تعویذ تھی، جہاں بھی پہنچ جاتے ،لوگ تعویذ کے لیے ان پر ٹوٹ پڑتے یا بوتل لے کرانبار لگا دیتے کہ دم کر دیں۔

تعویذ کو اہل عرب خصوصاً سلفیان حرم کفر اور شرک کہتے ہیں، ہمارے یہاں کے غیر مقلدین دو حصوں میں تقسیم ہیں، جو وہابی ہیں وہ شرک کہتے ہیں مگر نواب بھوپال اور شیخ الکل تعویذ کو جائز کہتے ہیں۔اوراس وجہ سے جائز ہے کہ قرآن کہتا ہے ’’**واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ بالله** ‘‘نیز’’ **قل اعوذ برب الفلق**‘‘ اور’’**قل اعوذ برب الناس**‘‘ کا مطلب ہے کہ لوگ اللہ کی پناہ میں آ کر شیطان اوراس کی ذریت سے نجات پایا کریں۔اس کا نام تعویذ ہے جو ایک شرعی حقیقت اور قرآنی جواب ہے۔

❑❑❑

ماخذ: ’دانشور‘ گورکھ پور۔۱۹۹۸ء

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی

نورالعلوم بہرائچ میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک میں نے درس دیا، اس عرصے میں کون آیا کون گیا؟ ۵۰؍برس بعد یاد نہیں رہا مگر جو لوگ یاد رہ گئے، ان میں قصبہ حضور پور ضلع بہرائچ کا ایک لڑکا بھلایا نہ جاسکا۔ بہت سادہ، بہت بے تکلف، بہت برجستہ۔ میں نے اسے ہدایہ تک پڑھایا مگر اس کی ابھرتی ہوئی ذہانت ہمیشہ یادرہے گی۔ وہ محنت نہیں کرتا تھا مگر کسی بھی محنتی طالب علم سے پیچھے نہیں رہتا۔ اپنے قد کے لحاظ سے مختصر مگر بات سمجھنے میں، کبھی کبھی ٹیڑھے سوال کرنے میں اپنی جماعت میں سب سے بڑا تھا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ یہ لڑکا پڑھ جائے۔ حضور پور اور بارہ بنکی کے دوران میں گم نہ ہو جائے، اور وہ دیوبند جاکر بحمدللہ عالم ہو گیا۔ وہاں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز رہا۔ اس لیے پڑھنے اور تحریری کاموں میں مشغول ہونے کے بعد سارا دیوبند جانتا تھا کہ ابوالحسن کون ہے؟ کیا ہے؟ اور آج کے علما کے طبقے میں کون ہے جو اسے نہیں جانتا۔ افسوس کہ وہ چراغ بجھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ رجعون

(۲)

دیوبند میں حضرت مولانا ابراہیم صاحب کا فلسفہ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا ادب اوران کی نگاہیں، نیز شیخ الاسلام حضرت مدنی کا تقدس اوران کی بے پناہ سرگرمیاں آدمی کو حیران کردیتی تھیں۔ بڑے بڑے ذہین، کیسے کیسے چرب زبان اور کتنے کتنے برخود غلط لوگ وہاں آتے تھے مگر پہاڑ کے نیچے پہنچ کر انھیں اپنی اوقات معلوم ہو جاتی تھی۔

ابوالحسن ان شوخ مزاج لوگوں میں تھا جو عمر بھر کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ لیکن حضرت شیخ کی کرامت نے اس کو اس قدر مسخر کردیا تھا کہ وہ اپنے کو ان کی خاک پا کے برابر سمجھتا تھا۔ اس

کی محبت اور گرویدگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جو حضرت شیخ سے اس کو حاصل تھی۔ اس محبت کا اظہار اس نے ''حیرت انگیز واقعات'' نامی کتابچہ میں کیا ہے، اور خوب کیا ہے۔

غالب کو شکایت تھی کہ ''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے'' لیکن ابوالحسن کے لیے باعث افتخار تھا کہ اس کے قلم نے پوری علمیت، بصیرت اور عقیدت سے ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں کہ آج بھی اسے کوئی پڑھے تو اس کے سامنے ایک ایسی ہستی کا مجسمہ آ جاتا ہے جو علم، بزرگی اور تجربات کا شاہکار ہو۔ اس نے کوشش کی ہے کہ اس میں رطب ویابس نہ بھر دے، اندھی عقیدت سے اوٹ پٹانگ خبروں کا ڈھیر نہ لگا دے۔ اس لیے اس کتاب کو ہر سطح کے لوگ پڑھ سکتے ہیں، اس سے نفع اٹھا سکتے ہیں اور لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۳)

میں ایک دفعہ مشرقی پاکستان گیا تھا، واپسی میں سلہٹ سے کسی کسی طرح سلچر پہنچا۔ تقریباً دس بجے رات کو ایک دریا کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور مایوس ہو رہا تھا کہ آگے جاؤں تو کس طرح؟ اور پیچھے جاؤں تو کہاں؟ جب تک مزدوروں کا ایک ٹرک آیا۔ انھوں نے ''بڑا مولانا'' کا نام سن کر اپنے ساتھ لے جا کر باس کنڈی میں اتار دیا۔ میں پہنچا تو حضرت شیخ تراویح پڑھانے کے لیے مسجد جا رہے تھے، بھیڑ میں گھس کر زور سے سلام کیا تو حضرت شیخ کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کی عزت بخشی اور خیریت پوچھ کر نماز کے لیے روانہ ہو گئے۔ نماز کے بعد سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے پکارا 'افضال'، پھر پکارا اور میں حیران ہو کر نکلا کہ مجھے کون پکار رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ کی قیام گاہ سے آواز آ رہی ہے۔ وہاں حاضری دی تو دیکھا کہ مولانا اسعد صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب ہیں اور وہ تھے مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی۔ مل کر حیرت ناک خوشی ہوئی کہ ابوالحسن یہاں موجود ہے۔

مانا کہ بام یار کا پایہ بلند ہے
لے جائے گا اچھال کے درد جگر مجھے

پھر وہاں کئی دن ساتھ رہا، وہیں عید کی، پھر امین گاؤں آ کر میں اعظم گڈھ آ گیا، وہ غالباً دیوبند چلے گئے۔

حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ ایسے دماغ والے بے قابو انسان کو انھوں نے تصوف کی لائن میں ڈال دیا اور اسے ذکر اللہ کی لذت چکھا کر دین اور اہل دین کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ کر دیا۔

ابوالحسن کو خدا نے ذہانت تو دی مگر دماغ اس طرح کا دے دیا کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بے دھڑک کہتا تھا، صاف کہتا تھا اور خوب سمجھ کر کہتا تھا کہ کس میں کیا کھوٹ ہے۔ اسی لیے دنیا میں اس کے مخلص دوست بہت کم تھے اور عمر بھر اسے کوئی ایسی جگہ نہیں مل سکی جہاں سکون سے وقت گزار سکے اور یکسوئی سے قلم چلاتا رہے کہ دست فیاض نے اسے بہت اچھا، رواں اور جاندار قلم دیا تھا۔ وہ مٹ سکتا تھا مگر چاپلوسی اور خوشامد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فاقے برداشت کر سکتا تھا مگر بات برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے قدرتاً اس کو مرد قلندر رہنا تھا اور رہا۔ بلکہ اسی شان بے نیازی سے گزرتا ہوا بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں ابدی نیند سو گیا اور اب اگست ۹۸ء میں دہلی آئے تو معلوم ہوا کہ جون کے اواخر میں علم وفن کا وہ ستارہ غروب ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ اس پر علم وفضل کی چادر اوڑھا دے، اور اپنے مخلص بندوں کا معاملہ کرے۔ اس مرد قلندر کی چند کتابیں ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھیں گی اور اسے دعاؤں کا مستحق قرار دیتی رہیں گی۔

(۴)

دیو بند میں حضرت شیخ کے مہمان خانے میں چند بے تکلف علمائے کرام کی مجلس تھی، اس میں مولانا ابوالحسن بھی تھے۔ ایک بزرگ عالم کو مولانا ابوالحسن کے بے لاگ تبصرے پسند نہیں آرہے تھے کہ یہ لڑکا اپنی حد سے آگے بڑھ کر بول رہا ہے۔ ان بزرگ سے جب رہا نہیں گیا تو منہ بنا کر بولے کہ 'صاحبزادے! تم بھی فاضل دیو بند ہو؟'

'جی ہاں! کتابیں تو یہیں پڑھی ہیں۔'

'مگر تمہاری داڑھی بزرگوں جیسی نہیں ہے۔'

'جی ہاں! میں ایسی جگہ رہتا ہوں کہ بہت سے لوگ داڑھی منڈا کر بھاگ جاتے ہیں مگر میرے چہرے پر تو اب بھی مولویانہ داڑھی آپ دیکھ رہے ہیں۔'

مولانا ابوالحسن کا یہ تلخ جواب سن کر وہ بزرگ سناٹے میں آگئے اور دوسروں کے چہرے

بھی لال پیلے ہوگئے مگر ابوالحسن اسی طرح چہکتا رہا۔ میں اس کی شوخی اور بے با کی پر مسکرا کر رہ گیا، اور ۳۰/۳۵ برس کی یہ بات میرے ذہن سے اب تک نہیں نکل سکی جو تلخ سہی مگر حالات کی صحیح عکاس اور برجستہ تھی، کانٹے کی طرح دلوں میں ترازو بن گئی۔ **رحمه الله رحمةً واسعة**

مولانا ابوالحسن سے میری آخری ملاقات دیوبند میں ہوئی تھی، جہاں ان کو ترجمہ شیخ الہند کو ہندی میں منتقل کرنے اور اس کی معنوی نگرانی کے لیے بلایا گیا تھا اور وہ اس میں کچھ دنوں مشغول رہے تھے۔

وہ مدراس سے لوٹے تھے اور مجموعۂ امراض تھے۔ دیکھ کر بہت ترس آیا، کہنے لگے ’جادوگروں نے ناک میں دم کر دیا ہے، کیا کروں؟‘ یہ بات وہم کی حد تک ان پر سوار تھی۔ پھر بھی جب کام پر آجاتے تو گھنٹے دو گھنٹے محنت، سلیقے اور ذمہ داری سے کیا کرتے تھے۔ اس لیے اہل علم ان پر اعتماد کرتے تھے اور انھیں تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے مخلص ساتھی اور بے تکلف دوست مولانا وحید الزماں کیرانوی نے ان کو کبھی نہیں چھوڑا مگر وہ کہیں نہیں جمے، نہ آنے میں تکلف کرتے تھے، نہ جانے میں دیر۔ نہ روپے پیسے کی پرواہ، نہ کام میں کوتاہی۔ آپ ان کا وہ مضمون پڑھیے جو مولانا کیرانوی کی یادوں کے سلسلے میں لکھا ہے، وہ مولانا ابوالحسن کی شخصیت کا بہترین عکس ہے۔ نقد ونظر، برجستگی و بے با کی، علمیت اور فنکاری، شوخی وطراری کے تمام پھولوں کا گلدستہ وہ مضمون ہے۔

میں تمام اہل علم، اہل دل اور اہل مدارس سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مولانا مرحوم کے لیے ایصال ثواب کرائیں اور ان کی مغفرت اور ترقی درجات کی دعا فرمائیں۔

میں سمجھتا تھا کہ میرے نامور شاگرد میرے بعد میری مغفرت کا خوب اہتمام کریں گے، اور ان کے طفیل میں میری بھی بخشش کا سامان ہو جائے گا مگر افسوس کہ ایسے ایسے حضرات مجھ سے پہلے ہی رخت سفر باندھ کر رخصت ہو گئے۔ خدا ان کو جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: ’ترجمان دارالعلوم‘ دہلی۔۱۹۹۸ء

ہندوستان کی آفاقی شخصیت
مولانا ابوالحسن علی ندوی

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی گئے تو ہندوستان سے مگر پاکستان، خلیجی ممالک سعودی عرب سے مصر تک سناٹا چھا گیا۔ یہ تھی جانے والی کی آفاقیت اور عالمی مقبولیت!

مولانا اپنی وضع قطع میں ایک عام آدمی تھے مگر جب قلم اٹھا لیتے تو عالم اسلام ان کی فن کاری، برجستگی، عظمت و ذہانت سے جھوم اٹھتا۔ بڑے بڑے اہل علم اہل قلم ان کا قلم چوم لیتے تھے۔ وہ کون سا عربی عالم یا حاکم ہے جس نے "**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**" نہ پڑھی ہو اور اس ہندوستانی عربی داں کو داد نہ دی ہو۔

دنیا میں ادب برائے ادب کا رواج ہے، ادب برائے زندگی کو بھی لوگ پسند کرتے ہیں مگر ادب برائے اسلام مولانا کا موضوع تھا اور اس موضوع پر انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ اسلامی تاریخ بھی لکھی ہے تو قوموں کا ماتم نہیں کیا ہے، انھیں پیغام دیا ہے، ان کے اندر مستقبل کی فکر پیدا کی ہے، اسلام کا شعور جگایا ہے۔

آج کل علم دین اور سیاست کا جوڑ نہیں لگتا مگر شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ عبیداللہ سندھی، شیخ الاسلام حضرت مدنی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان اور مولانا منت اللہ رحمانی جیسے علما نے اس خارزار کو روند کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا تشخص قائم رکھنے کے لیے ہمالیہ کی یہ چوٹی سر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے اس میدان میں پہلے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلم مجلس مشاورت قائم کی اور ندوہ ہی میں اس کا اجلاس کیا تھا۔ پھر ملک بھر کا دورہ فرمایا اور مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے اہم ترین ادارے کی

صدارت فرما کر دکھایا کہ امانت و دیانت کے ساتھ بھی سیاست کی جاسکتی ہے اور اونچی کرسیوں اور شاندار عمارتوں، خوش آمدانہ ناز و انداز کے بغیر درویشانہ شوکت کے ساتھ اس وادی میں اس طرح بسر کیا جاسکتا ہے کہ اہل سیاست آجائیں تو ان کا ضمیر زندہ ہو جائے اور رائے بریلی کے جھونپڑے یا ندوہ کے مہمان خانہ کے فرش پر ہندوستان کے وزیر اعظم کو اجازت دی جائے کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے ملک کا وقار بڑھائیں۔ گویا ہندوستان کے اندر ایک عالم صرف اپنی خودداری، علمیت، بے نیازی اور درویشانہ انداز سے بھی اپنا لوہا منوا سکتا ہے۔

مولانا کی وسعت علمی، بے لاگ رائے اور بے باک نگاہ کا اثر تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر، مظاہر علوم سہارن پور کی مجلس سرپرستاں کے رکن، ندوۃ العلما کے ناظم، رابطۂ عالم اسلام کے بانی وممبر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سرپرست، مدینہ یونی ورسٹی کے ممبر اور معلوم نہیں کتنے اداروں اور مجلسوں نیز تعلیم گاہوں کے رکن تھے۔

مولانا کی عظمت کا ادنی کرشمہ تھا کہ انھیں مختلف ممالک سے ایوارڈ ملے اور انھوں نے کروڑوں روپے بیک جنبش قلم دنیا کے مختلف اداروں پر نچھاور کر دیے اور انھیں ابوذر غفاری کی طرح یاد ہی نہیں رہا کہ بریلی کے بوسیدہ مکان کی مرمت کرا لیتے۔ آخر جب اس آبائی مکان میں ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندوں نے آکر دیکھا کہ ایک درویش کس بے نیازی سے گزر گیا اور عظمت اس کے قدم چومتی رہ گئی۔ اللہ اکبر!

قرآن پاک مولانا ندوی کی زندگی کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ان کی نگاہ قدیم وجدید دونوں پر حاوی اور تاریخ عالم پر بڑا عبور تھا۔ میں ایک مرتبہ ندوہ کے مہمان خانہ میں بیٹھا تھا۔ مجلس میں ٹیلی ویژن وغیرہ کا ذکر آ گیا تو مولانا نے قرآنی موضوعات کی وسعت کے لیے فرمایا کہ ''اللہ تعالی نے قرآن میں ایسی تمام تفریحی چیزوں کے لیے ''لہوالحدیث'' کی اصطلاح وضع کر کے اپنی منشا واضح کر دی ہے۔'' مولانا کے فرمانے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس لفظ سے ہم بار بار گزرتے ہیں اور توجہ نہیں کرتے اور حضرت مولانا نے اس میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو جیسی تمام تفریحی خرافات کی جھلک دیکھ لی ہے۔ یہ ان کی ذہانت، توجہ، حاضر دماغی اور جدت طرازی کا نمونہ تھا۔ چنانچہ ایک کانفرنس میں تلاوت اور تفسیر کا مرحلہ درپیش تھا تو مولانا نے مشورہ

دیا کہ ''سورہ یونس'' پڑھی جائے۔ کیوں کہ اس میں مختلف قوموں کا تذکرہ بھی ہے تبصرہ بھی۔'' اس سے اندازہ ہوا کہ مولانا کو قرآنی مضامین اور اس کی قدیم وجدید اصطلاح پر عبور ہے۔ چنانچہ وہ اپنی برجستہ تقریروں میں قرآنی آیات سے استدلال کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ مولانا نے عصر حاضر کو بھی سمجھا ہے اور اللہ تعالی کی منشا سمجھنے کی بھی پوری کوشش فرمائی ہے۔ اسی لیے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب الہ آبادی فرمایا کرتے تھے کہ ''قرآن کے ذریعہ تقریر کیا کرو، اس میں ہر موضوع کے لیے مضامین میسر ہو جائیں گے۔''

تقریر وتحریر خدا کے عطیات ہیں جس کو جتنا انعام دیدیں اس کے فضل وکرم کی نشانی ہے۔ حضرت مولانا کی تقریر مسلسل، برجستہ اور پر مغز ہوتی تھی۔ مترادفات خوب بولتے تھے، ضروری مضامین کی تکرار بھی ہوتی تھی مگر جو کچھ تھا آمد ہی آمد تھی۔ پرسنل لا بورڈ کی آل انڈیا میٹنگ ہو یا رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس، بڑے بڑے علما، دانشور اور فلسفی انتظار کرتے تھے کہ مولانا کیا فرماتے ہیں۔

دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں تقریباً بیس لاکھ انسان اُمڈ آئے تھے، اس میں دنیائے اسلام کے نمائندے اور علما بھی تھے۔ اس میں آخری تقریر حضرت مولانا کی ہوئی تو مجمع دیکھ کر فرمانے لگے کہ ''یہ عرفات کا میدان معلوم ہوتا ہے۔'' پھر انھوں نے علمائے اسلام، علمائے ہند اور علمائے دیوبند کو مخاطب کر کے فرمایا اور خوب فرمایا کہ ''یہ ملک 'اکّال الامم' رہا ہے جیسا کہ حالؔی نے لکھا ہے۔ اس لیے علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہاں اسلام کا تعارف کرائیں اور اپنے کردار سے اسلامی تشخص کو قائم رکھیں اور اسے عام کریں۔''

حضرت مولانا کا عظیم ترین کارنامہ دارالعلوم ندوۃ العلما کی نشأۃ ثانیہ ہے۔ پہلے وہاں کے طلبہ دارالعلوم کو ''ندوہ کالج'' کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن آج کے طلبہ ''دارالعلوم ندوہ'' کہتے ہیں۔ اور یہ تبدیلی مولانا علی میاں کی محنت سے نہیں، ان کی شخصیت سے عمل میں آئی اور خوب آئی۔ کیوں کہ جب مولانا عمران خان صاحب ندوہ کے مہتمم تھے تو وہاں مولانا مودودی کا طوطی بول رہا تھا، مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی دونوں حضرات زبان وقلم سے ان کے خیمہ بردار تھے، حتی کہ 'الفرقان' مولانا مودودی کے لیے میدان جنگ بنا ہوا تھا اور اسی ماحول میں مولانا

مودودی نے ان دونوں حضرات کو اور مولانا محفوظ الرحمان صاحب وغیرہ کے ساتھ پنجاب میں ''جماعت اسلامی'' کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں ندوہ کی آئیڈیل شخصیت مولانا مودودی تھے۔

میں جب ۱۹۴۱ء میں نورالعلوم بہرائچ میں مدرس تھا تو یہ تینوں علمائے کرام مولانا مودودی کے خیمے میں چندروز ساتھ ساتھ وقت گزار کر آئے تھے اور ان کی ماڈرن خانگی زندگی سے دل برداشتہ تھے۔ اور یہ بددلی اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ مولانا منظور نعمانی صاحب نے علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اٹھائی تھی اور ان کے لیے وہ مثالی شخصیت تھے۔ اور مولانا علی میاں نے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور اس وقت کے دارالعلوم کے مشائخ کی صحبت پائی تھی اور وہ اسلاف کے ان نمونوں سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اس لیے مولانا مودودی کی خانہ خرابی دیکھ کر قدرتاً دل برداشتہ ہو گئے اور پھر ان کی تحریک سے دھیرے دھیرے علاحدہ ہو گئے۔ مگر اس کی جگہ انھیں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک مل گئی اور ان کی معرفت شاہ عبدالقادر صاحب کی خانقاہ میں رائے پور میں پہنچ گئے۔ اور یہ صرف خدا کا فضل وکرم تھا کہ ان دونوں حضرات کو رائے پور کی فضا راس آ گئی۔ اور یہ اسی طرح ہوا جیسے کہ سید سلیمان ندوی عالم اسلام کے مشہور اسکالر، مولانا عبدالباری ندوی صدر فلسفہ عثمانیہ یونی ورسٹی اور مولانا عبدالماجد فلسفی جیسے قلم کار جب علم و ہنر کے باوجود روحانی تشنگی محسوس کرنے لگے تو شیخ الاسلام حضرت مدنی اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی خانقاہوں میں ذکر سے روحانی کیفیت حاصل کر کے ہی تسکین پا سکے۔ تو ان دونوں حضرات نے بھی حضرت رائے پوری کے سامنے توبہ کی اور سنت کے مطابق بیعت فرمائی اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو کر اپنے دین کی تکمیل کر کے امام غزالی کی طرح مطمئن ہو گئے اور تادم حیات روحانی کیفیات کی لذت اٹھاتے ہوئے اپنے مولی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ برداللہ مضجعہ

اس طرح علم تو دارالعلوم ندوۃ العلما اور دارالعلوم دیوبند نے مکمل کر دیا تھا اور دین کو مرشد کامل نے مکمل کر کے عظیم انسان بنا دیا تھا تو اب وہ لوہا نہیں پارس بن گئے تھے، پھول نہیں چمن بن گئے تھے۔ اور جب حضرت مولانا ندوہ کے ناظم بنا دیے گئے تو اس وقت ان کا دین مکمل ہو چکا تھا اور وہ ندوہ کے لیے اسلام کا بہتر سے بہتر نمونہ تھے۔ چنانچہ طلبہ کے لیے آئیڈیل انسان

بن گئے اور عمر کے ساتھ ان کی شخصیت میں مقبولیت اور معنویت بڑھتی چلی گئی۔

میں نے اپنی طویل عمر میں جگہ جگہ دیکھا ہے کہ جس کسی ادارے میں کوئی نمونے کا انسان آجاتا ہے تو طلبہ و مدرسین فطری طور سے اس کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور ایسا کسی دینی شخصیت کا مقناطیسی اثر ہے اور فطری انتظام ہے۔

ندوہ کو موجودہ سعادت مندی تک لانے میں جہاں تک حضرت مولانا کی شخصیت کارفرما تھی وہیں مولانا معین اللہ صاحب کا خلوص، ان کی لگن اور فکر نے بھی بڑا کام کیا۔ چنانچہ وہ حضرت مولانا کے دست و بازو بن گئے تھے اور ندوہ کو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا کر کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین

کسی ایک آدمی کا سدھار بھی مشکل ہوتا ہے، خاندان کا سدھار تو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکل ہے، لیکن بغیر طاقت وقوت اور قانون وضابطے کے کسی ادارے کو اتباع رسول کے راستے پر لگا دینا اور اس کی روش بدل ڈالنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی کی آئیڈیل زندگی، اس کی مقناطیسی شخصیت اور اس کا بے داغ کردار لوگوں کو مرعوب کر کے اس کا وفادار نہ بنا دے۔ اس لیے ہم حضرت مولانا کو اس کارنامے پر مبارک باد دیتے ہیں اور ان کے اس محیر العقول کارنامے کو قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ تقریر وتحریر کی واہ واہ لمحاتی ہے اور کردار کی مقناطیسیت پر کوئی ادارہ کروٹ لیتا ہے تو صدیوں تک باقی رہتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سے صدیقین کا معاملہ فرمائے اور ہم پس ماندگان کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان کردے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۲۰۰۰ء

موت العالم موت العالم
مولانا عبدالحلیم صاحب گورینی

کبھی ایسا عالم بھی مرجاتا ہے جس کے مرنے سے ایک عالم مرجاتا ہے۔سرکار دوعالم ﷺ کا یہ ارشاد جس قسم کے علمائے حق کے لیے آیا ہے،ان میں کچھ دن پہلے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جون پوری بھی شامل ہوگئے ہیں، جوپچھلے مہینوں میں اس طرح تشریف لے گئے کہ مشرقی یوپی میں سناٹا چھا گیا۔

مولانا اعلیٰ درجہ کے استاد کامل، مدرسہ کے لیے ممتاز قسم کے مہتمم اورمرشد کامل حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے خادم خاص اورمجاز طریقت، پھر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدنی کے خلیفہ خاص اور ہندوستان کے قابل صداحترام پیرومرشد تھے۔وعظ وتلقین میں بڑا ملکہ اوررسوخ تھا،اسی لیے جہاں جہاں گئے،دین داری اوررجوع الی اللہ کی ہوائیں چلنے لگیں، اورایسے ایسے لوگوں کی زندگیاں کروٹ لینے لگیں جن کودنیاداری نے دین سے بہت دورپہنچادیا تھا۔

مولانا کا وطن اکبرپور ضلع فیض آباد کے علاقے میں ایک گاؤں میں تھا،مگر درس اور انتظام کے لیے عرصہ تک مانی کلاں جون پور میں قیام کیا۔اورمولانا محمد حنیف،مولانا وکیل احمد اور مولانا رشید احمد جیسے سینکڑوں افراد پیدا کیے۔

پھر مشیت ایزدی نے مانی کلاں سے اٹھا کر مولانا کوگورینی کے بنجر میں پہنچادیا،تو آپ کی محنت ،لگن، درس وتدریس، تعلقات، للہیت اورتوفیق الٰہی سے آپ کوایسی فتوحات نصیب ہوئیں کہ اسی بنجر میں ریاض العلوم کا پودا ایک تناور درخت ہوگیا۔اوردس سال کے اندر اندر ہندوستان کے بڑے عربی مدارس کی صف اول میں ہوگیا، بلکہ ایک باغ بن گیا، جہاں دورۂ حدیث شریف کے ذریعہ ’قال اللہ وقال الرسول‘ کی صدائیں گونجنے لگیں۔مفتی مولانا محمد حنیف مدظلہ کے

افتا کی دھوم مچ گئی، اوردارالافتا کا باضابطہ درس ہونے لگا۔ حفظ کے درجے میں ۱۴؍ مدرسین کام کرنے لگے۔ اس طرح چھ سات سولڑ کے مستقل قیام کر کے دن رات پڑھنے لگے اور تعلیم وتربیت سے سنوارے جانے لگے۔

چونکہ یہ مدرسہ شاہ گنج سے جون پور جانے والی سڑک پر تھا، اس لیے قلعہ نما عمارت دیکھ کر اچھے اچھے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس جگہ اس قدر رونق کیسے ہوگئی؟ اس طرح ریاض العلوم نے مولانا عبدالحلیم صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیے تو وہ لوگ بھی شرمندہ ہوگئے، جو حضرت مولانا کو مانی کلاں میں اپنے لیے بار سمجھتے تھے۔ حالاں کہ وہ ان کے تالاب کے لیے کنول تھے جو گورینی کے دریائے علم ومعرفت میں آ کر باغ وبہار بن گئے تھے۔

حضرت مولانا پر اس عرصہ میں کافی لکھا گیا اور ابھی بہت لکھا جائے گا۔ ان کی تقریریں شائع کی جاویں گی، ان کی للّٰہیت کے گن گائے جائیں گے، ان کی روحانیت کی بہاریں تلاش کی جاویں گی۔ ان کے شاگردوں کے کارنامے ان کا تعارف کرائیں گے۔ کیوں کہ ان کی ایسی ہستی تھی جس کی علمیت اور تقویٰ پر دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور اور دارالعلوم ندوۃ العلما جیسے دنیا کے عظیم ترین دینی اور علمی ادارے گواہ ہیں۔ کیوں کہ آپ تینوں کی مجلس مشاورت کے رکن رکین تھے اور اہم امور میں ان سے ضرور رجوع کیا جاتا تھا۔

حضرت مولانا تشریف لے گئے مگر ان کا لگایا ہوا شالیمار باغ بحمدللہ گورینی میں موجود ہے۔ ریاض العلوم ان کی یادگار بھی ہے، ان کا کارنامہ بھی، ان کے لیے ذخیرہ آخرت بھی۔ خدا اسے نظر بد سے محفوظ فرمائے۔

حضرت مولانا کی وفات سے پہلے مولانا مفتی محمد حنیف صاحب سے جو دوری پیدا ہوگئی تھی، وہ افسوس ناک تھی۔ اس سے مدرسہ پر بھی اثر پڑا۔ مولانا حنیف صاحب کی شخصیت بھی مجروح ہوئی اور خواہ مخواہ حضرت مولانا کے حلقہ ارادت میں خلیج پیدا ہوگئی، اور وہ خلیج اس قدر بڑھ گئی کہ اب اس کا پاٹنا مشکل ہے۔ اس کے لیے ایک لمبی مدت چاہیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو مقربین بارگاہ میں بلند مقام عطا فرمائے اور ان کے مدارس، شاگردوں اور اولاد کو ان کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔

❑❑❑ ماخذ: ’دانشور‘ گورکھ پور۔ ۱۹۹۹ء

ولی کامل مولانا عبدالحلیم صاحب
اوران کے کارنامے

فتح پورتال نرجا حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وطن اور ہمارا نانیہال تھا، وہاں میں گیا تھا، دس بارہ برس کی عمر تھی، غالبًا مئو میں پڑھتا تھا۔حضرت مولانا کے یہاں گیا تو سامنے سے ایک صاحب آرہے تھے، دراز قد، عمدہ شیروانی میں ملبوس وجیہ وشکیل انسان تھے۔سلام کرکے میں گزرگیا۔معلوم ہوا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب ہیں، جون پور سے حضرت سے ملنے آتے ہیں۔یہ تھی میری پہلی ملاقات بلکہ پہلی دید وشنید۔

وہیں میں نے ایک لڑکے کو دیکھا لنگی چڑھائے ہوئے بکریوں کو لے کر چرانے جارہا تھا۔معلوم ہوا کہ یہ بکریاں حضرت مولانا کی ہیں اور یہ جون پور کا کوئی لڑکا ہے جو انھیں چراتا ہے اور حضرت مولانا کے پاس پڑھتا ہے۔بعد میں جب میں گورینی پڑھانے آیا تو ایک مدرس نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں نے تم کو اور ضیاء الحق (میرے بڑے بھائی) کو مولانا کے یہاں فتح پور میں دیکھا ہے۔میں اس وقت مولانا کی بکریاں چَراتا تھا اور پڑھتا بھی تھا۔یہ تھے محمد حنیف جو آج مولانا محمد حنیف صاحب ہیں اور میرے ہم عمر ہیں۔ان کو مولانا عبدالحلیم صاحب نے اپنے شیخ کے یہاں پہنچادیا تھا جہاں سے وہ نکلے تو عالم وفاضل ہوکر نکلے۔

مولانا عبدالحلیم صاحب مانی کلاں کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا ہنر جانتے تھے۔اس وجہ سے ۲۵۔۳۰ لڑکے مدرسہ میں رہتے تھے اور متوسط قسم کی تعلیم تھی۔مولانا محمد حنیف صاحب بھی مدرس تھے، وہاں اراکین مدرسہ سے اختلاف ہوا اور وہ دشمنی تک پہنچ گیا، پھر الزام تراشیوں کا طوفان اٹھا اور فضا مکدر ہوگئی۔اس فضا میں کام کرنا مولانا

عبدالحلیم صاحب کے لیے مشکل تھا۔ انھیں بتایا گیا گورینی میں سڑک کے کنارے ۱/۸ ایکڑ زمین وقف ہے۔ مولانا نے اس جگہ کو آباد کر دیا تو وہ دیکھتے دیکھتے مدرسہ بن گیا، پھر چونکہ لب سڑک چاروں طرف مسلم آبادی بہت تھی، مولانا کی شخصیت بہت مشہور تھی۔ مولانا محمد حنیف صاحب اور حافظ نسیم صاحب ایسے حفظ کے مدرس تھے، اس لیے وہ مدرسہ ریاض العلوم بن گیا اور اس میں سینکڑوں لڑکے پڑھنے لگے حتی کہ جون پور کا سب سے بڑا مدرسہ ہوگیا، جس میں مشکوۃ اور جلالین پڑھائی جانے لگی اور چار سو سے زائد بچوں کے رہنے سہنے کے لیے دو منزلہ عمارتیں بنتی چلی گئیں۔

دورۂ حدیث:

مولانا نے محسوس فرمایا کہ اس پورے علاقے میں کہیں دورۂ حدیث نہیں ہوتا، اور یہاں لڑکے بھی ہیں، کتابیں بھی، مدرسین بھی۔ اس لیے دورہ شروع کرنا چاہیے، اور خدا کا نام لے کر دورہ شروع کر دیا۔ مدرسہ کو جامعہ بنا دیا گیا اور یہ سب کچھ تقریباً آٹھ سالوں میں ہوگیا۔ علاقہ کے کچھ لوگ سنگاپور، ملیشیا میں رہتے تھے اور حضرت مولانا کا تعلق بمبئی کے بڑے بڑے تاجروں سے بھی تھا جو مرید بھی تھے اور اس بے سروسامانی میں حضرت مولانا کے سچے دوست بھی۔ اس لیے کئی جگہوں میں وسیع وعریض عمارت تھی۔ اور دورہ شروع ہونے کے بعد قریب کے تمام اضلاع میں مدرسہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لیے اعظم گڑھ، بستی، گورکھ پور اور فیض آباد سے لڑکے جوق در جوق آتے چلے گئے۔

دورۂ حدیث کے طلبہ سے کہا گیا تھا کہ تم لوگ رک جاؤ ہم کوئی شیخ الحدیث لا دیں گے، اس لیے پڑھانے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

حضرت مولانا مجلس شوری دارالعلوم دیوبند کے سرگرم ممبر تھے، دہلی سے ہوکر دیوبند پہنچے تھے۔ انھوں نے دہلی سہارن پور اور دیوبند میں کسی عالم کی ضرورت ظاہر کی تو جو اہل علم تھے وہ محرم کے مہینے سے کام میں لگے ہوئے تھے، جو کہیں نہیں لگے تھے وہ کسی کام کے نہیں تھے۔ مگر مولانا عبدالحق اعظمی (حال استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) نے افضال الحق اعظمی کی نشان دہی کی۔ مولانا نے لاعلمی ظاہر کی تو قاری صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ پھر لوگوں نے بتایا کہ وہ امروہہ میں چار سال سے بخاری پڑھا رہے ہیں اور ہر قسم کی کتابیں پڑھا

سکتے ہیں۔

مولانا اسعد صاحب کے یہاں ممبران شوری کی دعوت تھی وہاں سب حضرات موجود تھے، میں بھی مہمان خانہ میں کئی روز سے ٹھہرا ہوا تھا۔قاری صدیق نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ ان حضرت مولانا کے مدرسہ میں ایک مدرس کی ضرورت ہے ۔مولانا نے فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو شعبان تک کام کر دیں، ہمارے یہاں دورہ شروع ہے، ایک آدمی کی سخت تلاش ہے۔

گورینی میرے لیے نیا علاقہ، نئے لوگ اور کسی سے بھی واقفیت نہیں۔خود حضرت مولانا سے صرف سلام دعا تھی۔اس لیے سوچنے لگا تو قاری صاحب نے فرمایا' چلے جاؤ سوچتے کیا ہو؟' میں حضرت قاری صاحب سے خوب واقف تھا اس لیے ہاں کہہ دیا۔

شاہ گنج آ کر جون پور کی بس تلاش کی اور گورینی اتر گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک مدرسہ ہوگا مگر پھاٹک دیکھ کر پھر چاروں طرف دومنزلہ عمارت دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ بڑا مدرسہ ہے۔حضرت مولانا نے میرا بہت اعزاز فرمایا، مولانا محمد حنیف صاحب نے رفاقت کا حق ادا کر دیا تو میں سمجھا کہ یہاں رہ سکتا ہوں اور بستر کھول دیا۔

تیسرے دن کتابیں تقسیم ہونے لگیں تو مولانا محمد حنیف صاحب نے فرمایا کہ بخاری جلد اول دیدی جائے جسے شوال سے وہ پڑھا رہے تھے۔میں نے عرض کیا کہ مجھے بخاری جلد ثانی دیدیجیے۔حضرت مولانا نے دیکھا کہ خوش دلی سے کہہ رہا ہوں اس لیے قبول فرمالیا اور اس کے ساتھ چار کتابیں اور دیدیں اور میں پڑھانے لگا تو شعبان تک ہنسی خوشی پڑھاتا رہا۔جب سالانہ امتحان قریب آیا تو حضرت مولانا، مفتی محمد حنیف صاحب کو لے کر مسجد کے شمالی کونے میں جہاں میرا کمرہ تھا، وہاں تشریف لائے تو مجھے گراں گزرا کہ خود مولانا نے زحمت فرمائی ہے۔میں نے کہا کہ بلوالیا ہوتا آپ نے۔مگر وہ فرمانے لگے کہ نہیں ہمارا کام تھا۔پھر فرمانے لگے کہ تم نے شعبان تک کا وعدہ پورا کر دیا، اب ہماری گزارش ہے کہ تم مستقل طور پر یہیں پڑھاؤ۔میں نے عرض کیا کہ جیسا حکم ہو اور ٹھہر گیا تو بحمد للہ آٹھ سال تک کام کرتا رہا اور کوئی تعلیمی شکایت نہیں ہونے دی۔

یہ تھی مولانا کی شخصیت کہ مجھ جیسے اکھڑ پٹھان کو لا دکر لائے اور اپنے حسن اخلاق سے آٹھ سال تک روکے رکھا۔

وہاں پہنچا تو مولانا حبیب اللہ صاحب بہاری سے ملاقات ہوگئی ۔خوبصورت چھریرا بدن، ہنس مکھ اور دل چسپ آدمی تھے۔اونچی کتابیں پڑھاتے تھے اور اپنے کمرے کو بہت سجا کر رکھتے تھے۔انھوں نے بتایا کہ آپ نے امروہہ میں مفتی محمود صاحب گنگوہی کی دعوت کی تھی اس میں میں بھی شریک تھا۔ مجھے بھی یاد آیا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ میں مفتی محمود حسن صاحب کے ساتھ رہتا تھا، میں نے ان سے بیعت کے لیے گزارش کی تھی تو انھوں نے فرمایا کہ تم مجھ سے بیعت نہ ہو، مولانا عبدالحلیم صاحب جون پوری سے بیعت ہو۔اس لیے میں یہاں آ گیا ہوں۔حضرت سے بیعت کر لی ہے اور حضرت نے یہیں مدرس بنالیا ہے،فلاں فلاں کتابیں پڑھا رہا ہوں۔

اس واقعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ مفتی محمود صاحب ایسے مستند اکابر کے نزدیک حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی حیثیت کیا ہے؟اور وہ کس قدر معتبر اور محترم پیروں میں سے ہیں۔ان سے مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ 'تمہاری اصلاح وہی کر سکتے ہیں'۔چنانچہ ضرورت پڑنے پر سخت سرزنش بھی فرمائی گئی۔

اندازتربیت:

مولانا کہیں باہر سے تشریف لائے تھے،ظہر کی جماعت کے بعد اعلان فرمایا کہ جو لوگ مسبوق ہیں وہ مسجد کے برآمدے میں جمع ہو جائیں۔چنانچہ سنتوں سے فارغ ہو کر ہم لوگ نکلے تو دیکھا کہ قریب سولہ کے برآمدے میں انتظار کر رہے ہیں کہ حضرت مولانا کیا سزا دیتے ہیں؟

مولانا سنن ونوافل سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے تو مسبوق ہونے والے طلبہ اور اساتذہ پر ایک نظر ڈالی اور کچھ نہیں فرمایا، دروازہ کھول کر اپنی قیام گاہ پر چلے گئے مگر طلبہ اور اساتذہ پسینہ پسینہ ہو گئے کہ آج حضرت نے ہماری کوتاہی اور نالائقی پکڑ لی اور اسے واشگاف کر دیا۔ پھر دوسری نمازوں میں وہی مسبوق رہا جس کو کوئی خاص مجبوری تھی۔

کتنا عجیب اندازتربیت تھا کہ ان کی خاموشی بھی سب کے لیے وعظ ونصیحت تھی۔

مقبولیت:

ایک آدمی اپنے گھر سے دو جھولوں میں سامان لے کر آیا اور ایک تاجر کی دوکان پر رکھ کر کوئی چیز بھول گیا جسے لینے کے لیے چلا گیا اور جلد ہی واپس آ گیا۔دیکھا تو ایک جھولا ہے دوسرا

غائب ہے۔ پوچھا دوسرا جھولا کیا ہوا؟ تاجر نے کہا کہ تمہارا کوئی آدمی آیا تھا، لے گیا۔ اس نے کہا میں نے کسی کو نہیں بھیجا مگر وہ یہی کہتا رہا کہ تمہارا آدمی لے گیا۔

اس جھولے میں وہ ایک لاکھ روپے لے کر آیا تھا، اسے غائب دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا مگر دوکان دار کو رحم نہیں آیا۔ کئی گھنٹے تلاش و جستجو اور مایوسی کے بعد دونوں حضرت مولانا کے پاس گورینی آئے اور کہا کہ 'فیصلہ آپ پر ہے یا تو ان کو سمجھا دیجیے یا ان سے قسم لیجیے۔' حضرت مولانا اور مولانا محمد حنیف صاحب نے خوب سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر انکار کرتا رہا حتی کہ منبر پر جا کر حلف اٹھالیا اور چلا گیا۔ پھر کیا ہوا؟ معلوم نہیں، اس واقعہ کو دس پندرہ سال ہو گئے اگر جھوٹی قسم ہوگی تو ضرور اس کا نتیجہ نکلا ہوگا۔

شیخ الحدیث کی صحبت:

مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے وصال کے بعد مولانا عبدالحلیم صاحب نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بیعت کر لی اور شیخ نے کچھ دنوں کے بعد خلافت عطا فرمادی۔ شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی خلافت کے بعد مولانا کا حلقہ محبت بہت وسیع و عریض ہو گیا۔ کیوں کہ شیخ بلا کسی استثنا کے ہر حلقہ کو اپنا حلقہ اور ہر دیندار کو قابل قدر سمجھتے تھے۔ خیر وصلاح کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر حلقے میں ہے۔ اس لیے ایک حلقے سے محبت اور بقیہ دینی حلقوں سے نفرت شیخ کے نزدیک غلط بات تھی، وہ سب سے خلوص سے ملا کرتے تھے۔

اس طرح کی بات حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایسے جلیل القدر صحابی سے منقول ہے۔ فرماتے تھے ''میں دشمنوں سے بھی خلوص سے ملتا ہوں۔'' کسی نے پوچھا اور دوستوں سے؟ فرمایا اور کیا خوب فرمایا ''ان سے محبت سے ملتا ہوں۔''

تلاش خیر:

مولانا نے ہر حلقہ میں جا کر دیکھا کہ خیر وصلاح ہر طرف موجود ہے، اس لیے فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں پہلی حالت میں مر جاتا تو میرا خاتمہ بالخیر مشکل تھا۔ اب ان شاء اللہ خاتمہ بالخیر کی پوری امید ہے۔ (او کما قال) اور یہ اس لیے فرماتے تھے کہ پہلے ان کو حضرت مدنی اور ان

کے خانوادے سے سخت بغض تھا۔اس لیے ایک مرتبہ مانی کلاں چھوڑ کر اس لیے چلے گئے تھے کہ مولانا حسین احمد آرہے ہیں۔لیکن حضرت شیخ کے حلقہ میں آنے کے بعد وہ حضرت مدنی کی صاحبزادوں کا بھی ''مدظلہ'' کہہ کر نام لیتے تھے۔چنانچہ شوری میں جاتے تھے تو حضرت مدنی کے خانوادے اور حضرت قاری طیب صاحب کے حلقے سے پوری بشاشت سے ملا کرتے تھے اور اس کے باوجود ملتے تھے کہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا ایک طبقہ مولانا سے اس وجہ سے سخت ناراض تھا کہ وہ حضرت فتح پوری کے حلقے سے نکل گئے ہیں۔مگر مولانا اسے نفسانیت قرار دیتے تھے۔

اتباع رسول:

میں گورینی آٹھ سال رہا اور وہاں سے آئے ہوئے دسواں برس گزر رہا ہے۔اس پورے عرصہ میں مولانا کا تعلق بحمد للہ بڑھتا ہی رہا، کم نہیں ہوا۔اس لیے سال میں دو تین مرتبہ حاضر ہو کر ضرور سلام کر کے آتا تھا۔اور کبھی کبھی تو ایسے تحفے لے کر لوٹتا کہ دل و دماغ معطر ہو جاتے۔

مثال کے طور پر گزشتہ سال گورینی کے قریب ''بھڑ کڑ ہا'' ایک گاؤں ہے وہاں گیا تھا۔ وہاں حاجی مقبول صاحب سے میرا بہت تعلق ہے، وہاں سے واپس ہو کر حضرت مولانا کے پاس حاضر ہوا، جب واپس آنے لگا تو میں نے حسب عادت عرض کیا حضرت خاتمہ بالخیر کے لیے دعا فرمایئے گا، تو مولانا نے مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیے اور فرمایا ''میں اس کی دعا کیوں کروں؟ میں تو اس کی دعا کروں گا جس کی حضور ﷺ نے تاکید فرمائی ہے ''**اسئل الله العافية**'' یعنی تم خدا سے مانگو تو عافیت مانگا کرو۔یہ سن کر دل باغ باغ ہو گیا اور اب تک اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہے۔یہ حدیث میں نے بھی پڑھی اور پڑھائی ہے مگر نبی ﷺ کی ہر بات پر نگاہ رکھنے والے دوسرے ہوتے ہیں جو ہم جیسوں کو ٹوک دیتے ہیں اور ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔

حاضر دماغی:

اس مرتبہ شعبان سے پہلے پھر گورینی حاضر ہوا، جب مولانا کے کمرہ میں داخل ہوا تو وضو بنا کر اپنی جگہ آرہے تھے۔خدام سہارا دیے ہوئے تھے، کیوں کہ قویٰ کمزور ہو گئے تھے کہ خود سے چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔سلام مصافحہ کرتے ہوئے از خود پہچان لیا اور دریافت فرمایا کہ گھر سے یا گورکھ پور سے؟ میں نے عرض کیا کہ آج گھر سے آیا ہوں، کل گورکھ پور سے وہاں آیا تھا۔اس سے مجھے

اندازہ ہوا کے مولانا نے مجھے بھی پہچان لیا، گھر کو بھی اور گورکھ پور کو بھی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ۹۵/سال کی عمر میں جسم ضرور کمزور ہوگیا ہے مگر دل ودماغ پہلے کی طرح کام کررہے ہیں۔اور یہ ولایت کی علامت ہے کہ اللہ تعالی ارذل عمر کی علامتوں سے بچالیتے ہیں ورنہ دنیادار اس عمر میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔اپنے کو بھی، گھر بار کو بھی۔میں عافیت کی دعا کرتا ہوا باہر آیا اور گھر چلا گیا۔

کیا معلوم تھا یہ ملاقات آخری ملاقات ہے مگر عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا۔اس لیے خیال تھا کہ کسی بھی مہینے خبر آجائے گی۔چنانچہ میں تین ہفتے پہلے حیدرآباد جانے لگا تو گاڑی طے کر کے گیا تھا کہ پانچ چھ دن بعد چل کر مولانا کو دیکھ آویں گے۔سنا تھا کہ چوٹ آگئی ہے لیکن حیدرآباد میں دہلی کے فون سے معلوم ہوا کہ آج ہی ۹/بجے اللہ کا ولی، اللہ کے دربار میں حاضر ہوگیا۔برداللہ مضجعہ۔میں نے فوراً وہاں کے تمام اخباروں کو خبر بھیج دی اور صبح بہت جگہ قرآن خوانی ہوئی۔اللہ تعالی حضرت مولانا اور ان کے تمام محبین کو اپنی رضا سے نوازے اور مقام بلند عطا فرمائے۔آمین

محبت کے گرم آنسو:

مفتی محمد حنیف صاحب کی گردن میں خطرناک پھوڑا نکل آیا اور وہ آگ پانی کی طرح بڑھتا چلا گیا۔ڈاکٹروں نے اسے کینسر تجویز کر کے پورے مدرسہ میں کہرام مچادیا۔مفتی صاحب ریاض العلوم ایسے جامعہ میں جو دورۂ حدیث کا ادارہ ہوگیا ہے، صدر مدرس بھی تھے، صاحب افتا بھی اور مقبول استاذ بھی۔علم بھی ماشاءاللہ بہت تازہ اور ٹھوس ہے، اس وجہ سے پورا مدرسہ متأثر تھا۔

پورے مدرسہ کو سخت تشویش تھی کہ کینسر جیسے موذی مرض سے مولانا کس طرح نجات پائیں گے؟ اللہ رحم فرمائے۔لیکن مدرسہ کی اس فضا میں دو ایک ایسے بھی بزرگ تھے جو سوچنے لگے کہ مفتی صاحب کی گدی خالی ہورہی ہے، اس کو کون بھرے گا؟ کس کا نمبر ہے اور کیسے کیسے کرنا ہے؟ وہ لوگ مصروف ہوگئے، منصوبہ بندی اور تیاریوں کا ایک سلسلہ چل پڑا اور چلتا گیا۔

ادھر مفتی صاحب نے بمبئی کا سفر شروع کردیا اور مولوی عبدالرحیم جیسے چند حضرات کو لے کر روانہ ہونے لگے سارا ریاض العلوم، صحن مدرسہ میں سوگوار کھڑا تھا۔مفتی صاحب کے لیے

مدرسہ بھر کی طرف سے دعا ہوئی اور خوب ہوئی۔ جب مفتی صاحب موٹر میں بیٹھنے لگے تو میری نظر پڑی کہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب بھی موٹر کے پاس ہی کھڑے تھے اور محبت کے آنسو اپنے شاگرد بلکہ عمر بھر کے رفیقِ مدرسہ کے لیے حضرت کے رخساروں پر ڈھلکتے چلے گئے۔ یہ آنسو مفتی صاحب کی جدائی کے نہیں تھے، کیوں کہ ہمیشہ جدائیاں ہوتی رہتی ہیں مگر آج کی جدائی خطرناک جدائی تھی اور مستقبل تشویش ناک تھا۔ اس لیے ۸۵؍ برس کی بوڑھی آنکھیں بھی غم واندوہ سے لرز رہی تھی۔ کتنا اندوہ ناک تھا وہ منظر، مخلصانہ وسوگوار منظر!

اس فضا میں ریاض العلوم نے دعائیں کیں، حضرت مولانا نے مسلسل دعائیں کیں اور معلوم ہوا کہ قاری محمد صدیق صاحب نے بھی رو رو کر دعائیں کی تھیں۔ آخر خدا نے رحم فرمایا اور مفتی صاحب کینسر جیسے موذی مرض سے شفا پا گئے اور پھر دس برس سے نہ صرف درس حدیث دے رہے ہیں بلکہ حضرت مولانا نے اپنی جسمانی کمزوری کے بعد جمعرات کو اپنی جگہ بٹھا دیا کہ وعظ کہہ دیا کرو تو مفتی صاحب خوب خوب مشق سخن مہیا کر کے اچھے واعظ ومقرر اور دلچسپ خطیب ہو گئے۔

شخصیت:

دورۂ حدیث پرانی عمارت کے کمرے میں شروع کر دیا گیا مگر حضرت مولانا کی آرزو تھی کہ دارالحدیث بن جائے تو مولانا تقی صاحب مظاہری کو توجہ دلائی، اور وہ دبئی کے بڑے عالم اور مفتی ہیں۔ اس لیے شیوخ سے بڑے تعلقات ہیں تو سال بھر میں ۳۰x۶۰ فٹ کی عظیم الشان دارالحدیث مکمل ہوگئی اور اس میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں بھی کئی سال تک اس میں بخاری پڑھاتا رہا۔

ایک مرتبہ قلندر پور جانا ہوا، مولانا وکیل صاحب کے ساتھ گیا تھا۔ قلندر پور میں خود مولانا تقی صاحب اپنے کھیت میں ایک جامعہ بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے مشورہ کے بعد مولانا وکیل صاحب گئے تھے، میں خواہ مخواہ ساتھ چلا گیا تھا۔ مولانا تقی صاحب نے دوران گفتگو فرمایا کہ ’میں نے بہت سے مدارس میں کمرے بنوائے، مسجدیں بنوائی، دارالحدیث بنوائے مگر میرا ذکر کہیں نہیں ہے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ ایک بڑا دارالعلوم اپنے کھیتوں میں قائم کروں۔ غالبًا ۶۰۔۶۵؍

لاکھ میں اس نقشے کی عمارت تیار ہوجائے۔ دیکھئے نقشہ ٹھیک ہے؟'

اس سفر میں حضرت مولانا کے عزیز گرامی مولوی عبدالعظیم صاحب بھی گئے تھے، ان سے مولانا تقی صاحب نے خصوصی خطاب کرکے فرمایا اور بہت خوب فرمایا کہ ''دیکھو! حضرت مولانا نے گورینی میں کتنا بڑا جامعہ قائم کردیا ہے۔ حضرت مولانا نے بڑی محنت اور توجہ سے یہ مقام پایا ہے، یہ مقام علمی اور بزرگی کا مقام ہے۔''

پھر فرمایا کہ ''تم لوگ کوئی کمال پیدا کرو ورنہ مولانا کے بعد تمہارا کوئی مقام نہیں رہ جائے گا۔'' مولوی عظیم صاحب نے توجہ سے سنا اور مجھے ان کی جرأت وصاف گوئی بہت پیاری لگی۔ صاحبزادگی کا احترام اسی میں ہے کہ ان کو صحیح بات سمجھا دی جائے اور صحیح رخ پر ان کی زندگی ڈال دی جائے ورنہ سب سے گمراہ یہی قوم ہوتی ہے۔

مولانا تقی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ 'حضرت مولانا کی صحبت کو غنیمت سمجھئے اور جب تک وہ ہیں، کہیں جانے کا ارادہ نہ کیجیے گا، ورنہ آپ لوگ سیاسی آدمی ہیں ان چیزوں کی قدر نہ کریں گے تو پھر کہیں نہ ملے گی۔' میں نے عرض کیا کہ 'میں نے نیت یہی کی ہے کہ جب تک حضرت مولانا ہیں گورینی نہیں چھوڑوں گا مگر مولانا محمد حنیف صاحب کی خطرناک بیماری کے بعد میرے اور مولانا اعجاز احمد اعظمی کے خلاف جو سازشیں چلیں اور چلتی گئیں، ان کا تقاضا تھا کہ ریاض العلوم کو اکھاڑا بنانے کے بجائے اسے چھوڑ دیا جائے۔' چنانچہ ہم دونوں اساتذہ سالانہ امتحان تک کام کرکے خاموشی سے چلے آئے۔ حضرت مولانا کے احترام کی وجہ سے صرف مولانا وکیل احمد صاحب سے سلام کہلا دیا اور چلا گیا۔ مولانا سے ملنے بھی نہیں گیا کہ ممکن ہے کوئی بات فرمادیں اور میں اس کی تعمیل نہ کرسکوں تو افسوس ہوگا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ میرے دل میں حضرت مولانا کی عظمت بھی تھی، ان کے مدرسہ کی ترقی اور اس کی عرفی حیثیت کا احترام بھی تھا۔ اس وجہ سے چند آدمیوں کی سازش کی وجہ سے دل برداشتہ ہوکر مدرسہ کو نقصان پہنچانا ناشکری سمجھی اور چپکے سے چلا آیا۔

دعائے مقبول:

ریاض العلوم میں کبھی کبھی خصوصی دعائیں بھی ہوتیں اور حضرت مولانا کراتے تو پہلے

خطبہ مسنونہ پڑھتے پھر عربی میں مسنون دعائیں پڑھتے۔ آخر میں اردو میں دعا کرتے اور پورے انہماک سے کرتے۔ پورا مجمع آمین کہتا۔ دعا بڑے پرسوز انداز میں ہوتی تھی۔

کتب خانہ:

حضرت مولانا کو کتب خانہ کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی کسی عالم کو اگر مدرسہ دکھانے لگتے تو کتب خانہ ضرور دکھاتے اور اس کی کتابوں کی فراہمی کا بہت شوق سے انتظام کرتے تھے۔ اتفاق سے مولانا کو شاگرد بھی ایسا مل گیا ہے کہ کتب خانہ کا حافظ ہے۔ جس کتاب کا نام لیجیے بغیر رجسٹر دیکھے لاکر حاضر کر دے گا۔ نام بھی کیا پایا ہے 'مقبول'۔ خدا عمر دراز کرے۔

کتب خانہ کے لیے حضرت مولانا نے مجھ سے بارہا فرمایا کہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں کی فہرست بنا کر دو اور میں نے حاضر کر دی توجہ کے بعد ہزار کتابیں آجاتیں۔ ماشاءاللہ اس وقت کتب خانہ میں اسلامی فنون کی تمام متداول کتابیں موجود ہیں اور بہت سی تو کئی کئی نسخوں کی آگئی ہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سا مبارک کام حاجی رضوان صاحب کا ہے کہ انھوں نے بڑے ذوق وشوق سے ہزاروں کتابیں اکٹھی کر دی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ علمی آدمی نہیں ہے، بمبئی کے بڑے تاجر ہیں اور دل ودماغ معطر کر دینے والے دل نواز تاجر۔ انھوں نے حضرت مولانا کے لیے بھی کتابیں لیں اور خود اپنے ذاتی کتب خانہ کو بھی نیچے سے اوپر تک بھر دیا۔

مجلس شوری:

حضرت مولانا کے علم وفضل اور شخصیت کی وجہ سے علمائے کرام کی عظیم الشان مجلس شوری نے آپ کو دارالعلوم کے مشوروں کے لیے منتخب کر لیا تو برسوں آپ نے خدمت کی اور بلا رعایت کے سچی بات کہی۔ اچھے مشورے دیے اور جرأت مندانہ فیصلے کیے۔ چنانچہ مجلس شوری کا ہنگامی اجلاس جب دیوبند کے ڈاک بنگلے میں کیا گیا اور تمام قسم کے خطرات کے باوجود کیا گیا تو حضرت مولانا صورت حال سے واقفیت رکھتے ہوئے تشریف لائے، بلکہ اس ہنگامہ خیز مجلس کی صدارت بھی فرمائی جس میں ایک سے ایک جید عالم اور متبحر ہستیاں موجود تھیں۔ مگر سب نے صدارت کے لیے آپ کو منتخب فرمایا اور اس میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام

سے علاحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا تھا، ان کی جگہ حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب دامت برکاتہم کو اہتمام سپرد کردیا گیا تھا۔

کتنا عجیب حادثہ ہے کہ جس شخصیت کی صدارت میں دارالعلوم میں خاندانی جاگیرداری کے خاتمہ کے لیے اہم ترین اقدام کیا گیا تھا وہی شخصیت جب اپنے مدرسہ ریاض العلوم سے اٹھی تو اس حال میں اٹھی کہ مدرسہ کا تمام دروبست صاحبزادوں کے ہاتھ میں دے کر گئی اور پختہ کر کے گئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جاگیراداری مدارس دینیہ کا مقدر بن گئی ہے، ورنہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا وائس چانسلر ہر پانچ سال کے بعد بدل دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں جاگیرداری کا سوال ختم ہوگیا ہے اور مدارس اسلامیہ میں اتنے عظیم حادثہ کے بعد بھی جاری ہے۔ چنانچہ جن بزرگوں نے جاگیرداری ختم کرنے کے نام پر زمین وآسمان کے قلابے ملادیے تھے وہی مولانا اسعد صاحب دارالعلوم کو اپنے خاندان کی جاگیر بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اس کے دروبست پر اس طرح قابو پا گئے کہ مجلس شوریٰ کو جی حضوریوں کی پارٹی بنا کر رکھ دیا ہے۔ **فنعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا**

مولانا عبدالحلیم صاحب کے ساتھ آٹھ برس رہنے کے باوجود ان سے کبھی بھی نہیں اکتایا۔ ان کی کوئی بات خلاف شرع نہیں محسوس ہوئی، ان کی مجلس میں سنجیدگی شروع سے آخر تک قائم رہتی تھی۔ آپ جو بات چاہیں ان سے منوا نہیں سکتے تھے، وہ غور سے سننے کے عادی اور معقول جواب دینے کے پابند تھے۔

خطوط کے جواب پابندی سے دیتے تھے، کبھی خود لکھتے تھے مگر عموماً مولوی وکیل صاحب سے لکھواتے تھے جو ان کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ خلوص اور محبت کی مٹی سے ان کا مجسمہ تیار کیا گیا ہے۔ آخر آخر وقت تک حضرت مولانا کے جوابات وہی لکھتے رہے اور دوسرے کسی کو کبھی نہیں معلوم ہوسکا کہ کب لکھا گیا؟

ایک مرتبہ گونڈہ کے ایک مدرسہ سے میرے متعلق ایک طویل خط آیا کہ مہتمم افضال صاحب یہاں سے غصہ ہوکر چلے گئے ہیں، کوئی مہتمم عنایت فرمائیں۔ اراکین مدرسہ

حضرت مولانا معمول کے مطابق شام کو دفتر آئے اور مجھے بلوایا اور مجھے یہ خط دیا کہ یہ

لوگوں نے لکھا ہے۔ پھر جواب پوچھا کہ اس کا کیا جواب دوں؟ پھر فرمایا کہ میں نے یہ خط لکھوا دیا ہے، سن لیجیے۔ اس میں تین باتیں لکھی تھیں اور تینوں اصول تھے سوچنے اور عمل کے لیے۔

پہلا اصول:

خدا جب کوئی نعمت دیتا ہے اور اس کی قدر نہیں کی جاتی تو وہ نعمت چھین لی جاتی ہے۔

دوسرا اصول:

مہتمم کوئی ایسا سودا نہیں ہے جو بازار سے خرید کر بھیج دیا جائے۔ بہت تلاش کے بعد کام کے آدمی ملا کرتے ہیں۔

تیسرا جواب یہ کہ خط پر کسی کے دستخط نہیں تھے صرف اراکین مدرسہ لکھا تھا تو جواب لکھوا دیا کہ: ''جناب اراکین مدرسہ صاحب! سلام مسنون۔''

اس خط میں علم بھی ہے، متانت بھی ہے، ظرافت بھی۔ پھر ان لوگوں کا کوئی خط نہیں آیا اور شرمندگی عمر بھر کو مل گئی۔ یہ اراکین مدرسہ ایسے زمیندار اور تاجر تھے جنھوں نے اپنے گاؤں اور بمبئی کی کھولی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا مگر پیسے کا گھمنڈ بہت تھا۔ اس کا احمقانہ اظہار اس وقت مضحکہ خیز بن گیا جب مہتمم دارالعلوم قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم سے علاحدہ ہو گئے تو بمبئی میں ان دیہاتیوں نے پلان بنایا کہ اپنے مدرسہ کا مہتمم بنا کر قاری محمد طیب صاحب کو بلایا جائے، چاہے وہ دو ہزار لے لیں تین ہزار لے لیں مگر ضرور لایا جائے۔ پھر خدا جانے کس عقل مند نے ان کو روک دیا کہ وہ دیوبند نہیں گئے اور آج تک مہتمم کھوج رہے ہیں۔

مولانا کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ اگر ایسے اہم خطوط شائع کر دیے جائیں تو بہت سے لوگوں کو خط لکھنے، بات کرنے اور مسائل حل کرنے کا شعور آ جائے گا۔ اگر مولوی عبدالعظیم سلمہ اس کام کو مولوی عثمان قاسمی صاحب کے سپرد کر دیں تو اچھا کام ہو سکتا ہے اور وہ اس حلقے کی رہنمائی کر سکتے ہیں جو حضرت مولانا سے متعلق ہیں۔

حضرت مولانا کی سب اچھی یادگار ریاض العلوم ہے جو مشرقی یوپی کی اہم ترین درس گاہ ہے، اگر اس کی مثال پیش ہو سکتی ہے تو حضرت مولانا قاری صدیق صاحب کا مدرسہ ہے جو باندہ ضلع میں تعلیم و تربیت کا بہترین ادارہ ہے۔

ریاض العلوم نے چند برسوں میں جس طرح طویل وعریض دومنزلہ عمارت کھڑی کردی ہے وہ حضرت مولانا کی کرامت نہیں تو عظمت ضرور ہے۔

ریاض العلوم کی سب سے اہم اور قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہاں اطراف کے اضلاع کے بچوں کی اکثریت ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ جون پور سے دیوریا اور گورکھ پور تک جو حلقہ ارادت ہے وہ کھاتے پیتے لوگوں کا ہے۔تاجروں اور مالداروں کا ہے جو بمبئی،سعودی عرب اور ملایا وغیرہ میں رہتے ہیں۔اور مولانا کے ارادت مندوں کی اکثریت مولانا سے تعلق قلبی کی خاطر اپنے بچوں کو حفظ یا عربی کی تعلیم یہیں دلاتی ہے۔اس وجہ سے مدرسہ میں اطراف کے بچے بہت ہیں۔مگر مئو وغیرہ کے مدارس میں اکثریت بہار کے بچوں کی ہوتی ہے جو عموماً نمائشی طور سے پڑھنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں،اس لیے لاپرواہ ہوتے ہیں،خوب شرارت کرتے ہیں اور مدرسوں کو تفریح گاہ بنائے رکھتے ہیں۔مگر مولانا کا حلقہ ارادت جس طرح دیندار ہے اسی طرح اپنے بچوں کو دین دار بنا کر رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔خدا مولانا کو بھی مبارک کرے اور ان کے ارادت مندوں کو بھی۔

مولانا کا فارسی ذوق بہت اچھا تھا،تقریر میں اردو کے ساتھ فارسی کے اشعار خوب پڑھتے تھے۔عام طور سے مولوی صاحبان شعر پڑھتے ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹانگ ضرور توڑ دیتے ہیں۔مگر مولانا شعر صحیح پڑھتے تھے،فارسی کے بھی اور اردو کے بھی۔انھیں اچھے شعر یاد تھے غالباً سکندر نامہ وغیرہ تک فارسی پڑھی تھی۔

حضرت مولانا کے بعد مئی ۱۹۹۹ء کے آخری ہفتہ میں گورینی حاضری دی،مہمان خانہ میں اداسی نظر آئی،سخت اداسی جیسے کوئی رونق تھی جو ختم ہوگئی۔

مولانا کے صاحبزادگان مولوی عبدالرحیم صاحب اور مولوی عبدالعظیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔دونوں محبت سے ملے مگر باہم دور دور رہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اپنے کمرے میں تھے،پیشاب کرنے کے لیے اتفاقاً تنہا کھڑے ہوگئے مولوی عبدالرحیم صاحب دیکھ کر گھبرا گئے،جب تک پہنچے وہ زمین پر گر چکے تھے،کئی جگہ چوٹ آ گئی تھی۔بنارس لے گئے اور وہاں سے پھر تیسرے دن گھر لائے اور گھر ہی پر صبح نو بجے

ہوش وحواس میں انتقال ہوگیا۔

مولوی عبدالرحیم کہتے تھے کہ 'انتقال سے دو دن پہلے سے ان پر ایک عجیب قسم کا احساس طاری تھا۔ اس سے پہلے ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ ہر وقت 'لا الہ الا اللہ، الا اللہ، الا اللہ' کا ذکر کرتے رہتے تھے، بالجہر کرتے تھے اور مسلسل کرتے تھے۔ دوسری کوئی بات نہیں، دوا علاج میں اکثر کچھ فرمایا کرتے تھے، اس دفعہ کچھ نہیں فرمایا۔ کہنے لگے کہاں لے جا رہے ہو؟ ہم نے کہا بنارس تو سن کر خاموش ہوگئے۔ وہاں بھی مسلسل ذکر الٰہی چلتا رہا۔'

بنارس میں ایک (غیر مسلم) ڈاکٹر نے محسوس کیا کے تکلیف اور مایوسی سے آواز نہیں نکل رہی ہے تو اس نے مولانا کو تسکین دی، خاموش ہوگئے، پھر فرمانے لگے ''ڈاکٹر صاحب کو ذکر کی لذت یا بیماری کی لذت کی کچھ خبر نہیں۔ یہ بیماری کو عذاب سمجھتے ہیں حالاں کہ وہ رحمت ہے۔''

بحمدللہ ذکر کی حالت میں اپنے خدا سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے، صدیقین وشہدا کے ساتھ اٹھائے اور ہم سب کے لیے زادِ آخرت بنا دے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۱۹۹۹ء

تاریخ ساز ہندوستانی مسلمان

حکیم عبدالحمید صاحب

پچھلے اگست میں ہندوستان کا ایک عظیم حادثہ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کا انتقال ہے۔ان کے جانے سے دنیا کا یہ نقصان ہوا کہ ایک ایسا انسان نہیں رہا جس نے ۴۵ء سے پہلے لالٹین کی روشنی میں ہمدرد دواخانہ چلایا تھا،مگر وہی شخص ۸۲/برس کی عمر میں دنیا سے گیا ہے تو صرف اپنی محنت، تجربہ اور لگن سے ہمدرد یونیورسٹی قائم کر کے تغلق آباد کے ویرانے کو چاندنی چوک کی رونق دے گیا۔اسی لیے جواہر لعل کو جب کسی انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے لیے حکیم صاحب نے بلایا تو پنڈت نہرو نے پروگرام دیکھ کر کہا کہ 'یہ کام حکومتیں کیا کرتی ہیں، اور اگر دوسرا کوئی کردے تو معجزہ سے کم نہیں۔' پھر افتتاح کیا تو کہا کہ 'میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا کام تنہا حکیم صاحب کس طرح کرلیں گے؟ لیکن جب حکیم صاحب کا حکم ہے تو میں افتتاح کیے دیتا ہوں۔' یہ اس وقت کی بات ہے جب یونیورسٹی کی پلاننگ بھی نہیں ہوئی تھی۔اگر ہمدرد یونیورسٹی اور جڑی بوٹیوں کا گل کدہ دیکھتے تو جواہر لال کو یقین نہ آتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت؟ یہ تھے حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اور ان کی فکری عظمت، کاموں کی ندرت اور عزائم کا طوفان کہ دنیا کا عظیم انقلابی رہنما جواہر لعل نہرو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔افسوس کہ وہ حکیم عبدالحمید ہندوستان سے رخصت ہو گئے،مگر خدا کا شکر ہے کہ اپنا کام مکمل کر کے گئے۔ان کی لائبریری، ان کا مطب، ان کا دواخانہ، کارخانہ اور ان کے مختلف قسم کے کالج ثابت کرتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی موجودہ ہندوستان میں بھی کام کرنے کا ارادہ کرے تو خدا اس کے ایسی ہی مدد کرتا ہے، جیسے حکیم صاحب کو بام عروج پر پہنچادیا، جہاں کوئی وزارت پہنچ سکتی ہے، نہ صدارت۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۱۹۹۹ء

ہندوستان کا مایہ ناز مسلمان
حکیم عبدالحمید صاحب

ہندوستانی کی آبادی سو کڑوڑ پہنچ رہی ہے مگر انسانوں کے اس جنگل میں حکیم عبدالحمید کے قد کا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، جس نے ۴۷ء میں صفر سے کام شروع کیا تھا مگر آج وہ اٹھ کر گئے ہیں تو ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو علم وفن، تجربہ ومہارت، تعلیم وتربیت، حوصلہ اور لگن دے کر گئے ہیں اور ایسی ایسی علمی فنی تجرباتی اور معلوماتی یادگاریں، چلتی پھرتی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جو صدیوں ان کا نام، ان کا فن اور ان کی ولولہ انگیزیوں کو زندہ رکھیں گی۔

قبلہ حکیم صاحب ہماری دنیا میں ۱۹۱۸ء میں آ گئے تھے مگر نمایاں اس وقت ہوئے جب ملک تقسیم ہو گیا مگر حکیم عبدالحمید صاحب تقسیم نہیں ہوئے۔ ۴۷ء کا دہلی پنجاب کی طرح اجڑ گیا، قرول باغ کی طرح لٹ گیا اور سبزی منڈی کی طرح تہس نہس ہو گیا مگر جو بچ گیا اس میں حکیم عبدالحمید صاحب بھی تھے جو مولانا حفظ الرحمان کی طرح دہلی میں مرنا بھی طے کر چکے تھے اور جینا بھی۔ مگر اس وقت انھیں دہلی میں کوئی نہیں جانتا تھا، اگر جانتا تھا تو اس حفظ الرحمان جیسا جیالا جانتا تھا جو پٹتے ہوئے مسلمانوں کو چھڑا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا لیتا تھا۔ جس نے برستے خون اور دہکتی آگ میں سے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو لے جا کر پناہ گاہوں میں پہنچایا تھا اور جب دہلی کے میر صاحب نے اس مرد مجاہد پر ترس کھا کر ان کو مشورہ دیا تھا کہ ''مولانا! خدا کے لیے آپ کسی پناہ گاہ میں آ جائیے، سڑکوں پر نہ گھومئے، دہلی پاگل ہو گیا ہے، اگر کچھ ہو گیا تو ہم دنیا میں کہیں منھ نہ دکھا سکیں گے۔'' مگر مولانا نے برجستہ جواب دیا تھا کہ ''حفظ الرحمان دہلی کی سڑکوں پر مرجانا پسند کرتا ہے مگر اپنے وطن میں رفیوجی بن کر جینے کے لیے ایک منٹ بھی تیار نہیں۔''

مولانا نے للکار کر پھر فرمایا کہ ''میر صاحب! آپ اپنے شہر کی فکر کیجیے، حفظ الرحمان کی

فکر نہ کیجیے، اسے خدا پر چھوڑ دیجیے۔''

ایسے مرد مجاہد کے تیور دیکھ کر جن لوگوں نے دہلی میں رہ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا ان میں نوجوان حکیم عبدالحمید صاحب بھی تھے، جن کا خاندان پاکستان جاچکا تھا۔ احباب بھی وطن سے بھاگ گئے تھے مگر حکیم صاحب اسے بزدلی سمجھتے تھے۔ اس لیے خدا کے بھروسے پر اپنی دوکان چھوڑ کر کہیں نہیں گئے مگر جب کسٹوڈین کے اندھے بہرے قانون نے دوکان پر ہاتھ ڈالا تو مولانا کے مشورہ سے اسے وقف کر دیا اور متولی بن کر جم گئے اور وار خالی دے دیا۔ حکیم عبدالحمید صاحب کو خدا نے تدبیر حوصلہ اور حکمت کے عناصر سے ڈھالا تھا، اس لیے انھوں نے محنت، حسن تدبیر اور محبت سے کام لے کر دوکان کو ترقی دی، سستی دوائیں بنائیں اور انھیں دہلی سے بڑھ کر اطراف کے اضلاع میں پہنچانا شروع کر دیا تو یونانی دواؤں کے چلن کی وجہ سے انھیں قبولیت ملی اور ہر طرف ہمدرد کی ایجنسیاں کھل گئیں، اسٹاکسٹ بن گئے اور بنتے چلے گئے تو ان کی دوائیں ملک بھر میں پھیل گئیں اور ان کا دواخانہ اب دواؤں کا کارخانہ بنتا چلا گیا۔ عام دواخانوں میں جو دوائی تولہ ماشہ کے حساب سے ملتی تھیں حکیم صاحب کے یہاں سیروں اور منوں سے سپلائی ہونے لگیں اور گاؤں گاؤں پہنچ گئیں۔

اولوالعزمی

حکیم صاحب کی عالی ظرفی اور اولوالعزمی کا یہ حال کہ کسی دوست نے شربت روح افزا پر اعتراض کر دیا تو معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ حکیم صاحب نے سپریم کورٹ تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سائنٹفک انداز سے ثابت کر کے لوٹے کہ اس شربت کا ہر جز صحیح ہے اور واقعی روح افزا ہے۔ یہ جنگ دراصل اپنی ساکھ کی جنگ تھی جو اس طرح لڑی گئی کہ حکیم صاحب کو عدالت نے بھی داد دی اور پورے ملک میں اس کا استقبال ہوا اور ملاوٹ کہنے والوں کے منھ پر سیاہی پوت دی گئی۔

مجلس مشورہ:

قاضی سجاد حسین صاحب مدرسہ عالیہ فتح پوری کے شیخ الحدیث تھے۔ دہلی کے ممتاز عالم نازک مزاج بڑے غیور اور نکتہ رس بزرگ تھے۔ حکیم صاحب ان پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ اس

لیے حکیم صاحب نے ایسے ایسے چند علما اور دانشوروں کو منتخب کر لیا تھا جن کے علم و فضل، سوجھ بوجھ، فکر و نظر پر انھیں بھروسہ تھا۔

حکیم صاحب کسی موضوع پر غور کرتے تو اس فن سے متعلق افراد اور اپنی اہم شخصیتوں کو کسی متعین تاریخ پر کسی مخصوص مقام پر جس کا علم کم کسی کو ہوتا تھا، وقت مقرر کر کے مدعو کر لیتے تھے۔ پھر وہاں دن بھر کے لیے ضرورت کی تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں تا کہ یکسوئی سے مشورہ ہو سکے۔ وہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔ حکیم صاحب وقت مقررہ پر اپنے ان اہم افراد کو گاڑی بھیج کر بلواتے تھے اور پھر اپنی گاڑی سے ہر ایک کو علاحدہ علاحدہ ان کے گھروں تک پہنچواتے تھے۔

مشورہ گاہ:

اس جگہ بیٹھ کر دن بھر ان سے مشورہ کرتے، نقشے، ترمیم، تنسیخ، پروگرام اور بجٹ بناتے تھے اور تمام متعلقہ کاغذات اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس طرح اس میں ان کو کئی کئی دن یا مہینے بھی لگ جاتے تھے مگر جب مطمئن ہو جاتے تھے تب ہی اسکیم شروع ہوتی تھی۔ پھر خود ہی اس کی دیکھ بھال کرتے مشورے کرتے رہتے۔ درمیان میں انجینئر اور آرگنائزر جو ہوتا تھا حکیم صاحب ان کے ہر کام سے واقف رہتے تھے اور مفید مشورہ دیا کرتے تھے۔

نظم و ضبط:

حکیم صاحب نے ایک خاص کمرہ ترتیب دے رکھا تھا اس میں ان کے مختلف کاموں سے متعلق ۶۰۰ رسو فائلیں ترتیب اور سلیقہ سے رکھی رہتی تھیں۔ حکیم صاحب جب بھی رات میں یا دن میں اس میں پہنچ جاتے تھے اور کوئی بھی فائل طلب فرماتے، اس میں سے اگر ضرورت ہوتی تو نوٹ کر لیا ورنہ خود اس میں لکھ کر رکھ دیا اور تشریف لے آئے۔ اس کمرے میں ان کا ماضی، مستقبل اور افراد اولوالعزماں بند تھے۔ اس لیے کمرے میں کوئی دوسرا نہیں جا سکتا تھا۔ صرف وہ داخل ہو سکتا تھا جسے وہ طلب فرماتے۔ اس کمرے میں رہائش کی تمام ضروریات ہمہ وقت مہیا رہتی تھیں۔

کارکنوں کی تربیت کا انداز:

حکیم صاحب نے اپنے ساتھ اچھا خاصا عملہ لگا رکھا تھا، اس میں نئے پرانے، پڑھے لکھے اور جاہل سبھی ہوتے تھے۔ چھوٹے بھی بڑے بھی ہوتے تھے۔ کارکنوں کے اس ہجوم میں کسی سے

کوتاہی ہو جانا غلط فہمی ہو جانا یا کوئی شکوہ شکایت قدرتی بات ہے۔ ہر جگہ ہوتی ہے اور ہمیشہ ہوگی۔

حکیم صاحب کسی ملازم کو اپنے دفتر میں بلا کر کبھی اس کو رسوا نہیں کرتے تھے، تنبیہ نہیں فرماتے تھے، شکوہ و شکایت نہیں کرتے تھے۔ ان کے کام کا عجیب طریقہ تھا عجیب ترین سلیقہ کہ صبح یا شام یا رات کو کواچانک اس ملازم کے گھر پہنچ گئے، اس سے موضوع پر بات کی، سمجھا دیا، صورت حال بتادی اور پھر واپس چلے گئے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر ان ملازمین پر پڑتا تھا جو پرانے کارکن ہوتے تھے یا مخلص ہوتے تھے۔ بہت سے ملازم تو مبہوت ہو جاتے تھے کہ اونٹ کے سامنے پہاڑ کھڑا ہے۔ چنانچہ وہ دب جاتے تھے اور مسائل اپنے آپ حل ہو جاتے تھے۔ جب کہ ہم ملازمین کو دفتر میں بلا کر انھیں اپنی شان دکھا کر دبانا چاہتے ہیں اور وہ اس طرح دب نہیں سکتے۔ اس لیے کشمکش پیدا ہوتی چلی جاتی ہے مگر ان کا حسن تدبیر کتنا عجیب و غریب تھا!!

کہاں سے کہاں تک:

ہم نے دیکھا کہ انھوں نے لال کنواں پر شاندار بلڈنگ بنائی، دواخانہ، کارخانہ اور مطب چلائے پھر ان کو اپنی جگہ چھوڑ کر تغلق آباد اور آصف علی روڈ پہنچے تو کہیں شاندار لائبریری، کہیں دواخانہ، کہیں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حتیٰ کہ تغلق آباد میں پوری یونی ورسٹی قائم کر دی اور کسی سے چندہ نہیں کیا، البتہ لوگوں کو چندے بھی دیتے رہے۔

اس طرح مختلف قسم کے ماہرین دانشوروں اور علما سے مشورے کرتے ہوئے حکیم صاحب نے تن تنہا مختلف قسم کے مراکز قائم کر دیے اور جس کو قائم کیا، شاہ جہاں کی طرح اسے مخصوص شکل و شباہت دی، اس کا انتظام و انصرام کیا اور تمام متعلقہ عملہ ماہرین اور دانشور مہیا کیے۔

حکیم صاحب نے ایک دواؤں کی دوکان سے آگے بڑھ کر یونی ورسٹی کی وسعت تک کام کیا، اسے استحکام بخشا اور اپنے پیچھے قسم قسم کی ذمہ داریاں چھوڑ کر اپنے مالک کے دربار میں پہنچ گئے۔

حکیم صاحب نے اربوں کمایا، کھربوں صرف کیا اور صرف دواؤں کے لیے، علم و حکمت کے لیے، قوم و وطن کے لیے، ملت اور مستقبل کے لیے کیا۔ شاہ جہاں بادشاہ تھا، اگر اس نے شاہی مسجد، تاج محل اور شالیمار باغ اور لال قلعہ بنا کر پتھر اور چونے کی عمارتیں کھڑی کر دیں تو حکیم صاحب ایسے فقیر منش کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اپنی ہمت، مردانگی، محنت اور سخت کوشی سے علم و

فن کی بہاریں یادگار چھوڑی ہیں جو ہندوستان کی ہر قوم، ہر خطے اور ہر نسل کے لیے تعمیر و ترقی کی راہ دکھاتی رہیں گی اور حکیم صاحب کو دعا دیتی رہیں گی۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

میں ۱۹۷۸ء میں الجمعیۃ اخبار کا منیجر بن گیا تھا۔ ناز انصاری اور رفیق صاحب ایڈیٹر تھے۔ جمعیۃ العلما کے پاس اس روزنامہ اخبار کو چھاپنے کے لیے ایک پریس تھا، اس کی بلڈنگ تھی اور پورا عملہ تھا۔ اتفاق سے ایک روز صبح کو چپراسی آیا اور الجمعیۃ کا ایک پرچہ دے کر چلا گیا اور صرف یہ کہا کہ حکیم صاحب نے بھیجا ہے کہ منیجر صاحب کو دے آؤ اور سلام کہہ دینا۔ میں نے عملہ سے پوچھا کہ کون ہیں یہ حکیم صاحب؟ تو معلوم ہوا کہ حکیم عبدالحمید صاحب نے بھیجا ہے۔ کھول کر دیکھا تو اخبار کا اندر والا صفحہ خراب چھپ گیا تھا اور اس کو ردی میں ڈالنے کی جگہ ہاکر کو دے دیا گیا اور ہاکر نے حکیم صاحب کے دفتر پہنچا دیا تھا۔ وہاں کئی اخبار جاتے تھے، ایک قدوائی صاحب کو، دوسرا حکیم صاحب کو، تیسرا منیجر صاحب کو وغیرہ۔

حکیم صاحب الجمعیۃ بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے، اس لیے ان کو خراب چھپائی سے الجھن ہوئی۔ مگر ان کی سنجیدگی، حکمت اور خلوص نے شور نہیں مچایا، کسی سے کچھ نہیں فرمایا، صرف چپراسی کو بلا کر منیجر کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج دیا۔ جب مجھے صورت حال معلوم ہوئی تو فوراً دفتر سے اخبار کی دوسری کاپی بھجوائی، معذرت کی اور پھر رات کو دو بجے جا کر پریس میں دیکھا کہ غلطی کتابت کی ہے یا طباعت کی یا عملہ کی؟ معلوم ہوا کہ عملہ کی لاپرواہی سے پلیٹ صاف نہیں کی گئی، روشنائی والا غائب تھا اس وجہ سے طباعت خراب ہوئی۔

منیجر اخبار کا اس طرح دو بجے رات کو چھاپہ ڈالنا ایک عجیب بات تھی، اس لیے عملہ کی اصلاح ہوگئی اور بہت دنوں تک یہ بات گشت کرتی رہی کہ حکیم صاحب کے یہاں اخبار غلط پہنچ گیا۔

یہ تھی حکیم صاحب کی ایک معمولی تدبیر کہ انھوں نے ہماری طرح ہاکر سے یا پریس سے یا عملہ سے کچھ نہیں کہا، ایڈیٹر سے کوئی شکایت نہیں فرمائی، سیدھے منیجر کی میز پر رکھ کر اس کی لاپرواہی ثابت کردی۔ اور یہ ایسی گوشمالی تھی جس سے پریس وغیرہ سب ٹھیک ہوگئے اور حکیم صاحب کی ذہانت اور اپنی نادانی اب تک یاد ہے۔ تیس برس ہوگئے اس داستان کو مگر ذہن پر نقش ہے حکیم

صاحب کی حکمت۔

میں دارالعلوم امروہہ میں رہتا تھا، بیمار پڑ گیا تو تیسرے دن شام کو شکم میں شدید درد ہونے لگا، دوا کام نہیں کر سکی تو شہر کے مشہور طبیب حکیم محمد احمد کو بلوایا، انھوں نے نبض دیکھی فوراً دوا منگائی اور پھر صبح دیکھنے آئے تو مجھے تعجب ہوا۔ کہنے لگے تم کو آنتوں کی تکلیف ہے مگر اب قابو میں ہے۔ چوتھے دن میں اچھا ہو گیا تو ڈاکٹر زاہد نے یہ سن کر کہ اپنڈکس ہو گیا تھا، سر پیٹ لیا کہ جا کر آپریشن کراؤ، ورنہ یہ حکیم مار ڈالیں گے۔ تم فوراً دہلی جاؤ، جاؤ دہلی۔

میں دہلی گیا تو مولانا اسعد صاحب مجھے لے کر حکیم عبدالحمید صاحب کے پاس گئے کہ حکیم صاحب احتیاطاً ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ رکھتے ہیں، تا کہ ایسا کوئی مرض ہو تو اس کے حوالہ کر دیں ورنہ یونانی علاج کر دیں۔

وہاں گئے تو مطب میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، ہر سائز کے بڑے چھوٹے حضرات موجود تھے، مگر حکیم صاحب نے سنا تو بلوایا۔ مولانا مجھے لے کر پہنچے تو حکیم صاحب نے حال سنا، نبض دیکھی اور دوا لکھ دی، جس میں ہتیت یعنی ہینگ بھی تھی۔ کل تین دوائیں تھیں۔ میں نے شام کے وقت کھالی اور دست شروع ہوئے تو ۲۲/دست رات بھر میں آ گئے۔ میں اتنا نڈھال ہو گیا کہ سعودیہ سے میرا لڑکا راشد آیا تو لیٹے لیٹے مصافحہ کر لیا مگر دوپہر تک دست بند ہو گئے اور شکم کی تکلیف ختم ہو گئی اور پھر میں گھر چلا گیا اعظم گڑھ۔

واپسی میں بڑے بیٹے ارشد کے ساتھ علی گڑھ آیا تو اس نے میڈیکل کالج کے بڑے ڈاکٹر کو دکھلایا۔ ڈاکٹر صاحب کو کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تم کو اپنڈکس ہوا تھا۔ میں نے نسخے دکھلائے تو اندر لے جا کر خوب زور زور سے شکم دبایا اور فرمایا کہ تم کو اب کوئی شکایت نہیں ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اتنا خطرناک مرض اور صرف دواؤں سے اچھا ہو گیا۔

میں نے واپس جا کر امروہہ کے استاذ الاساتذہ حکیم محمد احمد صاحب سے دریافت کیا کہ یہ مرض کیا تھا اور کیوں مشہور ہے اتنا خطرناک؟ انھوں نے کہا کہ حکیم زکریا رازی نے اس پر بحث کی ہے۔ یہ آنتوں کا ایک حصہ ہے جو فاضل اور خراب رطوبتوں کو جذب کر کے آنتوں کے راستے باہر کر دیتا ہے مگر کبھی رطوبتیں بہت جمع ہو جاتی ہیں تو خود اس میں ورم آ جاتا ہے تو رطوبتوں کو صاف

کرنے کے لیے دست آور دوائیں دی جاتی ہیں اور وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ تم بھی اسی طرح ٹھیک ہوئے ہو۔ میں نے کہا کہ رطوبتوں کو جذب کرنے کی کوئی دوا ہے؟ انھوں نے برجستہ فرمایا کہ بھنا ہوا چنا بہت مفید ہے وہ جذب کر لیتا ہے رطوبتیں۔

تقریباً ۳۳؍ برس ہو گئے حکیم صاحب کے علاج سے جو شفا ہوئی تھی وہ بحمد للہ اب تک قائم ہے۔ پھر کبھی ایسی شکایت نہیں ہوئی۔ یہ تھی ان کی تجویز و تشخیص کی کیفیت اور اس پر ان کا اطمینان۔

ایک مرتبہ مولانا مجاہدالاسلام قاسمی صاحب مدظلہ نے فقہ اکیڈمی کا اجلاس کیا تو مجھے بھی مدعو کیا اور اجلاس تغلق آباد میں حکیم صاحب کی لائبریری کے پاس تھا۔ ایک بڑا سا ہال تھا اس میں علمائے کرام کرسیوں پر تشریف رکھتے تھے، اور میری زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ میرے سامنے جو لاؤڈ اسپیکر بولنے کے لیے رکھا ہوا تھا، وہیں ایک مشین رکھی تھی جو مقرر کی تقریر کو مخاطب کی مرضی کے مطابق انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں برجستہ منتقل کر کے پہنچاتی تھی۔ اس لیے جس کا جس زبان میں چاہے وہ بولے، سننے والا اپنی زبان میں سن سکتا ہے۔

اس طرح حکیم صاحب نے اگر کسی اجلاس کا انتظام بھی فرمایا تھا تو ایسا مستحکم، تازہ اور سہولت والا انتظام کرایا تھا کہ جس زمانے سے گزر رہے ہیں اس کے ساتھ چلیں، صرف تماشائی نہ رہ جائیں، ورنہ اچھی اچھی اسمبلیوں میں ابھی ایسا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

حکیم صاحب تنہا آئے تھے تنہا واپس چلے گئے مگر حدیث میں ہے کہ ہر آدمی کا عمل اس کے ساتھ میدان حشر تک جائے گا تو حکیم صاحب کو پہنچانے کے لیے ہمدرد دواخانہ، ہمدرد دوائیں، ہمدرد ایجنسیاں، اسکول یونی ورسٹی اور صدہا ادارے ساتھ گئے ہوں گے اور ان کے آگے پیچھے ان کی خدمت کرتے ہوں گے۔

پھر ان کے ساتھ ہزاروں علما، بزرگان دین، غربا، مفلوک الحال لوگوں کی ارواح ہوں گی جن کے ساتھ حکیم صاحب کا حسن سلوک ہمیشہ کام کرتا تھا اور ان کی دعائیں لیتا تھا۔

وہ اس قدر مصروف زندگی گزارنے کے باوجود نماز روزہ کے سخت پابند تھے اور ایک عالم کی طرح ان باتوں کا اہتمام فرماتے تھے۔

ادھر کافی دنوں سے بستر پر تھے اور کل (۲۲؍جولائی ۱۹۹۹ء) دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر عالم آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ روحیں آ کر اپنے ساتھ بھی کسی کو لے جاتی ہیں تو ان شاء اللہ حکیم صاحب کے ساتھ ایسا ضرور ہوا ہوگا۔ اور اس وقت وہ '' **نـم کـنـومة العروس** '' والی خوش خبری کے مطابق عمر بھر کی تکان کے بعد ٹھاٹ سے آرام فرما ہوں گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ حکومت متعصب ہے، ہر جگہ فرقہ پرستی کا زہر ہے، فضا بہت خراب ہے اور یہ سب ٹھیک کہتے ہیں اور محترم حکیم صاحب کے ساتھ یہ سب ہوا مگر ان کی ہمت، اولوالعزمی اور حسن تدبیر نے کبھی کسی کی شکایت نہیں کی، کسی چٹان سے نہیں ٹکرائے بلکہ اسے پھلانگ کر گزر گئے۔ آندھیاں چلیں تو ان سے ٹکرائے نہیں، اپنا رخ بدل کر بیٹھ گئے اور جب فضا صاف ہوگئی تو پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

انھوں نے کبھی کسی دفتر سے، محکمہ سے، افسر یا ممبر سے یا چیئر مین سے جنگ نہیں کی نہ کوئی مقدمہ کیا۔ البتہ زمین خریدی اور وہ بھی ایسی خراب جہاں دن کو بھی کوئی نہیں گزرتا تھا، کئی ہزار ایکڑ کا میدان اور وہاں کام شروع کرایا۔ ہر کام سلیقے سے، نقشے سے، ضرورت کے مطابق اور زمانہ کے مطابق شروع کیا، اسے انجام تک پہنچا کر دم لیا، تب اس کے بعد دوسرا کام شروع کیا اور اس کو بھی اس کے اصولوں، نقشوں اور پروگرام کے مطابق تکمیل تک پہنچاتے گئے۔

انھوں نے حکومت سے نہ بھیک مانگی، نہ حق وصول کیا، نہ خوشامد کی، نہ کوئی تکڑم لگائی۔ بس جو کام کیا اپنی آمدنی کے مطابق اپنی طاقت کے مطابق کیا اور ہر جگہ اپنی پونجی سے کام شروع کیا اور اسے انجام تک پہنچا کر دکھا دیا کہ ہندوستان میں کام کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔ خاموش، متحرک، سرگرم اور اولوالعزمی کے ساتھ کرتے چلے گئے۔

اس لیے حکیم صاحب ایک آئیڈیل اور نمونہ تھے۔ مشکل کاموں کے لیے اور الجھے ہوئے ماحول کو سازگار بنانے کے لیے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے لیے بھی فخر کی بات ہے کہ حکیم عبدالحمید جیسا آدمی ان کے وطن میں تھا جس نے علوم وفنون کے لیے زندگی نچھاور کردی

اور پورے ماحول کو سجا کر تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب کو خدا نے نہ زبان دی تھی، نہ قلم دیا تھا، نہ علم سے مالا مال کیا تھا مگر وہ خاموش رہنا جانتے تھے۔ وہ بولنے کی ضرورت، مواقع اور انداز سے واقف تھے۔ انھیں مستقبل کی فکر تھی، اس کے لیے حسن تدبیر اور اچھے ساتھی تلاش کرنا آتا تھا، اس کے باوجود بڑی بڑی کانفرنسوں میں جاتے تھے اور خاموشی سے کوئی مشورہ دے آیا کرتے تھے۔ خدا نے سوجھ بوجھ اور لگن بہت دی تھی۔

دہلی میں ایک تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس کے صدر استقبالیہ حکیم صاحب بنائے گئے۔ اس میں ہر ملک سے لوگ بلائے گئے تھے۔ علی گڑھ سے ایک خاصا وفد آیا اور دوسرے مقامات سے پڑھے لکھے افراد اور جماعتیں شریک ہوئیں۔ حکیم صاحب نے مجلس استقبالیہ سے صاف کہہ دیا کہ نہ میں مقرر ہوں نہ کاتب۔ اس لیے آپ کسی سے خطبہ استقبالیہ لکھوا کر پڑھوا دیجیے گا۔ چنانچہ مولانا اسعد صاحب نے مجھ سے فرمایا اور میں نے خطبہ استقبالیہ تیار کر دیا جو حکیم صاحب کی موجودگی میں ان کے نام سے اجلاس میں پڑھا گیا اور حکیم صاحب سنتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک تماشہ ہے جو ہوتا رہتا ہے اور ہوگیا۔ نہ اس کی اہمیت پڑھنے سے پہلے تھی نہ پڑھنے کے بعد۔ اس لیے حکیم صاحب پر اس کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا مگر دوسروں کی خاطر انکار بھی نہیں کیا کہ ان کا کام ہوجائے گا۔

میں حکیم صاحب کو ۴۰ ربرس سے دیکھ رہا ہوں، ان کی جو وضع قطع پہلے تھی وہی آج تک قائم رہی۔ ٹوپی، کرتا، پاجامہ، شیروانی اور دہلوی جوتا مگر اس معمولی لباس میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر بھی تھے اور ان کے دستخط سے لوگ پرنسپل اور وائس چانسلر بن جایا کرتے تھے۔ وہ جہاں گئے جس محفل میں گئے، دہلی کے حکیم صاحب تھے۔ ان کی وضع قطع کبھی نہیں بدلی، کہیں نہیں بدلی۔ بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ''ہماری عزت لباس سے نہیں ہے، ہماری عزت کے لیے اسلام کافی ہے۔'' اس طرح حکیم صاحب کسی مصنوعی عزت کے دلدادہ نہیں تھے۔ ان کا فن ان کی عزت واحترام کے لیے بالکل کافی تھا اور اس نے ان کو جو حقیقی عزت بخشی تھی وہ ان کے بعد بھی برسوں باقی رہے گی۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۱۹۹۹

مولانا ریاض الدین مرحوم

بلرام پور سے اطلاع ملی کہ میرے شاگرد مولانا ریاض الدین دوپہر بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میں گونڈہ ہوکر دوپہر کو پہنچا تو ان کے اعزہ انھیں غسل دے رہے تھے۔ میں نے بھی اس سعادت میں حصہ لیا اور ان کا غسل مکمل کرادیا۔

معلوم ہوا کہ مرحوم نے گونڈہ جاکر مدرسہ فرقانیہ کے مہتمم صاحب کو تاکید کردی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مجھے سنت کے مطابق غسل دیا جائے اور آپ اپنی نگرانی میں غسل دلائیں، مگر مہتمم صاحب کسی اور جگہ چلے گئے تھے، ان کا داماد آیا تھا۔ میں نے اور ان کے داماد نے غسل مکمل کرایا اور کفن پہنا کر باہر آگئے۔

شام کو قبرستان پہنچے تو وہاں شاندار بلکہ بہت شاندار مقبرہ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ مرحوم کے حقیقی دادا کا مقبرہ ہے اور سالانہ رسوم اور ان کے نام سے عرس ہوتا ہے، مگر مرحوم نے قوالی، گاگر اور گانے بجانے میں کبھی شرکت نہیں کی۔ ہمیشہ ان باتوں کو خلاف سنت، خلاف شرع اور بدعت کہا کرتے تھے۔ آج مولانا کی قبر دادا سے چند گز کے فاصلہ پر بنائی گئی اور وہیں مولانا کے والد حکیم صاحب کی بھی قبر موجود ہے۔ ہم نے چند منٹ فاتحہ پڑھی، جب تک آنے والے لوگ آگئے تو سوال ہوا کہ مولانا نے کسی کو وصیت کی تھی؟ معلوم ہوا کہ گونڈہ مدرسہ کے مہتمم صاحب کو آمد و رفت کا کرایہ دے کر آئے تھے کہ نماز جنازہ پڑھا دیں گے۔ اگر وہ نہ آئیں تو نائب مہتمم، وہ نہ آئیں تو بہرائچ کے مولانا کلیم اللہ صاحب اور وہ بھی نہ ہوں تو ایک حافظ صاحب جو بہرائچ میں مدرس ہیں، اورانٹیا تھوک کے ہیں۔ اتفاق سے حافظ صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے عرض کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں پڑھا دوں، اور راقم الحروف نے نماز جنازہ پڑھا کر ان کی تمنا پوری کردی۔

ان کی زندگی پریشانی میں گزری مگر یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی تجہیز و تدفین کے لیے کتنے مہینے سے کس قدر فکرمند تھے، اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر کس زور و ہمت سے اہل خیر کو بلانے کا اہتمام کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے سارا انتظام کر دیا۔ چنانچہ پورے بلرام پور کے دوستوں اور عزیزوں کی فہرست بنا گئے تھے کہ اگر یہ چالیس آدمی آجائیں گے تو میری بخشش ہو جاوے گی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بلرام پور، انٹاتھوک اور دوسری جگہوں سے ان کے اندازہ سے کئی گنا زیادہ آدمی وہاں آ گئے، اور سب نے ان کے لیے نماز پڑھی اور دعائے مغفرت فرمائی۔ پھر قبر پر کھڑے ہو کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرح سورہ بقرہ کا اول و آخر پڑھا گیا اور مرحوم کے لیے ثابت قدمی، رحمت و مغفرت کی دعا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

یہ نصیب کی بات ہے کہ ایک غریب آدمی نے اپنی قبر کی پہلی منزل روشن کرنے کے لیے اتنا اہتمام کر لیا تھا۔ خدا ہمیں بھی توفیق دے کہ ہم اپنی مغفرت کے لیے اسی طرح کا اہتمام کر سکیں اور ہمیں سفر کی آخری منزل ایسی ہی اچھی مل جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بیوہ اور بچوں اور دامادوں کو عافیت سے رکھے، سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ۱۹۹۹ء

مولانا ریحان الدین مکین سلطان پوری

دارالعلوم دیوبند کی فیض آباد منزل میں مولانا سعید احمد سلطان پوری کے ساتھ مولوی ضمیر احمد اعظمی اور مولوی ریحان سلطان پوری دو طالب علم رہتے تھے۔ پڑھنے میں دونوں ہونہار تھے۔فراغت کے بعد مولانا ضمیر احمد نے جلال پور فیض آباد میں کام شروع کیا اور تعلیم وتربیت، وعظ وتقریر کی بلند چوٹیوں پر پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔اس حادثہ کو عرصہ ہو گیا۔مگر مولانا ریحان الدین خاموش طبیعت سنجیدہ اور ذہین آدمی تھے۔فراغت کے بعد اپنے ہی حلقہ اثر میں کام کرتے رہے۔مولانا کا سب سے شاندار مشغلہ اصلاح معاشرہ کا تھا جو ان کی زندگی اور ان کی فکر ونظر کا محور تھا۔اتباع سنت کے بہت دلدادہ تھے،اس لیے اسلامی زندگی سے رسوم ورواج اور بدعات کو نکال کر اسلام کی سادگی پیدا کرنا ان کا مشن بن گیا تھا۔اس میں سرگرمی سے مصروف رہتے تھے۔مولانا نے اس کے لیے ایک کتاب بھی شائع کی تھی جس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔آپ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''ندائے دل'' اور ''سلک گوہر'' چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔حق وباطل کی کشمکش کے موضوع پر آپ نے ''از آدم تا ایں دم'' نامی کتاب مرتب کی تھی جو ابھی طبع نہیں ہو سکی ہے۔

دینی تعلیم وتربیت کے لیے مولانا نے ''جامعۃ الہدیٰ'' نامی مدرسہ جگدیش پور سلطان پور کے قریب قائم کیا تھا جو اب ایک بڑا مدرسہ بن گیا ہے۔

۲۴ر جولائی بروز جمعہ عصر کی نماز پڑھائی، پھر چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔واپسی میں مغرب بعد فالج کا حملہ ہوا اور صبح چار بجے اللہ کو پیارے ہو گئے۔اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں مقام بلند عنایت فرمائے۔آمین

مولانا کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی۔ساری عمر علم اور اس کی خدمت کرتے ہوئے

اپنے مالک حقیقی کے دربار میں حاضر ہوگئے۔اہل مدارس سے ایصال ثواب کی درخواست ہے۔
اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین
مولانا اظہر غوری جامعہ نگر اوکھلائی دہلی میں رہتے ہیں،آپ کے فرزند عزیز ہیں۔

❑❑❑

ماخذ:'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔۱۹۹۹ء

مولانا سید احمد ہاشمی صاحب

درخت اگر اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو آدمی اپنی خصوصیات سے، اور رہنما اپنی انفرادیت سے ممتاز ہوتے ہیں۔

مولانا ہاشمی کلکتہ کے ایک مقامی ورکر تھے مگر ہندو مسلم فساد کے موقع پر انھوں نے جیسی شاندار خدمات انجام دی تھیں، انھوں نے ان کو دہلی پہنچادیا اور دھیرے دھیرے جمعیۃ علمائے ہند جیسی کل ہند جماعت کا جنرل سکریٹری بنادیا، اور اپنے زور بیان، فکر ونظر اور بے پناہ جدو جہد سے جمعیۃ کے کاز کو، اس کے حلقہ اثر کو اور اس کی سیاسی شاخ کو مضبوط بھی کیا اور اسے دوسری جماعتوں میں امتیاز بھی بخشا۔ چنانچہ جماعت اسلامی اور جمعیۃ علما میں طرح طرح کے اختلافات کے باوجود انھوں نے دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا، حتی کہ ملی کنونشن کے موقع پر انھوں نے دونوں جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا، اور نہ صرف ان دونوں جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ایک مشترکہ فارمولا طے کرا کے باہم تبادلہ خیالات کی راہ ہموار کر کے ثابت کر دیا کہ اگر اپنا خلوص ثابت کر دیا جائے تو چند متحارب گروپ مشترکہ مقاصد کے لیے ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں اور مل جل کر مسائل حل کر سکتے ہیں۔

ملی پلیٹ فارم:

مولانا ہاشمی نے سب سے پہلے یہ سمجھوتہ پیش کیا تھا کہ مجلس مشاورت جس محنت، جس ضرورت اور جس مستقبل کے لیے بنائی گئی ہے اسے پارٹی نہ بنایئے صرف پلیٹ فارم بنا کر رکھیے، تاکہ مشترکہ مقاصد کے لیے کبھی کبھی کوئی متفقہ موقف بنانا آسان ہو۔ مگر باہمی طور سے مختلف پارٹیوں میں جو دوری ہے، جو شکوک ہیں اور اپنے اپنے حلقہ اثر کو محدود رکھنے کی جو عادت ہے، اس

کی وجہ سے لوگوں نے ان کی بات قبول نہیں کی اور وہ ایک پارٹی بن کر چند ہاتھوں میں جھولتی رہی۔ حتی کہ پچھلے سال نیم مردہ حالت میں کمزور اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بے وقعت ہوگئی۔ آج ایک پارٹی دوسری پارٹی کے ساتھ کوئی اشتراک عمل نہیں کرسکتی اور اب وہ دونوں دو مجلس مشاورت ہیں۔

میں نے حسب عادت مولانا ہاشمی صاحب سے پوچھا تھا کہ ’پارٹی اور پلیٹ فارم میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟‘ مولانا کہنے لگے کہ ’پلیٹ فارم یہ ہے کہ مختلف پارٹیوں کے ذمہ داران کبھی کبھی ملی مسائل حل کرنے کے لیے تبادلہ خیالات کا موقع نکال لیں اور پھر جو طریقہ کار طے ہو جائے اسی کے مطابق اپنے اپنے طور پر ان کی پارٹیاں کام کریں۔ اس طرح بنیادی صورت حال طے کرکے کام کیے جائیں کہ کسی پارٹی کی ساکھ پر آنچ نہ آئے اور باہمی اتحاد کی فضا قائم رہے۔ مثلاً آج حکومت اور مسلمانوں کا سب سے نزاعی مسئلہ مدارس پر مرکزی حکومت کی بدنظری کا ہے جس سے دیہات سے شہر تک، اتر پردیش سے آسام اور مدراس تک تشویش پائی جاتی ہے۔ اور وہ تشویش بڑھتی جاتی ہے تو آج کیا یہ ممکن ہے کہ جمعیۃ علما، جماعت اسلامی، جمعیۃ اہل حدیث، ملی کونسل، علما کونسل اور مجلس مشاورت اور ان جیسی ملی جماعتیں یا ان کے صدور اور نظما کہیں مل جل کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرسکتے ہیں؟ یا صرف یہ طے کرسکتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے مشترکہ طور پر ہر جگہ کیا کرنا چاہیے؟ اگر کرسکتے ہیں تو آج یہ کام ضرور کرنا چاہیے اور اگر نہیں مل بیٹھ سکتے تو پوٹا ان کی سرکوبی ضرور کرے گا اور یہ ملک ایک وسیع جیل خانہ بن جائے گا۔‘

سیکولرازم:

سیکولرازم ہمارے دستور ہند کا بنیادی تخیل ہے جو دستور ساز کونسل کے رکن ڈاکٹر امبیڈکر جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزاد جیسے ارکان کی کمیٹی نے مرتب کیا تھا اور اس ملک کے لیے مرتب کیا تھا، جو مختلف مذاہب کا ہمیشہ سے گہوارہ رہا ہے۔ مختلف زبانوں کا ملک ہے، جہاں کے قبائل بھی اپنا الگ پرسنل لا رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر جیسے ہریجن نے ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر ایک مشترکہ قانون بنانے کے لیے طے کیا کہ:

۱) ملک کا ہر باشندہ اک دوسرے کے برابر ہے۔

۲) یہاں کے تمام مذاہب قابل احترام ہیں۔

۳) سب کو ضمیر کی آزادی حاصل ہے۔

۴) چودہ قومی زبانیں اور بہت سی بولیاں یہاں ہیں۔

۵) جو بھی کسی ریاست میں اقلیت میں ہے اس کو بنیادی حقوق دیے گئے ہیں۔

۶) ہر مذہب ہر قبیلہ اور قوم کا پرسنل لا محفوظ رہے گا۔ اس طرح کے اصولوں سے جو حکمرانی پیدا ہوگی اس کو سیکولرازم کہیں گے۔ چنانچہ حکومتیں آتی جاتی رہیں اور اسی معیار سے ان کا اعتبار کیا جاتا رہا۔

جمعیۃ علما اور جماعت اسلامی ہند دونوں مذہبی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ ان دونوں میں بعض باتیں متضاد ہیں اور مولانا مودودی کے زمانہ سے ہیں۔ مگر نیا اختلاف سیکولرازم کا ہے۔ حکومت الٰہیہ کے مفروضہ کو اسلامی مقاصد میں شمار کرنے والے لوگ سیکولرازم کو کبھی صحیح نہیں سمجھ سکتے مگر کسی مشترکہ ملک کی مشترکہ حکومت کے لیے سیکولرازم کو بہتر قرار دینے والی جمعیۃ علمائے ہند نے ہمیشہ قابل عمل سمجھا ہے۔

ان دونوں جماعتوں میں نئے اور پرانے اختلافات کی وجہ سے باہمی ربط و تعلق کبھی نہیں رہا، لیکن مولانا ہاشمی صاحب جمعیۃ علمائے ہند کے ذمہ دار ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کے ذمہ داروں سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور اپنے موقف سے کبھی ایک انچ ہٹ نہیں سکے، نہ خوشامد کا فن انھیں آتا تھا۔ مگر اپنی سوجھ بوجھ، دور اندیشی اور خلوص کا سکہ جما دینے کے بعد مولانا ہاشمی کے لیے آسان تھا کہ دونوں اپنا اپنا اختلاف رائے رکھتے ہوئے بہت سے مسائل اور انداز فکر میں یکساں انداز اختیار کریں۔ چنانچہ مجلس مشاورت بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان دونوں جماعتوں کا اختلاف تھا۔ لیکن ڈاکٹر سید محمود پر دونوں کا اعتماد تھا، اس لیے ندوۃ العلما لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر دونوں ساتھ مل کر کام کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے مگر چند ماہ بعد منتشر ہوگئے، تو ایمان داری سے اختلاف رائے رکھنا اور مخلصانہ طور پر ان مخالفین سے ملنا جلنا ایک نازک مسئلہ ہے اور ایسی کمان ہے جس کا چڑھانا ہر شخص کا کام نہیں۔

نئی صف بندیاں:

ہندوستان کی آزادی کے بعد جو نئی صف بندیاں شروع ہوئیں تو اس کی بنیادی بات

سیکولرازم ہے، اس نے دوقومی نظریہ کو ہمیشہ کے لیے مسترد کردیا۔ اس لیے مسلم لیگ کے لیے ملک میں کوئی جگہ نہیں رہ گئی اور مہاسبھا اس سے سرٹکرا کر رہ گئی۔ کانگریس نے سیکولر کردار کو اپنی کرسیوں کی خاطر نظرانداز کیا تھا تو اسے ملک بھر میں رسوا ہونا پڑا اور پھر اپنی صحیح روش پر آنا پڑا۔

سیکولرازم نے چھوٹی برادریوں کو اور سب اقوام کو پکارا تو کانگریس کو اس کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ اسی طرح گوڈسے کی برادری نے بابری مسجد توڑ کر فضا میں فرقہ پرستی کا زہر گھول دیا مگر حکومت بنانے کے لیے اس کو سیکولرازم کا سہارا لینا لازم ہوگیا۔

مولانا ہاشمی صاحب نے جمعیۃ علمائے ہند کا جنرل سکریٹری بن کر سیکولرازم کو مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمان کی طرح قبول کیا تھا، اور اس کو معیار بنا کر کانگریس کی صفوں میں کام کرتے تھے۔ اس لیے انتولے صاحب، جعفر شریف صاحب، چندر جیت یادو اور کیدار سنگھ جیسے لوگوں سے ان کے روابط دوستانہ تھے، مگر کانگریس کی کالی بھیڑوں سے وہ ہمیشہ دور رہتے تھے، حتیٰ کہ چندر جیت یادو کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک نئی پارٹی بنائی تھی اور لوگوں نے مولانا ہاشمی کو اس کا صدر بنادیا تھا۔ پھر مولانا نے اتر پردیش اور بہار میں دورے بھی کیے مگر وہ کہتے تھے کہ 'ابھی ہندو قوم کسی مسلمان کی سربراہی کو قبول نہیں کرسکتی' پھر وہ پارٹی منتشر ہوگئی۔ اسی دور میں مولانا نے بی ایس پی کے لیڈر کانشی رام سے کئی مرتبہ بات کی کہ مسلمان اور ہریجن اگر ساتھ ساتھ مورچہ کھولیں تو اقتدار کا نقشہ کیا ہوگا؟ مگر کانشی رام نے اس پر کھل کر کوئی بات نہیں کی۔ اس لیے ان کی پارٹی محدود ہوتی چلی گئی اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل مرتب نہ ہوسکا۔

جرأت گفتار:

مولانا بہت اچھے مقرر، عوامی لیڈر اور سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ مسئلہ پر گہرائی سے سوچتے تھے اور بے خوف تنقید وتبصرہ کرتے تھے۔ ان سے قربت رکھنے والے سبھی جانتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ میں، علی گڑھ یونی ورسٹی کورٹ میں، جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی میں اور ملی وملکی اجلاسوں میں مختلف قسم کے مسائل پر زور وشور سے بولتے تھے اور مسائل سے واقفیت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

انھیں دوسروں پر تبصرہ کرنا بھی آتا تھا اور دوسروں کی باتوں کو صبر وضبط سے سننا بھی

جانتے تھے،اوراسی بات نے ان کو دہلی کا ایک ابھرتا ہوا لیڈر بھی بنا دیا تھا۔چنانچہ ایک مرتبہ وہ عوامی رجحانات کی وجہ سے دہلی وقف بورڈ کے چیئر مین بھی بن گئے تھے۔ان کی چیئر مینی کے زمانہ میں جامع مسجد دہلی کے مسائل حل کرنے میں امام جامع مسجد سے شدید تکرار بھی ہوگئی تھی،جس کی تلخ یادیں دیکھنے والوں کو اب بھی یاد ہوں گی۔مگر وسیع الظرفی کی بات ہے کہ مولانا ہاشمی کی وفات کے بعد امام جامع مسجد ان کی تعزیت کے لیے مولانا کے مکان پر تشریف لائے تھے۔شاید اسی لیے کہ امام صاحب کو مولانا کے خلوص کا یقین تھا اور ان کی قدر کرتے تھے۔

تنظیمی صلاحیت:

دارالعلوم دیوبند جب بند ہوگیا اور تمام طلبہ موتمر کے دفتر کی عمارت میں ٹھہرا لیے گئے تو انتظامات،کشاکشی اور دوڑ بھاگ کا عجیب زمانہ تھا۔دوسرے دن مولانا ہاشمی دہلی سے دیوبند پہنچ گئے۔عشا بعد مولانا معراج الحق صاحب کی صدارت میں تمام کارکنوں کا ایک جلسہ ہوا،تا کہ یہ طے کیا جائے کہ آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہو؟اس میں مولانا ہاشمی بھی شریک ہوئے۔انھوں نے فرمایا کہ'طریق کار طے کرنے سے پہلے آپ انتشار ختم کر کے ایک اجتماعیت پیدا کیجیے۔اس کا نام رکھیے اور دفتر بنا کر کام کیجیے۔'چنانچہ اسی مجلس میں ہم تمام لوگوں کا نام مولانا ہی نے پیش کیا اور''کیمپ دارالعلوم'' کا نام تجویز کیا اور اس کا سربراہ مولانا وحیدالزماں کو بنایا گیا۔اسی کیمپ کے ذریعہ اس علمی محاذ کو سر کیا گیا اور سب مولانا کے شکر گزار بنے۔

گورکھ پور میں:

دارالعلوم (گورکھ پور) قائم ہوا تو اس کے رجسٹریشن کے موقع پر کچھ مفاد پرستوں نے پرانی کمیٹی میں ردوبدل کر کے نئی کمیٹی بنالی اور حکیم وصی احمد جیسے بانی مدرسہ کو بھی چھانٹ دیا اور نئی کمیٹی کا رجسٹریشن کرالیا۔کام خفیہ بھی تھا سازشی بھی اور تکلیف دہ بھی،اس لیے متعلقین کو سخت تشویش تھی۔مجھ سے مولانا باقر حسین صاحب نے مشورہ لیا۔میں نے مشورہ دیا کہ اگر مجلسِ سرپرستان موجود ہے تو اس کی میٹنگ بلا کر اس کے سامنے مسئلہ رکھ دیجیے۔مولانا باقر صاحب نے میٹنگ بلائی۔اس میں مجلسِ سرپرستان کے رکن مولانا ہاشمی بھی تشریف لائے۔پھر کمیٹی کے پرانے

اور نئے ممبران کے سامنے گفتگو شروع ہوئی تو گفتگو کی ابتدا خود مولانا ہاشمی نے فرمائی اور نئے پرانے دونوں ممبران کے سامنے فرمائی، اور سب سے پہلے ناظم مدرسہ سے دریافت فرمایا کہ 'ڈاکٹر صاحب! آپ خود سے ناظم بنے تھے؟ یا کسی کمیٹی نے آپ کو یہ عہدہ دیا تھا؟' ناظم صاحب نے صحیح جواب دیا کہ 'کمیٹی نے مجھے ناظم بنایا تھا'۔

سوال: 'مدرسہ کی کمیٹی نے آپ کو ناظم بنایا تھا تو اس کو بائی پاس کرکے آپ نے دوسری کمیٹی کس حق سے بنالی؟ اس میں کیا معقولیت ہے؟ کیا اصولی طور سے یہ کمیٹی درست ہے؟'

جواب: 'مجھ سے غلطی ہوگئی'۔

غلطی کے اس اقرار کے بعد ساری بحث ختم ہوگئی۔ پھر غلطی کی اصلاح کردی گئی اور معاملہ ختم ہوگیا۔ دارالعلوم کا کام چلنے لگا۔ یہ تھا مولانا کا صاف ستھرا انداز اور انداز فکر۔

قانونی موشگافی:

مولانا دہلی وقف بورڈ کے ممبر تھے اس لیے جب وقف کونسل کے لیے نئے وقف ایکٹ کی بات چلی تو ایک دفعہ پر بحث اور ترمیم و تنسیخ کرنی پڑی۔ اس میں جمعیۃ علمائے ہند نے بھرپور حصہ لیا۔ مولانا اسعد صاحب، ظفریاب جیلانی صاحب، مولانا اسحاق سنبھلی صاحب اور مولانا عبدالرؤف صاحب وغیرہ نے ہر ہر سطر کی ہندی کی چندی کرڈالی۔ مولانا ہاشمی صاحب کو اس میں سب کے ساتھ مل کر کام بھی کرنا تھا اور سب کی قانونی ضرورتیں بھی پوری کرنی تھیں۔ وہ خود چونکہ ٹائمز آف انڈیا پڑھا کرتے تھے، اس لیے انگریزی مسودہ قانون پر بحث کرنے میں اور اس کی موشگافیوں میں ان کو خاص مدد ملتی تھی۔ چنانچہ جب جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی میں وہ بحث پیش ہوئی تو اصل مسودہ اور اس کی ترمیم و تنسیخ پر مولانا ہاشمی شرح صدر سے بحث کرتے تھے اور ممبران کے سوالات کے جوابات دیتے تھے اور انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کامیاب ہوتی تھی۔

جنرل سکریٹری شپ:

جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی ہورہی تھی۔ مجھے امروہہ سے آنے میں دیر ہوگئی۔ گیارہ بجے پہنچا تو مجلس میں سناٹا تھا۔ مولانا سنبھلی جیسے لوگ بھی خاموش تھے مگر مولانا ہاشمی موجود تھے، تھوڑی دیر بعد

مجلس ملتوی کردی گئی۔ میں شام کو قاضی سجاد حسین صاحب کے یہاں گیا تو انھوں نے بتایا کہ 'ورکنگ کمیٹی میں مولانا اسعد میاں نے اپنا اور مولانا ہاشمی کا مسئلہ پیش کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اب جمعیۃ کے ذمہ داروں میں یا تو ہاشمی صاحب رہیں گے یا میں رہوں گا، دونوں نہیں رہ سکتے۔' ہم یہ سن کر دنگ رہ گئے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ 'میں نے فوراً جواب دیا کہ اس میں بحث کی کیا بات ہے؟ آپ رہیے، ہاشمی صاحب نہیں رہیں گے'۔ اور فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ قاضی صاحب نے فرمایا ''مولوی افضال! یہ ہوا بہت خراب۔'' میں نے عرض کیا جبھی اتنا سناٹا مجلس میں تھا جب میں وہاں حاضر ہوا۔ مگر ورکنگ کمیٹی کو مطمئن کیے بغیر اپنے جنرل سکریٹری کو اس طرح گیٹ آؤٹ کر دینا مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ طریقہ معقول کس طرح تھا؟ جماعتی اور ملی خدمات کے میدان میں دوستی و دشمنی کا معیار کیا ہو؟ اور فیصلوں میں کتنا اعتدال ہو؟ اس کی طرف دھیان ہی نہ جائے تو ظاہر ہے جماعتی صفوں میں انتشار کو کون ٹال سکتا ہے؟ اسی نامناسب برتاؤ اور ورکنگ کمیٹی کی خاموشی نے ہاشمی صاحب کو زبردست ٹھوکر دی، مگر وہ ہائے بھی نہ کر سکے۔ پھر انھوں نے ورکنگ کمیٹی میں آنا جانا کم کر دیا البتہ رسم و راہ نہیں توڑی۔ ان کا مزاج ہی ایسا تھا۔

کردار:

ہندو مسلم فسادات کی لمبی تاریخ ہے، کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو گیا تو جمعیۃ علما نے اس کے خلاف تحریک منظّم کی۔ ورکنگ کمیٹی میں مولانا اخلاق حسین صاحب نے اس تحریک کا نام تجویز کیا ''ملک وملت بچاؤ''۔ اس تحریک کے تین دور چلے تو پہلے دور میں روزہ رکھ کر ہم لوگ جیل گئے تھے۔ یہ دور وہ تھا جب جنتا گورنمنٹ تھی۔ مولانا اخلاق حسین کو اس وجہ سے جمعیۃ علما سے نکال دیا گیا تھا کہ انھوں نے اس تحریک کو جنتا گورنمنٹ کے خلاف چلنے والی تحریک کا الزام دیا تھا، حالانکہ وہ سچ تھا، بہرحال وہ چلی۔

ملک وملت بچاؤ تحریک کا آخری دور اندرا گاندھی کے دور حکومت میں چلا تو جنرل شاہنواز کو اس کا ڈکٹیٹر بنا گیا۔ جب رضا کار ملک کے ہر حصہ سے آ گئے اور صبح کو گرفتاریاں دینے کی تیاریاں سڑکوں تک آنے لگیں تو اندرا سرکار آ چکی تھی۔ ان کی طرف سے کہلایا گیا کہ آپ مطالبات لکھ کر دیجیے، اور وہ منھ زبانی لکھ کر دیے گئے تو اسی طرح رواداری میں وہ منظور بھی کر لیے گئے۔ اس

پر تحریک کے ذمہ داروں کو بلا کر مشورہ نہ کیا گیا نہ غور وفکر ہوا۔ بس دفتر نے اعلان کر دیا کہ ہمارے مطالبات منظور کر لیے گئے، اس لیے تحریک ختم۔ اس اعلان کو سن کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ کتنے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ڈرامہ ہے یا دھوکہ ہے یا حقیقت ہے؟ پھر پروگرام بن گیا اور مولانا اسعد صاحب اور مولانا سنبھلی صاحب نے گاڑی لی اور کہیں جانے لگے۔ راستے میں مولانا ہاشمی مل گئے تو ان حضرات نے ان کو بھی بٹھالیا۔ تھوڑی دور جا کر ہاشمی صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اور جب معلوم ہوا کہ ہم اندرا مہارانی کے یہاں مطالبات کی منظوری کا شکریہ ادا کرنے جا رہے ہیں تو مولانا ہاشمی صاحب نے گاڑی رکوائی اور اتر کر واپس چلے گئے کہ میں نہیں جاؤں گا۔ انھوں نے جب کاروائی کا انداز دیکھا تو ان کے پارلیمنٹری دماغ نے اسے ڈرامہ قرار دیا۔ مولانا سنبھلی کی رائے سے ان کی رائے بالکل مختلف تھی۔ پھر واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا ہاشمی صاحب ہم سے زیادہ معاملہ فہم، جری اور فیصلہ کن دماغ کے مالک تھے۔ کیوں کہ اس سلسلے میں خود تحریک کے لیڈر جنرل شاہنواز کو بھی افسوس تھا مگر اندرا جی تو اندرا تھیں۔ انھوں نے اردو کے لیے ڈاکٹر فریدی سے پختہ وعدہ کر کے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ پارلیمنٹری وعدہ تھا۔

سنگین حادثہ:

چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ نے فیض آباد کے جج پر دباؤ ڈال کر بابری مسجد کا تالا پوجا کے لیے کھلوایا تو ہندوؤں میں خوشی اور مسلمانوں کے دلوں میں فطری طور پر بے چینی پیدا ہوئی۔ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر باہر تھے۔ دفتر میں ناظم عمومی اور ناظم تنظیم موجود تھے۔ ورکنگ کمیٹی میں اس موضوع پر بحث ہوئی، باتیں چلتی رہیں۔ میں خلاف عادت خاموش تھا، لوگوں نے بار بار ٹوکا کہ تم بولتے کیوں نہیں؟ میں نے کہا کہ 'مجھے حیرت ہے کہ اندرا جی کو جب عدالت نے پانچ روز کی سزا دی تو ہمارے صدر محترم نے دہلی سہارن پور تک ہلچل مچادی اور کانگریس لیڈر شپ کی منشا کے خلاف سہارن پور جا کر گرفتاری دیدی۔ لیکن عدالت نے جب بابری مسجد کو پوجا کے لیے کھول دیا تو اس غلطی پر انھوں نے کوئی احتجاج نہیں فرمایا! دونوں میں اس قدر فرق کیوں رہا؟ میری سمجھ میں نہیں آیا جب کہ حکومت کے دونوں فیصلے غلط تھے۔' اس پر مولانا ہاشمی صاحب نے فرمایا کہ میں نے دفتر

کوتاکید کی تھی مگر ناظم صاحب نے ایک معمولی سا بیان دے کر بات ٹال دی۔اس پر مولانا اسعد صاحب نے کوئی معقول عذر بھی نہیں بیان کیا اور اپنی کوتاہی کو تاہی بھی تسلیم نہیں کی جو ہمارے لیے سوہان روح بن گئی۔ ورکنگ کمیٹی سے ہم آئے تو عام طور سے دہنوں میں انتشار تھا اور دل بوجھل تھے۔

اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور کی شوکت منزل میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا ہاشمی صاحب، مولانا وحیدالزماں صاحب، مولانا صادق علی صاحب، مولانا عزیز الحسن صاحب وغیرہ شریک تھے۔اس میں میں نے جمعیۃ علما پر مناسب انداز میں تنقید کی اور اس کے جماعت کی روایات سے انحراف کے رویہ پر اعتراض کیا۔مولانا ہاشمی اور مولانا وحیدالزماں نے بھی اپنے اپنے انداز میں جمعیۃ کی پالیسی پر تبصرہ کیا۔ جمعیۃ کا ورکر نوشاد اعظمی بنارس سے ریکارڈ کا سامان لایا تھا اور وہ ہمارے سامنے ریکارڈ کر رہا تھا۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں تھی، کیوں کہ ہم چاہتے تھے کہ جماعت میں جو سیاسی انتشار ہو رہا ہے اس کی خبر صدر محترم کو ہونی چاہیے اور وہ ہو بھی گئی اچھی طرح۔

صدر محترم نے دہلی پہنچ کر ہم سات آدمیوں کو جمعیۃ علما سے چھ سال تک کے لیے خارج کر دیا اور ہم سے پوچھا بھی نہیں کہ تم کو کیا شکایت ہے! حالاں کہ ہم میں سے اکثر ورکنگ کمیٹی کے شرکا تھے۔

سات افراد (یہ ہیں) (۱) مولانا سید احمد ہاشمی (۲) مولانا وحیدالزماں (۳) مولانا باقر حسین (۴) افضال الحق قاسمی (۵) مولانا عبداللہ مغیثی (۶) مولانا عزیز الحسن صدیقی (۷) ناز انصاری۔

یہ واقعہ ۱۳۸۶ھ کا ہے کہ ہمیں جمعیۃ علما سے نکال دیا گیا۔ جب کہ ناز انصاری اور مولانا باقر حسین جمعیۃ کے ممبر ہی نہیں تھے۔ضابطہ کے مطابق پہلے ہمیں نوٹس دینا چاہیے تھا اور ہماری بات ورکنگ کمیٹی کو سننا چاہیے تھا مگر آمرانہ ذہنیت اصول اور معقولیت کے حدود میں کبھی نہیں رہتی۔ اس لیے ہم نے بھی ہمیشہ کے لیے اس آمریت سے توبہ کر لی اور بحمد للہ مطمئن ہیں۔

طرفہ تماشا یہ کہ جمعیۃ علمائے ہند کی جنرل کونسل جس میں ہمارے اخراج کا فیصلہ ہوا، اس کے اجلاس میں (جیسا کہ آل انڈیا جمعیۃ علما کی رپوٹ میں دکھلایا گیا ہے) ایک بنگلہ دیشی بھی

شریک تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد عبدالنبی میں جتنے مہمان اور مسافر ٹھہرے ہوئے تھے،ان سب کے نام جنرل کونسل کے ممبروں میں شامل کر لیے گئے۔اگر سلہٹ ہندوستان کا ضلع ہے تو ہم اپنی بات واپس لیتے ہیں۔

مولانا عبداللہ مغیثی،مولانا وحیدالزماں،مولانا ہاشمی اور ہم لوگوں نے مل کر جمعیۃ علما کے کارکنوں کو جمع کر کے دہلی میں ایک کنونشن کیا اور اس میں ملی جمعیۃ علما کے نام سے دوسرا ادارہ قائم کرلیا اور جمعیۃ بلڈنگ سے اس کا ہفتہ وار اخبار بھی نکالا۔کچھ کام بھی ہوا مگر نہ علاحدہ دفتر قائم ہو سکا نہ مولانا ہاشمی اپنی مسلسل علالت کے سبب فیلڈ میں نکل کر کام کر سکے،نہ ملک میں شاخیں قائم ہو سکیں حتی کہ باہم انتشار ہو گیا اور ملی جمعیۃ علما بکھر کر رہ گئی۔

اللہ ہم لوگوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو معاف فرمائے۔کچھ دنوں کے بعد پھر جمعیۃ علما کے دفتر میں انتشار ہوا۔مولانا اسرارالحق صاحب،مولانا صدرالدین صاحب انصاری بھوپالی اور مولانا فضیل احمد صاحب وغیرہ جیسے لوگ علاحدہ ہو گئے اور مرکزی جمعیۃ قائم کر کے یا ملی کونسل میں جا کر مسلمانوں کی سیاسی ضرورتیں پوری کی جانے لگیں۔

مولانا ہاشمی صاحب مجلس مشاورت،مرکزی جمعیۃ،تنظیم ابنائے قدیم جیسی جماعتوں میں برابر حصہ لیتے ہوئے اپنے خدا کو پیارے ہو گئے۔

اللہ تعالی ان کی خوبیوں کو بڑھائے،لغزشوں کو معاف فرمائے،ان کے درجات کو بلند کرے۔آمین

❑❑❑

ماخذ:'مولانا سید احمد ہاشمی۔حیات وخدمات'۔مرتب:مولانا سعودالحسن ندوی

سنہ طباعت ۲۰۱۵ء

مولانا رشیدالدین حمیدی

مرادآباد کی عظیم شخصیت، مدرسہ شاہی مرادآباد کے مہتمم مولانا رشیدالدین حمیدی کی وفات افسوس ناک حادثہ ہے لیکن خود ان کے لیے یہ شرف کی بات ہے کہ انھیں مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین میں آرام کی جگہ ملی۔ میری ان کی آخری ملاقات ۲۷/رمضان کو مدینہ طیبہ میں اس وقت ہوئی جب میں مولانا عبداللہ بستوی اور مولانا ظل الرحمان ممبئی کے ساتھ اعتکاف میں تھا۔ وہ معذوری کے باوجود نہایت خلوص ومحبت کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔

خاندان:

مولانا فیض آباد ٹانڈہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور محدث مولانا حمیدالدین کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ مولانا سے چھوٹی ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا اسعد مدنی صاحب سے منسوب تھیں، اور ابھی جلد ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان کا انتقال ٹانڈہ میں سید بشیرالدین مرحوم کے گھر میں ہوا تھا جو وہاں کا معزز خاندان اور حضرت مدنی کا آبائی وطن اور خاندان تھا۔ اس طرح مولانا رشیدالدین صاحب کی جس ماحول میں پرورش وتربیت ہوئی وہ ممتاز شخصیات اور اصحاب کمال کا گہوارہ تھا جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

ابتدائی حالات:

میں ۱۹۴۵ء میں نورالعلوم بہرائچ پہنچا تو تقریباً دو ہفتے پہلے حضرت مولانا حمیدالدین صاحب دارالعلوم ندوہ کی صدر مدرسی چھوڑ کر نورالعلوم آچکے تھے اور مدرسہ کے معمولی کتب خانہ میں مقیم تھے۔ وہیں ان سے میری شناسائی ہوئی اور الحمدللہ ۱۹۴۹ء تک بہرائچ میں ان کے ہمراہ رہنے

کی سعادت حاصل رہی۔

رشید میاں کا داخلہ جب درجہ عربی میں ہوگیا اور وہ نحو میر اور پنج گنج پڑھنے لگے تو حضرت مولانا نے ان کی نحو کی پختگی کے لیے مجھ سے فرمایا کہ اس کو نحو میر پڑھا دیا کرو۔ میں نے ارشاد کی تعمیل کر دی تو مولانا رشید الدین صاحب کو دیکھا کہ وہ ساری عمر اس وقتی رشتہ کا لحاظ کرتے رہے۔ حالاں کہ آج کل وہ دیکھنے میں مجھ سے بڑے اور بزرگ لگتے تھے جب کہ وہ مجھ سے بارہ تیرہ برس چھوٹے تھے۔ ۴۹ء میں وہ کلکتہ چلے گئے، وہاں سے دیو بند جا کر حدیث کی تکمیل فرمائی۔

رشید الدین میں ذہانت خاندانی تھی۔ نفاست والدہ کی طرف سے ملی تھی، معاملہ فہمی اور مردم شناسی حضرت مولانا حمید الدین صاحب سے آئی تھی۔ کھیل کود سے ان کو دلچسپی نہیں تھی، کم سخن اور خاموش مزاج ہمیشہ سے تھے۔ میں عصر کے بعد حضرت مولانا کے گھر جایا کرتا تھا۔ سیاست سے ان کو فطری لگاؤ تھا، اس لیے کمرے میں ہر طرح کی گفتگو ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا آزاد سبحانی کہیں سے نکل آئے اور اپنی فلسفیانہ سیاسی گفتگو چھیڑ دی۔ حضرت مولانا نے آدمی بھیج کر مجھے بلوایا، میں آکر پیچھے بیٹھ گیا۔ یہ ۴۹ء کا دور تھا جب کہ ملک آزاد ہو چکا تھا اور تقسیم سے پیدا شدہ قیامت کا زور گھٹ چکا تھا۔ دوران گفتگو مولانا آزاد سبحانی نے فرمایا ''ہندوستان کے تمام مسائل کا علاج کمیونزم میں ہے۔'' مجھ سے رہا نہیں گیا، میں نے پیچھے ہی سے عرض کیا کہ ''حضرت! پھر کمیونزم کا علاج کیا ہوگا؟'' وہ چونک پڑے اور میری دخل درمعقولات سے جھنجھلا گئے۔ حضرت مولانا مسکرانے لگے تو مولانا سبحانی گویا ہوئے ''کون صاحب ہیں؟ ذرا سامنے آئیں تو آپ کا قیافہ دیکھوں۔'' پھر سنجیدہ ہو کر فرمایا ''ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل کمیونزم ہے اور کمیونزم کا حل اسلام۔'' حضرت مولانا کی مجلسوں میں اس طرح گفتگو ہوتی رہتی تھی، کیوں کہ وہ ہر طبقہ میں مقبول تھے۔

ملازمت:

دار العلوم دیو بند سے فراغت کے بعد دو سال دیو بند میں مقیم رہے۔ ان سے شیخ الاسلام کی بڑی صاحبزادی ریحانہ منسوب تھیں۔ اس لیے قدرتاً اس کا بڑا اعزاز ہوتا تھا۔ پھر ملازمت کے لیے نکلے تو سب سے پہلے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ آئے، وہاں سے زید پور پھر بارہ بنکی اور آخر میں

مدرسہ شاہی مرادآباد میں آ کر ٹھہر گئے۔ وہ اس مدرسہ کو اور مدرسہ ان کو راس آ گیا اور آپ کے ہاتھوں مدرسہ کو ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے وہ فروغ حاصل ہوا جس کا تصور بھی مشکل تھا۔ غالبًا ان کی یہی مخلصانہ خدمات تھیں جن کا صلہ انھیں مدینہ کی پاک ومقدس سرزمین میں مدفون ہونے کی شکل میں حاصل ہوا۔ تمام مدارس اسلامیہ سے ہماری درخواست ہے کہ وہ مرحوم کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کریں اوران کے رفع درجات کی دعا کریں۔

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی۔ ۲۰۰۱ء

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی
بے پناہ شخصیت

اپنی عمر میں تین ایسے آدمی دیکھے ہیں کہ جن کا سادہ لباس، معمولی اور سادی شکل و شباہت سے وہم وگمان بھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی جگہ حیرت ناک شخصیتوں کے مالک ہیں۔ پہلے شخص مولانا حسرت موہانی، دوسرے شخص مولانا عثمان فارقلیط، تیسرے شخص مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی۔ مولانا حسرت موہانی کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کا سیاسی کردار، اور آزادی کے تیور کا کوئی شائبہ بھی ان کی وضع قطع میں نہیں تھا۔ اسی طرح مولانا عثمان فارقلیط کا بے پناہ قلم، بے لاگ تنقید اور بے باک لب ولہجہ دیکھ کر جب میں نے الجمعیۃ کے دفتر میں ان کی شکل وشباہت دیکھی تو مولانا سید اسعد صاحب کے تعارف کے باوجود یقین نہیں آیا کہ قلم کا بادشاہ بھی گدڑی پوش ہوتا ہے۔

قاضی مجاہدالاسلام بے داڑھی مونچھ کا ایک مختصر بوڑھا آدمی، شکل وشباہت بہت معمولی مگر پیشانی بلند اور چمکدار۔ میں نے ان کو دارالعلوم سے نکلتے دیکھا تھا، پھر مولانا منت اللہ رحمانی کی نگاہ انتخاب نے ان کو امارت شرعیہ کے کاموں میں الجھا دیا، مگر انھوں نے اپنی گہری بصیرت، فقہی تنوع اور عبقریت کی بدولت مولانا سجاد کی طرح امارت شرعیہ کے پورے ڈھانچے کو متحرک کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے بڑے بڑے کام اٹھائے مگر اپنی جرأت مندی، بالغ نظری اور عزم و محنت سے ہمیشہ ان کاموں پر قابو یافتہ ہوکر چلاتے رہے، اور ہر کام کے لیے اچھے کارکن تلاش کرتے رہے اور کام انھیں سپرد کرتے چلے گئے۔ اس لیے وہ تمام دفاتر آج بھی کھلے ہیں جن میں بیٹھ کر قاضی صاحب تقریر کرتے تھے یا لکھا کرتے تھے یا بحث ومباحثہ کو آخری شکل دیتے تھے، حتیٰ

کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنا میں بھی وہ شریک تھے، اور آج اس کی سربراہی کے سب سے بڑے عہدے پر بھی۔ اور جاتے جاتے اس کی طرف سے اسلامی پرسنل لا کی ایک جیتی جاگتی تصویر انھوں نے سپریم کورٹ کو عطا کی ہے، ہائی کورٹ کو بھی، عالم اسلام کو بھی۔ اسی جرأت، اولوالعزمی اور بصیرت کا نام تھا ''قاضی مجاہدالاسلام قاسمی'' رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲)

فن حدیث بہت بڑا علم ہے، علم قرآن ابدی اور ازلی علوم کا موجد ہے، پھر انسانی معاملات سب سے پیچیدہ فن ہے، اور منطق وفلسفہ قائل ومعقول کرنے کا سب سے بڑا میدان ہے۔ لیکن اگر ان پھولوں کو ایک بوتل میں نچوڑ دیا جائے تو امام ابوحنیفہ، امام شافعی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کا تفقہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس تفقہ پر قاضی مجاہدالاسلام کو بڑا عبور تھا۔ خوشی اس کی ہے کہ وہ اپنا فن شاہ ولی اللہ کی طرح عام کر کے گئے ہیں، اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ دیکھنا ہے کہ ان کے ساتھی، ان کے رفقائے کار اور ان کے شاگرد ان کی امانت کو امت کو ترقی دینے کے لیے کس طرح کام میں لاتے ہیں۔

(۳)

قاضی صاحب مجھ سے تقریباً دس بارہ برس چھوٹے تھے۔ میں نے ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم چھوڑا ہے، اور انھوں نے ۱۹۵۰ء کے بعد۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں نے شیخ الاسلام حضرت مدنی کی جوتیاں سیدھی کی تھیں، حضرت علامہ بلیاوی کے علم وفن کی بہاریں لوٹی تھیں اور حضرت مولانا اعزاز علی جیسے ادیب وفقیہ سے علم وعمل کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کر کے جینا سیکھا تھا۔ اسی طرح سیاست میں گاندھی جی، جواہر لعل، رفیع احمد قدوائی اور مولانا حفظ الرحمان، مولانا آزاد کے تیور دیکھے تھے۔ اس لیے ہمیں نہیں معلوم ہوا کہ کسی شخصیت یا اس کے علم وفن سے کیسے مرعوب ہوتے ہیں، کیوں کہ ہم نے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی آن بان دیکھی ہے، اور ایسی دیکھی ہے کہ کسی کی شان پھر نگاہ میں جچی نہیں۔

اس لیے یہ ہمارا معاشرہ جس سمت چلا گیا ہے، تعلیم وتربیت، وعظ وتبلیغ، تقریر وتحریر، نظم و نسق اور مناظرہ ومباحثہ میں حق کو اجاگر کرنے، باطل کو توڑ دینے کے راستے پیدا کیے ہیں، ایسے میں

اگر کوئی دلیل قائم کردے تو ضرور مان لیں گے، مگر بلا دلیل دبایا جائے تو کبھی نہ تسلیم کریں گے۔ کیوں کہ ہم نے امام ابوحنیفہ کی مجلس درس کو دیکھا ہے کہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر جیسے شاگرد اپنے استاد کے سامنے اختلاف رائے کا اظہار بھی کرتے تھے، اور امام صاحب انھیں اختلاف کا حق بھی دیتے تھے، حتیٰ کہ کبھی کبھی شاگرد کی رائے کو خود تسلیم بھی کر لیتے تھے۔

تعلیم و تعلم کے اس قاسمی ماحول کے عادی ہونے کا اثر یہ ہوا کہ فضلائے دارالعلوم نے علم سے سیاست کے ہر گوشے تک کام کیا ہے، اور اسی کا ایک خوشگوار نتیجہ تھا کہ چند سال پہلے قاضی مجاہد الاسلام نے علما، دانشور اور سر برآوردہ مسلمانوں کو جمع کر کے ملی کونسل کی تشکیل کر دی، اور اس کے پلیٹ فارم سے کام کر کے اور مختلف عناصر کو اس پر جمع کر کے دکھا دیا کہ کھلے دل و دماغ سے اگر کوئی کام کرے تو ہر فرقہ اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔

ملی کونسل کا قیام اور اس کی بقا قاضی صاحب کی اولوالعزمی کا بہت بڑا ثبوت ہے، کیوں کہ انھوں نے اس پلیٹ فارم پر کثرت سے ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو کسی بات کو عقیدت سے نہیں، صرف عقلیت سے جانچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دلیل، ثبوت اور بصیرت سے مطمئن کرنے میں قاضی صاحب نے دہلی سے بمبئی تک دنیا کے سامنے جو کارنامے انجام دیے ہیں، اس کا نقش کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے کسی کی شخصیت کا سراغ لگتا ہے اور اس کے وجود کی قیمت لگائی جاتی ہے۔

اس طرح فقہی مسائل میں سیمینار قائم کرنا اور اس میں علمائے قدیم وجدید کو اکٹھا کرنا اور پھر پوری بحث کا مدلل جواب دینا، یہ صرف قاضی صاحب کا کارنامہ ہے، دوسرا کون اس کو انجام دے گا؟ اب تک سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں کہ نقل کا جواب نقل سے، اور عقل کا جواب عقل سے دینا آسان نہیں مشکل کام ہے، اور یہ مشکل کام وہ پوری خوش اسلوبی سے انجام دیا کرتے تھے۔

سیمینار کے سلسلے میں میرا ان کا بارہا اختلاف ہوا، اور انھوں نے خط کے ذریعے مجھے سیمینار میں واپس آنے پر اصرار کیا تھا، اور میں واپس بھی ہوا تھا، مگر ان کی بشاشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ 'کسی اہم سوال پر پہلے فقیہان ہند سے رائے لے کر جب انھیں اختلاف ہو تو اس کو بحث کے لیے پیش کیجیے۔' مگر قاضی صاحب اس کو طول عمل سمجھتے تھے، مجھے

قاضی صاحب کے خلوص میں نہیں مگر ان کے طریق کار میں اختلاف تھا، اور یہ اختلاف پھر بہت سے لوگوں کو ہوتا چلا گیا۔ اس لیے قاضی صاحب نے اصلاحات بھی فرمائی اور طریقۂ کار بھی بدلے۔

حرف آخر:

قاضی صاحب سے میری آخری ملاقات مارچ ۲۰۰۲ء میں ہوئی تھی۔ ہم لوگ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما اور پرسنل لا بورڈ کے نمائندے شامل ہو جاویں تو ساری جماعتوں کا اتحاد ایک مرکزی طاقت بن جاوے گا۔ اس کے لیے ہم سب سے پہلے مارچ میں قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا عبداللہ میرٹھ، مولانا فضیل احمد، مولانا عمید الزماں جیسے تقریباً ۹/آدمی تھے۔ قاضی صاحب اپنے کمرے میں تھے، بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر جب ہم نے اپنی غرض سامنے رکھی تو حسب عادت خوش ہو گئے۔ پوچھا تمہارا کنوینر کون ہے؟ کتنا کام باقی ہے؟ کس طرح انجام دو گے؟ پھر خود ہی تجویز پیش کی کہ رابطہ کے لیے ہم نے بھی سوچا تھا اور تم لوگ کام شروع کر چکے ہو تو کرتے رہو۔ ہمارا تمہارا کام مشترکہ ہوگا، تمہارے دفتر سے ہوگا اور کنوینر مولانا عمید الزماں ہی رہیں گے۔

قاضی صاحب کا انداز فکر، انداز کار، دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی مگر وہ بشاشت سے آخر تک گفتگو کرتے رہے۔ ان کی فراخ دلی، ان کا اعتماد اور ان کی گہرائی کہاں تلاش کی جائے گی۔

قاضی صاحب ایک اعجوبۂ روزگار تھے، اس لیے ان کی سوانح عمری نہایت احتیاط اور پوری ذمہ داری سے پوری کرنی چاہیے۔ ان کی زندگی نمونۂ عمل تھی، اس کا فیض عام، دور دور تک پہنچ سکے گا۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ۲۰۰۲ء

بابو عزیز الرحمان شخصیت اور سفر آخرت

بابو عزیز الرحمان جوار رحمت میں:

اعظم گڈھ جامع مسجد کے متولی، امام اور شہر کے مشہور سماجی کارکن آخر رمضان میں سفر آخرت پر چلے گئے تو سارا خاندان بلکہ پورا شہر سوگوار ہوگیا اور پورے ضلع میں اس غم کو محسوس کیا گیا۔

ان کی عمر ۷۵ر سال کے قریب رہی ہوگی، شبلی کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے، مگر اپنی شکل وشباہت اور سادگی میں ایک باوقار عالم نظر آتے تھے۔ وہ نماز ہی نہیں، تہجد کے پابند اور ذاکر و شاغل انسان تھے۔ معاشرہ کی اصلاح وترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے تھے۔ جامع مسجد کی ترقی وتوسیع میں بڑا کام کیا، حتیٰ کہ وہاں تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ان کے ذوق تعلیم کی یادگار ہے۔ وہ باعمل مفکر تھے۔

سیاسی سرگرمیاں:

وہ سیاسی نہیں مذہبی قسم کے انسان تھے، اس لیے ضلع اور اترپردیش کی سیاست میں دخیل نہیں ہوسکے۔ پھر بھی ہر جگہ کے حالات سے باخبر رہتے تھے، اور ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے، جیسے کوئی ہوش مند رکھتا ہے۔ میرے ساتھ وہ بھی جمعیۃ علمائے اترپردیس کی مجلس عاملہ کے ممبر بنائے گئے تھے تو مسائل پر جچی تلی رائے دیا کرتے تھے، اور گہری تنقید کیا کرتے تھے۔ وکیل مولوی مسعود خاں اور بابو عزیز الرحمان دونوں میں یہ فرق تھا کہ مسعود خاں صاحب کے فکر وعمل کا رجحان سیاسی ہوتا تھا، حتیٰ کہ وہ جمعیۃ علما کو بھی سیاسیات میں لانا چاہتے تھے، اور کہتے تھے کہ سیاسی طاقت کے بغیر یہاں کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ مگر بابو صاحب کہتے تھے کہ سیاست میں ہم کو براہ

راست دخل نہیں دینا چاہیے، جیسا کہ اکابر نے طے کیا۔ کیوں کہ مشترکہ سیاست میں مشترکہ جدو جہد سے فائدہ ہوگا۔

کارنامہ:

مجلس عاملہ میں بابوعزیزالرحمان نے زور دیا کہ جمعیۃ علما اپنے آج کے مقاصد کے لیے کوئی پروگرام مرتب کرے، تاکہ ہمارے کارکن کسی پروگرام سے منسلک ہوکر جماعتی کردار پیدا کرسکیں، لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا کریں۔ بابوصاحب کی یہ بات جمعیۃ کی مجلس عاملہ کے لیے عجیب تھی، مگراس کو مولانا محمد میاں صاحب نے بہت پسند فرمایا اور مولانا محمد اسعد صاحب کو بھی اچھی لگی، کیوں کہ اس سے عوامی زندگی میں اجتماعیت پیدا ہوگی۔ مجھے یہ بات اس وجہ سے زیادہ پسند آئی کہ ۴۷ء تک کانگریس، لیگ اور جمعیۃ علما جنگ آزادی کی لڑائی میں مشغول تھے تو ہر کارکن کے سامنے ایک مقصد تھا، قربانی کا جذبہ تھا اور مجاہدین کے نقش قدم پر چلنے کا شوق تھا۔ مگر آزادی کے بعد آکر ہم لوگ ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں کوئی مقصد نہیں، نہ کوئی پروگرام، نہ کوئی قربانی۔ اب اگر کسی پروگرام سے کارکن کو جوڑ دیا جائے تو اجتماعیت کا ایک نیا رنگ پیدا ہوگا۔

طریقۂ کار:

اس لیے مولانا محمد میاں صاحب نے ایک خاکہ تیار فرمایا، پھر میں نے اس کے اصول اور مقاصد اور اس کی تشریحات کر کے چارنکاتی پروگرام تیار کیا بلکہ اسے دستور اساسی میں شامل کر دیا۔ اس لیے وہ جگہ جگہ آزمایا گیا، کہیں مسلم فنڈ قائم ہوئے، کہیں عوامی فنڈ کھلے، لائبریریاں کھلیں، کہیں مکاتب کا نظام پھیلایا گیا، کہیں نصاب پر بحث چل پڑی۔

اصلاح حال:

بابوصاحب کو معاشرہ اور عوامی فلاح کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، اس لیے انھوں نے مسجد کے وسیع صحن میں مدرسہ کھول دیا اور اپنی نگرانی میں اچھا خاصہ چلانے لگے۔ دینی و دنیاوی دونوں قسم کے مضامین سے بچوں اور بچیوں کو آراستہ کرنے لگے۔ بابوصاحب نے جامع مسجد کا فیضان عام اور پورے شہر کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے درس کلام اللہ کا انتظام کیا اور اس کی ذمہ داری شیخوپور کے مولانا اعجاز احمد صاحب جیسے استاذ، خطیب اور عابد وزاہد نوجوان عالم کو سونپ کر کے اپنے حسن

انتخاب کا سکہ جما دیا، ورنہ شہر سے گیارہ بارہ کلو میٹر دور سے کسی کو ہفتہ وار سہی مگر پابندی سے لانا اور ان کے سفر اور آمد و رفت کو آسان کرنا، اور مولانا کو مطمئن رکھنا غیر معمولی کام تھا، جسے خوب انجام دیا۔

درس قرآن ایک مشکل فن ہے، وہ بھی اعظم گڈھ جیسے شہر میں، جہاں شبلی منزل دارالمصنفین، شبلی کالج اور جامعۃ الرشاد جیسے علمی، ادبی اور دینی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس لیے اچھے اچھے اہل فن وہاں رہتے ہوں، اور مولانا کے درس قرآن میں آتے ہوں اور مطمئن رہتے ہوں۔ اس میں دونوں نے اپنا اپنا کمال دکھایا، بابو عزیزالرحمان صاحب نے ذوق جستجو، حسن انتخاب اور حسن انتظام کا امتحان اول نمبر سے پاس کر لیا، اور مولانا اعجاز احمد صاحب نے بھی پابندی اوقات، حسن خطاب اور مطالعۂ قرآن کے امتحان میں ممتاز رہے۔ شکراللہ مساعیہم

بابو عزیزالرحمان صاحب کے اٹھ جانے پر جوڑی بکھر گئی مگر امید ہے کہ مولانا اعجاز احمد صاحب بابو صاحب کی خاطر نہیں، بلکہ اعظم گڈھ کی خاطر اس سلسلے کو اسی طرح خوش دلی اور ذوق و شوق سے چلاتے رہیں گے۔ مولانا کا درس قرآن اتوار کو بعد نماز مغرب جامع مسجد میں ہوتا ہے۔

دینی تعلیمی بورڈ:

حتیٰ کہ دینی تعلیمی کنونشن کے بعد جہاں پورے ملک میں دینی تعلیمی بورڈ قائم ہوئے، وہاں لکھنؤ میں بھی بورڈ قائم کیا گیا، اور اس کا دفتر گونگے نواب پارک میں دفتر جمعیۃ علما میں رکھا گیا، اور چلتا رہا۔ اس کی مجلس عاملہ میں بابو عزیزالرحمان صاحب نے بہت دلچسپی لی، اس کے نظم و اشاعت میں پیش پیش رہے۔ میں اس میں ذمہ دار تھا مگر فرقانیہ گونڈہ کے اہتمام کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں نباہنا اور اس کے لیے مہینے میں کافی وقت دینا ممکن نہ تھا۔ پھر مالی کمزوری کی بنا پر ماسٹر عزیزالرحمان صاحب کے سپرد کر دیا، اور وہ اسے اعظم گڈھ لے آئے۔ میں نے بھی اس میں کافی دلچسپی لی اور وہیں کچھ دنوں قیام کیا۔ چنانچہ بابو صاحب کے ساتھ چند دنوں گھر پر قیام کیا، پھر جامع مسجد کے گیٹ پر جو گنبد تھا، اس میں کمرہ ہے، اس میں قیام کیا۔ بابو صاحب اس زمانہ میں شبلی کالج میں انگریزی کے ماسٹر تھے مگر تہجد کے عادی، جماعت کے پابند اور ذاکر و شاغل تھے۔ ان کی خوش مزاجی، ذکاوت اور معاملہ فہمی نے ان کو پورے حلقہ میں بہت مقبول بنا رکھا تھا، ان کا سادہ اور بے

تکلف دسترخوان ان کی لذیذ باتوں اور پرخلوص اداؤں سے بہت خوشگوار اور پر کیف لگتا تھا۔

بچوں کی تربیت:

انھوں نے اپنے دروازے پر چند کمرے صرف ان بچوں کے لیے بنا رکھے تھے کہ شبلی کالج میں پڑھیں تو انھیں سکون اور اطمینان ملے۔ وہاں رہنے کی سہولت ہو، وہاں رکنے کے لیے صرف ایک شرط لگائی تھی کہ یہاں انھیں جماعت سے نماز ادا کرنی پڑے گی۔ اس طرح بچوں میں دینی شعور جگاتے رہے، اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بابو صاحب کا یہ طریقۂ کار تربیت کا بہترین راستہ ہے۔ اس پر عوام وخواص کو چلنا چاہیے، تاکہ بچے عصری تعلیم کے ساتھ دینی تربیت بھی حاصل کرتے رہیں۔

بابو صاحب جامع مسجد کے متولی بھی تھے، امام بھی، قوم کے معمار بھی۔ اس لیے نمازوں کے بعد کتاب پڑھتے، یا ضروری تقریر کرتے، یا کسی عالم مہمان سے نصیحت کرانے کا سلسلہ ہمیشہ چلاتے رہے۔ کبھی کبھی گونگے کو بھی انھوں نے گویا کر دیا۔ اس طرح تبلیغ ودعوت کا سلسلہ ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اس کو بڑے سکون، بڑے ذوق وشوق سے چلاتے رہے۔

وحیدالدین خاں صاحب جماعت اسلامی میں گئے تو وہاں اپنے قلم سے دھوم مچادی مگر جب وہاں ذہنی تسکین نہ پا سکے تو علی الاعلان علاحدہ ہو گئے، مگر ان کی علاحدگی سے وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ کیوں کہ ان کی ذہانت، ان کے قلم کی روانی اور جرأت اظہار پر روک لگانے والا نہ وہاں تھا، نہ بعد میں کہیں رہا۔ جب وہاں سے علاحدہ ہوئے تو انھیں بھی ضرورت تھی کسی بڑے شہر یا مرکز کی، جہاں سے وہ اپنے کو نمایاں کر سکیں۔ اور جمعیۃ علما کے اخبار ''الجمعیۃ'' کو بھی ضرورت تھی کسی صاحب قلم کی، جو کم از کم ہفتہ وار ایڈیشن کو فروغ دے سکے۔ ایسے میں یہ خدمت اس ناکارہ کو سپرد ہوئی کہ جا کر ان سے گفتگو کی جائے۔ اس لیے میں اعظم گڑھ آیا، معلوم ہوا کہ آج کل وہ اپنے آبائی وطن سنجر پور میں ہیں، جو سرائے میر کے قریب ہے۔ اس لیے وہاں میں نے بابو عزیز الرحمان صاحب سے مشورہ کیا اور وہ مجھے لے کر خاں صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

وہ اقبال سہیل مرحوم کا آبائی گھر تھا اور وہاں رئیسوں کی ایک حویلی پڑی تھی، شکستہ، پرشکوہ اور خالی۔ خاں صاحب وہیں مقیم تھے، میری ان کی ملاقات گونڈہ میں بھی ہوئی تھی، جب وہ

اپنے بھائی صاحب سے وہاں ملنے گئے تھے، اور مہینوں رہ گئے تھے۔ اس لیے کبھی میں ان کے گھر جاتا تھا، اور کبھی وہ مدرسہ فرقانیہ تشریف لاتے تھے۔ نقد ونظر، صاف گوئی اور قلم کاری میں ہم دونوں ہم مشرب نکلے تو گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان ملاقاتوں نے کام کیا اور بابو صاحب نے سہارا دیا، اس لیے میں نے ان کو دہلی آنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ آئے اور ''الجمعیۃ'' کا ہفتہ وار ایڈیشن مستقل اخبار کی طرح ان کے سپرد کر دیا گیا اور جمعیۃ بلڈنگ کی پہلی منزل کے نزدیک کمرہ ان کی رہائش کے لیے دے دیا گیا، اور اس میں بال بچوں کے ساتھ رہنے لگے۔ پھر وہ الجمعیۃ چھوڑ کر نظام الدین شریف چلے گئے، وہاں ایک کوٹھی میں تشریف رکھتے ہیں مگر الجمعیۃ بلڈنگ کے کمرے میں ان کا بڑا سا قفل آج بھی پڑا ہے جس پر وہ بلا استحقاق کے قابض ہیں اور مالکانہ قبضہ رکھتے ہیں، جس کا حق ان کو نہ شرعی طور سے ہے اور نہ اخلاقی طور سے۔ البتہ قانونی طور سے ہے مگر میری سمجھ میں آج تک نہیں آسکا کہ شریعت اور اخلاق بالاتر ہے، یا قانون اور دھاندلی! کاش خاں صاحب میری الجھن کو دور کرنے کی زحمت فرماتے۔

فکر ونظر:

مولانا اسعد صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند کے ساتھ بابو صاحب پہلی مرتبہ میرے گھر ''رگھولی'' گھوسی اعظم گڑھ تشریف لے آئے، اس لیے طرفین سے ذاتی تعارف بھی ہو گیا۔ وہ دیکھنے اور برتنے میں تو ہمیشہ سادات میں سے معلوم ہوتے تھے مگر معلوم ہوا کہ وہ پٹھان ہیں اور اصلی پٹھان ہیں۔ انھیں میرے پاس سفر میں آنے سے معلوم ہوا کہ میں بھی پٹھان ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ چند سالوں کے بعد بابو عزیز الرحمان نے مجھے خط لکھا کہ 'تمہارے گھر میں کوئی لڑکی ہو تو بتاؤ، مجھے ایک دین دار لڑکی کی ضرورت ہے، اپنے بیٹے کا رشتہ تلاش کر رہا ہوں' خط پڑھ کر تعجب ہوا کہ پٹھان ہو کر بیٹے کا رشتہ تلاش کر رہا ہے یہ شخص! اس کو معلوم نہیں کہ لڑکی والے تلاش کرتے ہیں، ورنہ بڑے عیب کی بات ہوتی ہے کہ بیٹے والے کہیں زبان دیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ ان کی دین داری، ان کا اتباع سنت اور عہد صحابہ کی بے تکلفی نے ان کی پٹھانیت پر غلبہ پالیا تھا، اس لیے وہ دین داری کی تلاش میں بے تکلف نکل پڑے اور دین دار لڑکی کی فرمائش کر دی، پھر نہ

ان کو پٹھانیت روک سکی اور نہ ہندوستانی معاشرہ، نہ زمیندارانہ غرور۔ یہ تھے بابوعزیزالرحمان خان! مجھے افسوس ہوا کہ میری کوئی تیسری لڑکی نہیں تھی ورنہ ضرور ان کو اپنا سمدھی بنا کر اپنی آخرت سنوارنے کی سعادت حاصل کرتا۔

نکاح کی دعوت:

بابوصاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ اعظم گڑھ شہر میں طے کر دیا تو مجھے لکھا کہ آ کر نکاح پڑھا دو۔ نکاح کے لیے میرا انتخاب عجیب تھا مگر میری مجال نہ تھی کہ تعمیل حکم نہ کروں۔ اس لیے گورکھ پور سے حاضر ہوگیا۔ ملے تو باغ باغ ہوگئے، ان کی خوشی دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ صبح کو گورکھ پور کے لیے رخصت کرنے لگے تو چپکے سے سفرخرچ میری جیب میں ڈال دیا۔ میں نے عرض کیا کہ جلسے میں نہیں آیا تھا، بھتیجے کے نکاح میں آیا تھا مگر نہیں مانے تو کچھ لے لیا، کچھ واپس کر دیا، ورنہ ناراض ہو جاتے اور وہ گوارہ نہ ہوتا۔

سفرآخرت:

رمضان کے آخری عشرہ میں سحری کھانے کے لیے گھر والے اٹھے، بابوصاحب اپنے کمرہ میں نہیں تھے، گھر کے باہر بھی نہیں گئے تھے۔ کیوں کہ تمام راستے بند تھے۔ پھر گئے کہاں اور کس طرح؟ ایک معمہ بن گیا۔ محلے محلے شہر بھر میں تلاشی کی گئی، اخبارات میں خبر آ گئی، پولیس کو اطلاع دی گئی مگر سب حیران۔ دوسرے دن کسی بڑھیا نے کہا کہ کل سحری کے وقت ایک بوڑھا آدمی ادھر سے گزر رہا تھا، آگے کنوئیں کی طرف گیا تھا۔ جب تلاش کیا گیا تو اس سے آگے ایک دوسرا کنواں تھا اور وہ تختوں سے بند تھا مگر اس کے تختے توڑ کر اس میں بابوصاحب کود گئے تھے۔ اور ۲۰ر گھنٹے کے بعد ان کی لاش غوطہ خوروں نے نکالی تو پانی کے اندر ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن وہ پانی میں سیدھے کھڑے تھے اور نماز کی طرح دونوں ہاتھ سینہ کے پاس باندھے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ اس وقت سیدھے ہوئے جب انھیں غسل دے کر کفن پہنایا گیا مگر سر خود بخود قبلہ رخ اس وقت ہوگیا تھا جب وہ لا کر نہلائے جانے لگے تھے۔ اس لیے ان کی موت ایک معمہ بن گئی، اور معمہ کی ابتدا وہیں سے ہوئی جب وہ گھر کی اونچی دیوار پھاند کر نکل گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ گھر کی خاردار اونچی چہاردیواری پھاند کر دوسری طرف کس طرح کود گئے؟ جب کہ بیماری کی وجہ سے اتنی

طاقت بھی نہیں تھی کہ چڑھ جائیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ گھر سے نکل کر وہ ایک کنویں پر گئے پھر آگے دوسرے کنویں کا تختہ اکھاڑ کر اس میں کیوں کود گئے؟ اتنی طاقت کہاں سے آئی؟ (۳) ان کے والد مختار صاحب جس کنویں میں گرے تھے وہاں ان کو کون لے گیا؟ (۴) اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ بلا کسی اوزار کے تختے توڑ کر اس میں کود تے تھے (۵) تقریباً بیس گھنٹوں کے بعد اس میں سے نکالے گئے تو نہ کوئی خراش، نہ زخم، نہ بدبو، نہ ٹوٹ پھوٹ، اور وہ پانی میں سیدھے کھڑے تھے نماز کی نیت باندھے ہوئے تھے (۶) ایک گھنٹہ تک ان کے ہاتھ پاؤں اور عقل وحواس سے کون کام لیتا رہا۔ اگر وہ مسلمان روح تھی تو ڈبویا کیوں؟ اور اگر کافر روح تھی تو نماز کی نیت اور چہرے کا کعبہ کی طرف گھومنے کا کیا سوال ہے؟ اس قسم کے بہت سے سوالات حل طلب ہیں۔

جوابات:

الف) حاضرات کے علم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اوپر کوئی روح آتی تھی اور ان کے دماغ پر مسلط ہو کر ادھر ادھر لے جاتی تھی۔ برے برے خیالات پوری طاقت سے پیدا کرتی تھی جس کی شکایت انھوں نے مجھ سے بھی دوبار کی تھی، پھر ان کے لڑکوں نے فون پر بتایا تھا۔ مولانا اعجاز صاحب سے بھی معلوم ہوا تھا۔

ب) کسی پنڈت نے ان کے والد مختار صاحب پر جادو کر کے ان پر اپنا موکل مسلط کر دیا تھا، وہ کافر تھا اور کسی خاص مہینہ میں مسلط ہوا تھا۔ اس لیے اس میں تکلیف زیادہ رہتی تھی۔ وقت مقررہ کا صاف مطلب ہے کرتب یا جادو۔

ج) یہ سلسلہ مختار صاحب سے شروع ہو کر بابو صاحب تک مسلسل رہا۔

د) انسانوں پر جنات یا ارواح مسلط ہو جاتے ہیں تو ان کی رگوں میں دوڑتے ہیں۔ دماغ اور اعضا پر حاوی ہو جاتے ہیں مگر دل کے اندر نہیں جا سکتے۔ اس لیے ایمان متاثر نہیں ہوتا۔

ہ) اگر ہیضہ یا طاعون سے مرنے والے کی شہید سے برابری ہے تو یہاں انہیں کسی خبیث روح نے پانی میں ڈبو کر مارا ہے۔ اس لیے وہ بدرجہ اولی شہید ہوئے۔ اور شہید مرتا نہیں ہے، عالم برزخ میں زندوں کی طرح رہتا ہے۔ اس لیے ان کا کھڑا ہونا، نماز کی حالت، نیت باندھنا اور چہرے کا قبلہ رخ پھر جانا شہادت کی علامت ہے اور عالم برزخ میں کامیابی کی بھی۔

و) ۲۴ گھنٹوں میں ظاہر ہے کہ وہ منکر نکیر سے فارغ ہو گئے تھے، تو بعد کے حالات اہل

ایمان کی طرح اور فضل خداوندی کی طرح معلوم ہوتے ہیں جو ان کی ایمانی قوت، رحمت الٰہی اور شہادت کی وجہ سے ظاہر ہوئے۔ خدا انہیں مبارک کرے۔

ز) عالم برزخ کی باتیں یقین سے کون کہہ سکتا ہے مگر علامات اچھے ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے اور اہل وعیال کو خیر وعافیت سے رکھے۔

اہل ایمان سے دعا کی اور اہل مدارس سے ایصال ثواب کی التجا ہے۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۲۰۰۳

اکیسویں صدی کا سرسید
مسعود خان وکیل
عزائم، افکار اور منصوبے

پانی کا بلبلہ:

مسعود خان صاحب ۴ر جولائی ۲۰۰۲ء کو لکھنؤ سے ہوائی جہاز سے دہلی پہنچے، وہاں کار حادثہ میں گر کر بے ہوش ہو گئے، شام تک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۶ر جولائی کو دہلی، لکھنؤ اور اعظم گڑھ سے منگراواں اپنے گاؤں لائے گئے، اور اسی دار العلوم میں جمعہ بعد سپرد خاک کر دیے گئے جوان کی زندگی کا حاصل، ان کے عزائم کا ترجمان اور ان کے حوصلوں کا باغیچہ ہے۔

شاندار بلڈنگ:

خان صاحب نے اپنے دار العلوم سے متصل نسواں اسکول نہیں لڑکیوں کا یتیم خانہ نہیں، بلکہ ہندوستانی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے شاندار کالج قائم کیا تھا، اور اس کی نئی بلڈنگ ۶۰ر لاکھ سے زائد رقم خرچ کر کے بنوائی تھی۔ ان کے ساتھی تیاری کر رہے تھے کہ اس مرتبہ دہلی سے واپس ہوئے تو ان کے ہاتھوں سے ان کے انتظام میں اس پر شکوہ کشادہ اور جدید تعمیر کا افتتاح کیا جائے، مگر قدرت کا انتظام نہ تھا۔ ۶ر جولائی کو ان کے دیدار کے لیے اسی بلڈنگ میں ان کا جنازہ رکھنا پڑا، اور بیس پچیس ہزار مسلمانوں سے دعائیں لیتے ہوئے یہ شہید انسانیت اپنے مالک کے حضور پہنچ گیا۔ خدا ان کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کے عزائم کی تکمیل کے لیے کوئی مرد میدان پیدا کرے، اور ان کے ساتھ اولیا اور صالحین کا معاملہ فرمائے۔ آمین

منصوبہ بندی:

تقریباً تیس پینتیس برس پہلے خان صاحب نے اپنے گاؤں اور محمد پور جانے والی سڑکوں کے درمیان ایک آراضی پر پرائمری اسکول کھولا، پھر اسی کے قریب حفظ وقرأت کے درجات قائم کیے، اوران کے بعد اسی عمارت میں نئی عمارتیں بنوا کر عربی، فارسی کے درجات قائم کردیے۔

یہ تھا ان کے دارالعلوم کا ابتدائی خاکہ مگر اس کے لیے انھوں نے کئی ایکڑ زمین نکال کر کے اس میں لمبی چوڑی جامع مسجد بنوائی، جس میں تقریباً آٹھ ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ دور نزدیک درس گاہیں، دفاتر اور اقامت گاہیں تعمیر کرائیں، اور بڑے بڑے دو پھاٹک کھڑے کردیے، جو ان کی حوصلہ مندی کی شہادت دیتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کئی بیگھے کا فاصلہ ہے، جو ۶ رجولائی کو جنازہ کی نماز کے لیے کافی ہوگیا۔

میں ۲ ربجے پہنچا تو چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہزاروں بوڑھے، جوان نماز جنازہ کا انتظار کررہے تھے، اور نماز پڑھ کر دعائیں دے کر واپس گئے، جب کہ چالیس مسلمانوں کی دعاؤں سے مغفرت ہوجاتی ہے۔

اہم سوال:

میں سوچنے لگا کہ ایک گاؤں میں مسلمانوں کا اتنا بڑا مجمع اس ذوق وشوق سے کیسے جمع ہوگیا؟ مسعود خاں کی کون سی ادا عوام کو پسند آگئی؟ اس سوال کا جواب مجھے صبح تک مل گیا، جب میں وہاں سے گورکھ پور کے لیے واپس ہورہا تھا، تو دیکھا کہ میلوں تک قدرت نے ان کے کارناموں کو قبول عام بخش دیا ہے۔

پانچ ادارے:

مسعود خاں صاحب نے اپنے عزائم کے لیے ایک سوسائٹی قائم کرلی تھی، جس کے ممبران، جس کے عہدے داران اور کارکن ان کے شریک کار تھے، اوران کے مقاصد کو سمجھتے۔ پھر ان کی تکمیل کے لیے اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس سوسائٹی نے اتنا لمبا چوڑا دارالعلوم قائم کردیا،

اور جب پرائمری اسکول چل پڑا تو دارالعلوم سے دکھن طرف اس کی عمارت سے بالکل الگ مگر قریب ایک نسواں اسکول قائم کر دیا، جہاں اردو، ہندی، فارسی، عربی کی تعلیم و تربیت سے سینکڑوں لڑکیاں بہ یک وقت فیض اٹھا رہی ہیں۔اس کی درسگاہیں، اس کا صحن اور اس کے دفاتر کا دارالعلوم کے خزانے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں الگ الگ دو ادارے ہیں، اور چل رہے ہیں۔اسی نسواں اسکول کو ۶۰؍لاکھ کی نئی بلڈنگ، شاندار عمارت عصری تعلیمات کے ساتھ دے کر گئے ہیں کہ اگر علامہ شبلی آ جاتے تو مسعود خاں کی پیشانی چوم لیتے۔

پرائمری تعلیم کے بعد مڈل اسکول اور اس کے بعد انٹر کالج کے لیے انھوں نے دارالعلوم سے پورب طرف نئی زمین لے کر پورا ادارہ قائم کر دیا، جس کے ممبران، جس کی انتظامیہ اور جس کا بجٹ دارالعلوم سے اور نسواں کالج سے بالکل الگ ہے، اور وہ خود کفیل ہو کر چل رہا ہے۔ ہزاروں بچے اس سے جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور نوکریوں کی مختلف راہیں کھل گئی ہیں۔

اس انٹر کالج کو اور نسواں کالج کو انھوں نے اقامتی درسگاہ نہیں بنایا، صرف تعلیمی میدان بنا کر ترقی دی، مگر دارالعلوم اقامتی ادارہ ہے۔

ڈگری کالج تک:

آپ دارالعلوم اور انٹر کالج سے پورب طرف چلیں گے تو تقریباً ۳؍کلومیٹر پر خالص پور جاتے ہوئے اس کے موڑ کے قریب سڑک سے بائیں طرف کھلے میدان میں ایک شاندار عمارت ہے، جہاں تعلیم شروع ہو چکی ہے۔ یہ ڈگری کالج ہے۔اس کا ابھی پہلا سال ہے مگر عارضی مانیتا حاصل کر کے اسے اپنی بنیادوں پر کھڑا کر دیا ہے۔

انٹر کالج اور دارالعلوم نیز اپنے گاؤں سے اتنے فاصلہ پر ڈگری کالج کھول کر اسے کامیابی سے چلانا، بتا رہا ہے کہ مسعود خاں کے ذہن میں نیشنل یونیورسٹی کا تصور ضرور تھا۔ کیوں کہ یونیورسٹی اپنے شعبہ جات کے لیے مختلف کلیات اور دفاتر کے لیے مسلم یونیورسٹی کے طرح ایسا ماحول چاہتی ہے، جہاں فضا آزاد، کھلا میدان، وسیع صحن اور ہزاروں طلبہ زندگی گزارنا سیکھتے ہیں اور ایک خاص ماحول پا کر اس میں پرورش پاتے ہیں۔

اخلاقی بلندیاں:

مسعود خاں عملی آدمی تھے، سادہ زندگی پسند کرتے تھے، روپے، پیسے میں ناقابل یقین حد تک دیانت دار تھے، اور دیانت داروں کو دوست بناتے تھے، ورنہ ان سے الگ تھلگ ہوجاتے تھے۔اسی لیے وہ ایسی فضا میں جینا چاہتے تھے، جہاں ایمان داری، دیانت داری اور سادگی کی پرورش کی جارہی ہو، بلکہ میں عرض کروں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ وہ ایسی فضا پیدا کرنے کی ہمت رکھتے تھے، جہاں سے ایمان داری اور دیانت داری سیکھی جاتی ہے۔

ان باتوں کے لیے چند یادگاریں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جیل سے وزارت کی طرف:

مرکز میں جنتا گورنمنٹ آئی تو اترپردیش میں چرن سنگھ نے چیف منسٹری کے لیے رام نریش یادوجیسے وکیل کو پسند کیا، جنھیں کوئی نہیں جانتا تھا، مگر وہ اعظم گڑھ میں بطور پیشہ وکالت کرتے تھے۔سادہ مزاج اور دیانت دار تھے، اس لیے چرن سنگھ نے انھیں منتخب کیا تھا۔

انھوں نے اترپردیش گورنمنٹ بنائی تو اس میں مسعود خاں صاحب کو جو رام نریش کے ساتھ جیل سے ابھی چھوٹ کر آئے تھے، وزیر بنادیا گیا، اور انھیں پی ڈبلو ڈی کی وزارت سونپ دی۔

میں نے جمعیۃ علمائے اترپردیس کے دفتر کچہری روڈ سے فون پر دارالشفا میں پوچھا کہ مسعود خاں صاحب موجود ہیں؟ جواب ملا کہ موجود ہیں۔میں نے کہا مبارک باد دینے ہم لوگ دفتر سے آرہے ہیں۔کہنے لگے نہیں میں خود آرہا ہوں۔میں نے اصرار کیا کہ آپ نہ آیئے، ہم آتے ہیں۔مگر وہ تھوڑی دیر میں کچہری روڈ پہنچ گئے، اور وہاں موجود سب لوگوں سے شوق وذوق سے مل کر واپس چلے گئے۔نہ کوئی بناوٹ، نہ سجاوٹ، نہ غرور، نہ لوگوں سے اقتدار والی وحشت بس وہی مولوی مسعود خاں جو کل جیل میں تھے، آج وزیر ہیں اور کل مولوی مسعود خاں رہیں گے۔

سادگی:

ندوہ میں ایک اہم نشست تھی، اس میں ہر قسم کے دانشور، علما، فضلا، تجار، وکلا اور عرب کے چند ممتاز حضرات بھی تھے۔مسعود خاں صاحب کو خصوصیت سے دعوت دی گئی تھی کہ عوامی سطح کا

ایک آدمی اتر پردیش کا کابینی وزیر صرف اپنی لیاقت اور کارکردگی سے بن گیا ہے۔

مولانا ابوالحسن ندوی نے اہتمام فرمایا تھا، اس لیے ان کو انتظار بھی تھا، قلق بھی کہ خاں صاحب کسی اہم مجبوری سے نہیں آسکے۔ جب تذکرہ ہوا تو کمبل اوڑھے ہوئے ایک شخص کنارے سے کھڑا ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مسعود صاحب ہیں مگر گمنامی پسند طبیعت خاموشی زیادہ پسند کرتی ہے۔ مولانا علی میاں نے گلے لگالیا۔ کہنے لگے کہ شیروانی پہننے کے قابل نہیں تھی، اس لیے کمبل اوڑھ کر چلا آیا۔ خاں صاحب کی یہ سادگی، یہ ادا اور یہ بے نیازی مولانا علی میاں ہی نہیں ہم جیسوں کو بھی بہت عزیز تھی۔ اس لیے ہم ان کی عزت کرتے تھے، اور وہ ہمیشہ ہم لوگوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ جو چیز ان کو ناگوار ہوتی تھی، برجستہ کہہ دیتے تھے۔ کسی مجلس میں کوئی ضروری چیز رہ گئی تو ذمہ داروں سے اس کو کہنے میں بھی تکلف نہ کرتے تھے، نہ کوئی جھجک۔

کچھ دنوں گھر پر بے کار تھے، ملاقات ہوئی، میں نے عرض کیا کہ 'آپ اعظم گڑھ میں وکالت کیوں نہیں شروع کردیتے؟' کہنے لگے 'ابھی تک جو لوگ میرے آگے پیچھے گھومتے تھے، ان کو عدالت میں کھڑے ہو کر حضور کہنے کو جی نہیں چاہتا۔'

چرن سنگھ کا انداز:

راجیہ سبھا کا الیکشن آیا، تمام پارٹیاں جوڑ توڑ میں آگے بڑھ رہی تھیں چودھری اجیت سنگھ کی لوک دل اتر پردیش میں ایک سیٹ نکال سکتی تھی۔ انھوں نے یاد کیا کہ میرے والد چرن سنگھ نے مرتے وقت کہا تھا کہ 'مسعود خاں کو چھوڑنا نہیں، بہت امانت دار آدمی ہے۔' پھر انھوں نے اپنی ماں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی کہا کہ وہ کہتے تھے کہ 'میرے دو لڑکے ہیں، ایک مسعود خاں دوسرا اجیت سنگھ۔' چنانچہ اتر پردیش سے راجیہ سبھا کے لیے مسعود خاں صاحب منتخب کر لیے گئے۔ اس طرح لوک دل کے ممبران نے چرن سنگھ کی فرمائش پوری کردی۔

ان کی تلاش:

کوئی پندرہ سال ہوئے، میں جون پور کے ریاض العلوم مدرسہ میں حدیث وغیرہ کا مدرس تھا۔ مسعود خاں ریاض العلوم آئے اور تلاش کرتے ہوئے کمرے پر آگئے۔ میں سمجھا از راہ کرم ادھر بھی آگئے ہیں، مگر کہنے لگے کہ 'میں ایک ایسا عالم تلاش کرتا ہوں، جو تعلیم بھی دے سکتا ہو،

انتظام بھی کر سکتا ہو، اور دیانت دار بھی ہو۔'

میں نے کہا 'خاں صاحب! ایسا آدمی مجھے بھی پسند ہے، مگر ایسے لوگ مشکل سے ہاتھ آتے ہیں، اور اگر آ گئے تو ان کے نخرے بہت برداشت کرنے پڑتے ہیں، کیا آپ کر سکتے ہیں؟'

کہنے لگے کہ 'تم میری فکر مت کرو، میں نخرے تو برداشت کر لوں گا مگر ہو وہ دیانت دار آدمی۔'

میں نے ایک فاضل کو ملایا جو افتا کی مشق کر رہے تھے۔ ان کو میں نے بچپن سے پڑھایا تھا، گونڈہ سے جون پور تک وہ پڑھتے رہے تھے۔ سخت مزاج ضرور تھے، مگر علم وفہم، ایمان داری اور دیانت داری پر مجھے کبھی شک نہیں ہوا۔

میں نے بلا کر پیش کر دیا اور خاں صاحب نے میری پسند کافی سمجھ کر انھیں اپنے دارالعلوم میں بلا لیا، اور آج وہی مفتی عبدالقادر صاحب بستوی خاں صاحب کے کاموں کے امین اور دارالعلوم کے صدر المدرسین اور اعظم گڑھ، لکھنؤ، دہلی کے تمام کاموں کے کرتا دھرتا تھے، اور آج بھی ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے، وہ پندرہ برس سے خدمت کر رہے ہیں۔

دوطرفہ اعتماد:

خاں صاحب نے ان برسوں میں ان کی کوئی شکایت نہیں کی اور انھوں نے بھی خاں صاحب کی ہر بات اس وجہ سے برداشت کی کہ خاں صاحب جو کچھ کہتے یا ڈانٹتے ہیں اس میں ضد نہیں ہوتی، خلوص ہوتا ہے۔ اور ادارہ کا کوئی نہ کوئی نقصان ہوتا ہے یا فائدہ، جو بعد میں سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس لیے ان کی ہر قسم کی باتیں تمام لوگ برداشت کرتے ہیں۔

ایمان داری کے کارخانے:

سوال یہ ہے کہ خاں صاحب کسی دیانت دار کو تلاش کرنے مجھ جیسے مدرسہ کے مُلّا کے پاس ریاض العلوم میں کیوں آئے؟ کسی کالج، کسی یونیورسٹی، کسی جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کیوں نہیں گئے؟

میرا جواب یہ ہے کہ ایمان داری اور دیانت داری برتنے والا آدمی جب کبھی امانت داری اور دیانت پیدا کرنا چاہتا ہے تو ایک بڑا مرحلہ ہوتا ہے کہ خلوص، دیانت اور سچائی کس طرح پیدا کی جائے؟ جس پر ایمان داری اور دیانت داری کا محل کھڑا رہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس موقع پر نگاہ کسی کالج، یا کسی جامعہ، کسی یونیورسٹی یا انگلستان و امریکہ کی طرف نہیں اٹھتی، اور نہیں اٹھ سکتی۔ اگر اٹھے گی تو مذہب کی طرف، خدائی علاج اور رسولوں کی زندگی کی طرف، یا ان کے نائبین، صالحین اور اولیاء اللہ کی طرف اٹھے گی۔ کیوں کہ وہاں عمر فاروق، امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم اور مولانا حسین احمد جیسے ائمہ دین ملیں گے، ان کے غلام ملیں گے، ان کا انداز کار ملے گا۔ وہاں امانت، دیانت، خلوص اور سچائی کے نمونے ملیں گے، اور ان نمونوں کے مطابق ڈھالنے والے افراد اور کتابیں اور مضامین ملیں گی۔

اسی لیے مسعود خاں وہاں کی وادی سے بھی گزرنے لگے جو ایمان داری پیدا کرنے کی فکر لے کر اٹھے، اور انھیں وادیوں میں تلاش کرنے لگے، جہاں یہ سنگ پاروں کو ہیرا بنانے والے رہتے ہیں، یعنی مدارس عربیہ۔

کارنامہ:

مسعود خاں نے دیکھا کہ ہمارے اتر پردیس میں مکاتب، مدارس، کالج، جامعہ، اور یونی ورسٹیوں کی کمی نہیں ہے۔ جس نے بھی محنت کی، کاوش کی، کوئی تعلیم گاہ لے کر اسے چلانے لگا مگر مسعود خاں نے دار العلوم کو اپنی زندگی کا مرکز بنایا، اور اسی مرکز کے ارد گرد دنیاوی تعلیم کے تمام مراکز کھول دیے، تاکہ ہمارے معاشرے میں قائم علوم وفنون زندہ رہیں، اور ہر انداز، ہر سائز اور ہر فکر کے لوگ اس میں پیدا ہوتے رہیں۔ اس لیے خاں صاحب نے بہ یک وقت چاروں قسم کے اداروں کو چاروں انداز سے ثابت کر دیا کہ کردار سازی کے لیے علوم نبوت سے بڑھ کر کوئی ادارہ نہیں۔

کردار کی ضرورت:

ایک مرتبہ ایک ایسے گریجویٹ سے ملاقات ہوئی جس کا مضمون تھا پالیٹکس، اور وہ ایم اے کا امتحان دے کر گھر جارہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ''کمیونزم، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرزم جیسی اسکیموں میں سب سے بہتر کون ہے؟''

''جمہوریت سب سے بہتر ہے، مگر کامیاب نہیں ہوسکتی۔''

''کیوں کامیاب نہیں ہوسکتی؟''

''اس وجہ سے کہ اس کو چلانے کے لیے ایمان دار، دیانت دار اور مخلص آدمی ضروری ہیں، اور اس طرح کے کردار والے لوگ نہ عوام میں ہیں، نہ خواص میں۔''

''تو کیوں نہ یونیورسٹیوں میں اخلاق، اخلاص، امانت و دیانت کے موضوع پر لوگوں کو تیار کر کے یہ ضرورت پوری کی جائے؟''

''ایسا نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ خود ایمان واخلاق، سچائی اور دیانت کا کوئی کردار نہیں رکھتے، اور نہ کسی میں پیدا کر سکتے ہیں۔''

''پھر اور دنیا کا کیا ہوگا؟''

''آپس میں دست و گریباں ہو کر چلتے اور لڑتے رہ جائیں گے۔''

حرفِ آخر:

صبح ۸/ بجے گورکھ پور کے لیے روانہ ہوا تو لوگوں کے ہجوم میں رہنے والے مسعود خاں دارالعلوم کے پھاٹک کے پاس تن تنہا محوخواب ہیں، اور لوگ جوق در جوق آ کر انھیں سلام کرتے چلے جاتے ہیں، بلکہ دو مرتبہ رات میں بھی گاڑیوں کی آمد و رفت محسوس ہوئی۔

خالص پور اور کوٹلہ کے راستے اعظم گڑھ کوٹ مسجد پہنچا، تو ایک گلی میں کسی کی گاڑی کھڑی تھی اور تعزیت کرنے والے حضرات آتے جاتے تھے۔ یہ مکان پرانا ہے، گلی میں ہے، اور اوسط درجہ کا ہے جو پہلے کرایہ پر تھا، پھر خاں صاحب نے خرید لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جس شخص نے کروڑوں روپے لگا کر نسواں کالج، انٹر کالج اور ڈگری کالج کی شاندار عمارتیں کھڑی کر دی ہیں، اس کا ذاتی مکان کیوں اس قدر معمولی اور گوشے میں ہے۔

پھر یاد آیا کہ رفیع احمد قدوائی کی نعش لے کر جب جواہر لعل نہرو بارہ بنکی گاؤں پہنچے تھے تو قدوائی صاحب کا ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھ کر رو پڑے تھے کہ جس نے برادران ہند اور مسلمانوں کو آباد کرایا، اس کا مکان اس قدر بوسیدہ!

خاں صاحب کا گھر، اس کی رہائش اور بچوں کی رفتار و گفتار بتاتی تھی کہ ذاتی آمدنی اور قومی آمدنی میں کتنا فرق ہے؟ اور اس فرق کو سمجھنے والے اور برتنے والے کتنے کم لوگ رہ گئے ہیں، ورنہ جس حکومت میں رشوت کا ریٹ مقرر ہو گیا ہے، اس میں آمد و خرچ کے اس احتیاط کو سمجھا نہیں

جا سکتا۔

قومی آمدنی:

مسعود خاں کا کمال یہ ہے کہ وہ ادھر ادھر سے لاکھوں روپے وصول کرتے تھے، اور اسے تعلیم کی اسکیم مرتب کرنے میں بے پناہ خرچ کرتے تھے۔ اس میں سے اپنے لیے ایک پائی کھانا حرام سمجھتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ خلیجی علاقوں میں گئے، اور لاکھوں روپے اسکول کے لیے لائے مگر سفر خرچ نام کا ایک پیسہ نہیں لیا، آنا پائی سے جمع کر دیا اور تعمیرات میں خرچ کر دیا۔ اپنے گھر کی تعمیر میں نہیں، اسکول کی تعمیر میں۔ گھر کا کرایہ تو اپنی خالص ذاتی آمدنی سے ادا کیا کرتے تھے، اس لیے ان کی بات میں وزن تھا، طاقت تھی اور قبولیت تھی۔

نقش قدم ابھارے:

ضرورت ہے کہ مسعود خاں اور ان کے تعلیمی عشق کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ کیوں کہ انھوں نے دماغ تیز کرنے والے علم وفن کے ساتھ ہی دل اور روحانیت کو زندہ رکھنے والے علوم الٰہیہ کو بھی اہمیت دی تھی۔ اس اہمیت کو اگر سمجھ لیا جائے تو انھیں اکیسویں صدی کا سرسید ماننا پڑے گا، اور اس نہج پر دینی اور دنیاوی تعلیم کا انضمام کرنا ہوگا۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔ ٢٠٠٢ء

انقلابی خطیب
مولانا حقانی علیہ الرحمہ

سنت و جہالت کی بحث ہندوستان میں سو برس سے چل رہی ہے، اس بحث کو دیوبند اور بریلوی مکاتب فکر نے علمی رنگ بھی دے دیا، یا عوامی رنگ بھی۔ اس لیے بڑے بڑے مقرر، مصنف اور فقیہ اس میدان میں اترتے چلے گئے، حتیٰ کہ عقائد و مسائل کے لیے مناظرے بھی خوب ہوئے۔

قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ اس نے گجرات کے ایک قوال کو منتخب فرما کر سنت کے فروغ اور جہالت و بدعت کے دفاع میں لگا دیا تو انھوں نے گجرات و ممبئی سے اتر پردیش اور بہار تک دھوم مچا دی۔ عوام کو ان کے چٹکلے، خواص کو قرآن و حدیث کے حوالے، عورتوں کو ان کی کہانیاں اس قدر پسند آئی تھیں کہ تین تین گھنٹے تک لوگ تازہ دم رہ کر غور سے سنا کرتے تھے، اور خوش ہوتے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ کان پور جیسے شہر میں دو دو لاکھ مسلمان جمع ہو جاتے تھے تو اس میں دس پانچ ہزار عورتیں آتی تھیں اور حیرت ناک طور پر خاموش ہو کر ان کی بات سنا کرتی تھیں اور جاگتی رہتی تھیں۔ ایسے عجیب و غریب خطیب افسوس کہ ۱۲ر مئی ۲۰۰۳ء کو عصر کے بعد طویل علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

امتیاز:

وہ تقریر شروع کرتے تو خطبہ نہیں دعا سے شروع کرتے اور دعا کے لیے یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

اے ابر کرم ذرا تھم کے برس اتنا نہ برس کہ وہ آ نہ سکیں
جب وہ آ جائیں جم کے برس اتنا تو برس کہ وہ جا نہ سکیں

جب تقریر کرتے تو ہمیشہ کسی ایک موضوع پر کرتے، اور دو ڈھائی گھنٹوں میں اس کا حق ادا کرتے تھے۔ قرآنی آیات پڑھ کر، احادیث کا حوالہ دے کر، پھر کتاب کا نام، باب کا نام اور حدیث نمبر بیان کر کے آگے بڑھتے تھے۔ پورا مجمع ان کی ذہانت اور حافظہ پر دنگ رہتا تھا۔

پھر قرآن وحدیث کی تشریح عام زبان، عام لب ولہجہ میں اس طرح کرتے تھے کہ عورتیں بھی سمجھ جاتی تھیں کہ حقانی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ فقہ کی مشہور کتاب 'ہدایہ' کا حوالہ دیا تو سند کے لیے عین الہدایہ جیسی شرح کا حوالہ دیا اور اس کی اہمیت کے لیے بتایا کہ اتنے ہزار صفحات کی کتاب ہے۔ عوام کو خوش کرنے کے لیے کہنے لگے کہ دس کلو اس کتاب کا وزن ہے۔ اس طرح وہ عوام وخواص دونوں کی زبان بول کر پورے مجمع کو جگائے رکھتے تھے اور ان کو مطمئن رکھتے تھے کہ وہ بڑی عجیب باتیں کہہ رہے ہیں۔

ان کی تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ پوری تقریر میں جہاں کتابوں کا حوالہ صفحات، اور نمبرات کا حوالہ دیتے تھے، وہیں بے حوالہ چٹکلوں کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے اور وہ خاصے کی چیز ہوتی تھی، مضمون کے مطابق بھی، دلچسپ بھی۔ ان میں وہ قصے بھی ہوتے تھے جو لوگ مواد کے لیے دیا کرتے تھے، جیسے حضرت تھانوی کی مجلسوں میں قصے کہانیاں ملا کرتی ہیں۔ لیکن حقانی صاحب بہت سے چٹکلے اپنی ذہانت، حاضر دماغی اور تفریحی مزاج سے گڑھ دیا کرتے تھے اور خوب سناتے تھے۔ مثلاً محرم کا جلوس، اس میں تاشے، ڈھول خوب بجاتے ہیں، مگر حقانی صاحب کے نزدیک کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ حقانی صاحب کہتے تھے کہ مجھ سے سنیے! 'تاشہ پوچھتا ہے کہ 'شیطان کے ساتھ کون جائے گا کون؟' یہ سوال وہ بار بار کرتا ہے اور کوئی جواب نہیں دیتا، صرف ڈھول جواب دیتا ہے کہ 'ہم جائیں گے، ہم جائیں گے۔'

اسی طرح وہ چند عورتوں کا سفر بیان کرتے تھے کہ وہ درگاہوں پر گئیں اور ہر جگہ پھول چڑھائے، منت مانگی، کاغذ لکھ کر دیا مگر کہیں سے کچھ نہ ملا۔ اگر ملا تو حضرت اجمیری کی درگاہ سے۔ حقانی صاحب پوچھتے تھے کہ جو لڑکا خدا نہیں دے سکا، کوئی پیر ومرشد نہیں دے سکا، وہ خواجہ اجمیری کے دربار سے مل گیا۔ اسی کا نام شرک ہے اور مسلمان عورتیں خوش ہوتیں ہیں، پھر جا کر منت پوری کرتی ہیں اور خدا کو بھول جاتی ہیں کہ خالق ومالک وہی ہے۔

جادوگری:

حقانی صاحب اپنی بے صفحہ کی بات کے لیے بہت مشہور اور بہت مقبول تھے، اور وہ باتیں عجیب ہوتی تھیں۔

میں نے گونڈہ، بستی، ڈومریا گنج اور بلرام پور میں ان کا قیام دیکھا ہے، تقریریں سنی ہیں، اور پانچ پانچ ہزار عورتوں کا سناٹا دیکھا ہے۔ حالاں کہ مشہور بات ہے کہ چار عورتیں ایک جگہ خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتی ہیں، پھر ہزاروں عورتوں میں سناٹا، سکون اور شوق پیدا کرنا حقانی صاحب کا فن تھا عجیب وغریب فن، جسے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس فن کے لیے دو چیزیں ان کے کام آتی تھیں، ایک تو بے صفحے کی کہانیاں، دوسری ان کی بے پناہ خطابت کا جوش۔ وہ جب عورتوں کے فضائل بیان کرتے تھے پھر ان کی کمزوریوں کا جائزہ لیتے تھے تو ان کی خطابت، ان کا جوش بیان، ان کی روانی اور حاضر دماغی دیکھ کر مجھ جیسے لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ اور یہ ان کا انفرادی مقام تھا جہاں اچھے سے اچھا مقرر کبھی نہیں پہنچ سکا۔

میں ہو بہو نقل نہیں اتار سکتا، مگر کچھ انداز بنا سکتا ہوں، ان کی اٹھان اس طرح ہوتی تھی۔

'اے میری ماں! جب خدا تجھ سے راضی ہوتا ہے اور تجھے توفیق دیتا ہے تو تیری زندگی، تیری گود، اور تیری عادتیں سدھر جاتی ہیں۔ پھر تیری گود میں ابراہیم آتے ہیں، موسیٰ آتے ہیں اور عیسیٰ پرورش پاتے ہیں، انبیا، اولیا، صلحا پیدا ہوتے ہیں، امرا، سلاطین اور انصاف پرور حکام جنم لیتے ہیں، جس کی وجہ سے پوری زمین امن، سکون اور انصاف سے بھر جاتی ہے، ایمان واسلام کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور ایسی مائیں دنیا میں جنت بسا دیتی ہیں۔'

'لیکن اے میری ماں! جب تو خدا سے دور ہو جاتی ہے، ایمان واسلام سے بے پرواہ ہو جاتی ہے تو خدا تجھ سے ناراض ہو جاتا ہے، شیطان تیری رہنمائی کرتا ہے، پھر تیری گود میں نمرود، شداد اور قارون پیدا ہوتے ہیں۔ تیری گود میں سرکش، بے ایمان اور بے انصاف لوگ پرورش پاتے ہیں جو دنیا کو بے ایمانی، جہالت، خون ریزی اور بے انصافی سے بھر دیتے ہیں، آبادیاں تہس نہس ہو جاتی ہیں، سکون سے جینا حرام ہو جاتا ہے۔'

'ایسے میں اے میری ماں! تو اپنی قیمت پہچان، ایمان اور عمل صالح کی طرف لوٹ آ، خدا کو راضی کرنے کی کوشش کر، حضور ﷺ کی سنتوں کو زندہ کر کے اپنی اولاد کو نیکی سکھا دے، ایمان سکھا دے، آخرت کی فکر سکھا دے تو یہ دنیا پھر جنت ہوسکتی ہے۔ تو سنبھل جائے تو دنیا سنبھل جائے۔'

جادوگری:

حقانی صاحب اپنی ماں کو مخاطب کر کے گھنٹہ بھر جس جوش، جس درد اور سچائی کے ساتھ مخاطب کرتے تھے وہ ان ہی کا حصہ تھا اور وہی نباہ سکتے تھے۔ چنانچہ ڈومریا گنج میں دیکھا ہے، گاؤں کی پانچ ہزار عورتیں جس توجہ اور دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی تھیں، وہ خود شہادت دیتی ہیں کہ آج بھی کوئی ہمدردی اور سلیقے سے عورتوں کو مخاطب کرے تو وہ غور سے سنتی ہیں اور اس سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ مگر کوئی ایسی جادوگری کرے تب تو۔

علمیت اور ذہانت:

قدرت نے حقانی صاحب کو غضب کا حافظہ دیا تھا، اس لیے وہ قرآن کی ہر آیت کا صفحہ اور نیز حدیث کی کتاب، باب اور صفحہ کا حوالہ دے کر مجمع کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حدیث کے حوالے کا صفحہ بھول گئے تو ڈائس پر سنا کہ وہ خاموش ہو کر درود شریف پڑھنے لگے، اتنے میں صحیح حوالہ یاد آ گیا تو پھر اسی حوالہ سے تقریر کرنے لگے۔

وہ قرآن وحدیث کو اردو ترجمہ کے ذریعہ پڑھتے تھے، مگر آیات اور احادیث کا جوڑ اور استدلال اس قدر عمدہ کرتے تھے کہ پڑھے لکھے لوگ چکر میں پڑ جاتے تھے۔ پھر ان کو عوامی طور پر بیان کرنے کے لیے چٹکلے، شعر اور بے صفحے کی باتیں اس طرح موقع موقع سے بیان کر دیتے تھے کہ سارا مجمع جاگ جاتا تھا۔ حقانی صاحب مختلف موضوعات پر بولتے تھے، پھر اس میں خلط ملط نہیں کرتے تھے بلکہ ہر موضوع کا حق ادا کرنے کے لیے ان کے پاس مناسب آیات واحادیث کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اس لیے ہر موضوع پر دو دو گھنٹے بول کر ان کی تفصیلات بیان کر دیتے تھے۔

وہ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، ہمیشہ درمیانی سطح کے لوگوں میں رہتے تھے، اس لیے

عوامی سطح کے خیالات، انداز گفتگو اور دلائل مہیا کر کے اپنی تقریر کو عوام وخواص دونوں کے لیے قابل قبول بنا دیتے تھے۔مثال کے طور پر انھوں نے ایک فقہی مسئلہ پر 'ہدایہ' جیسی قابل اعتماد کتاب کا حوالہ دیا اور صفحات و باب کے ساتھ دیا تو فرمایا کہ 'عین الہدایہ' میں لکھا ہے جس کی قیمت کئی ہزار روپے ہیں اور اس میں اتنے ہزار صفحات ہیں، پھر انھوں نے کہا کہ دس کلو اس کا وزن ہے۔'

علما کے لیے کتاب کا وزن کوئی معنی نہیں رکھتا مگر عوامی سطح پر وہ کتاب بڑی وزنی اور معتبر ہوگئی۔اللہ اکبر! دس کلو جس کا وزن ہو،اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سنت اور بدعت کے مسائل کو عوامی سطح پر لا کر وہ خوب ذہن نشیں کر دیا کر دیتے تھے۔

بلبل ہند:

سنت اور بدعت کے بجائے وہ سنت اور جہالت کہہ کر اپنی بات قابل قبول بنا دیتے تھے۔اسی لیے ان کی تقریر کفر وشرک، گالم گلوج اور مناظرہ بازی کی اصطلاحوں سے پاک رہتی تھی۔ وہ عوامی بدعات اور رسومات پر جب تنقید کرتے تھے تو اس کو چٹکلوں اور بے صفحہ کی باتوں سے دلچسپ بنا دیتے تھے۔ بریلوی حضرات کو حشمتی، رضا خانی، جیسے تیز الفاظ سے نہیں پکارتے تھے بلکہ محبت بھرے انداز میں میرے 'بھولے بھائی' کہا کرتے تھے۔اس لیے بریلی طبقہ کے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے اور آخر تک ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ بریلی اور دیوبندی علما کا اکھاڑہ ہے کان پور، مگر حقانی صاحب نے وہاں اپنی تقریر میں سب کو جوڑ دیا تھا۔اس لیے دو دو لاکھ کا مجمع ہوتا تھا اور اس میں وہ بلبل ہند کی طرح چہچہایا کرتے تھے۔

انداز استدلال:

حقانی صاحب کا اصل موضوع تھا سنت و جہالت ۔ چنانچہ انھوں نے اس پر ایک معقول قسم کی کتاب بھی مرتب کرادی ہے، جو قرآن وحدیث کے دلائل سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس عرصہ میں کبھی کبھی اہل حدیث حضرات بھی ان سے ٹکرا گئے ہیں۔ چنانچہ مصافحہ کی بحث دونوں میں بڑھ گئی تو معاملہ ایک تیسرے کے سامنے پیش ہوگیا۔اہل حدیث عالم نے تشہد سکھانے والی حدیث سامنے رکھ دی کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ''کـــان یـدی بیـن یـدی رسـول

اللہ ﷺ‘‘ کہ میرا ہاتھ حضور کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔حقانی صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ’دیکھیے! حضور نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ابن مسعود نے اگر ایک ہاتھ سے کیا ہے تو حنفی لوگ حضور کی اتباع کرتے ہیں اور یہ حضرت ابن مسعود کے متبع ہیں اور کہتے ہیں کہ حنفی خلاف سنت ہیں۔اس برجستگی سے پورا مجمع سناٹے میں آ گیا جب کہ مولوی صاحب چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔‘

بے حد مصروف:

سرورِ دو عالم ﷺ نے جہاں دین کی بقا کے لیے فرمایا ہے کہ ’اللہ تعالیٰ برسوں برس پر کوئی شخص پیدا کرے گا، جو دین کو اپنی حالت میں لانے کے لیے بدعات وخرافات کو چھانٹ کر گویا دین کی تجدید کر دے گا۔‘اسی طرح انتظام کے لیے خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’دین اسلام کی تائید و حمایت کے کام کے لیے اللہ تعالیٰ کبھی بدعمل اور بدکردار آدمی کو کھڑا کر دے گا، جو اپنے مقام پر دین کو سہارا دے گا۔‘

اس حدیث کی روشنی میں دیکھیے تو گجرات کے ایک قوال آدمی کو اسٹیج پر لا کر سنت رسول اور دین خالص کی حمایت کے لیے حیرت ناک کارنامہ انجام دلا دینا ہے۔اور بدعات عام طور سے عوامی سطح سے اٹھتی ہیں، پھر خواص بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے خالص عوامی آدمی کو عوامی انداز اور عوامی زبان میں توفیق دیتا ہے تو وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر اس سلسلے میں ان کو اس قدر عوامی حمایت حاصل ہوئی کہ آپ مہینے دو مہینے بعد کی تاریخ نہیں پا سکتے تھے، وہ چھ چھ مہینے بلکہ سال بھر کی تاریخ دیا کرتے تھے، اور لمبی تاریخ پر اپنے لاؤلشکر کے ساتھ پہنچ جاتے تھے۔گاڑی ان کی، لاؤڈ اسپیکر ان کا اور قافلہ ان ہی کا۔اس لیے وہ کہا کرتے تھے کہ ’تقریر کا مدار لاؤڈ اسپیکر پر ہے اور وہ میرا بھتیجہ ہے، اس لیے میں اس کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔‘

سخت شکایت:

کسی سفر میں ایک عالم صاحب نے از راہ شکایت حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے عرض کیا کہ ’آپ حضرات نے حقانی جیسے جاہل کو ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے‘ تو قاری صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ’ہم لوگوں نے تو آپ کے دسیوں جاہل برداشت کیے، آپ سے ہمارا ایک جاہل برداشت نہیں ہوتا۔‘ اور وہ عجیب شخص تھے، اپنی جہالت کا علی الاعلان اقرار

کرتے تھے۔کبھی کبھی شعروں کوخوب تال سر سے گا کر دکھاتے تھے کہ میں اس طرح قوالی گایا کرتا تھا اور کبھی پورا قصہ بتا کر اپنی ناواقفیت، جہالت پھر تائید غیبی کو بیان کیا کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ خدا نے انھیں جہالت سے سنت تک کھینچ کر پہنچا دیا۔

احترام علم:

ان کا اسٹیج اپنا ہوتا تھا، اس پر وہ خود گھنٹوں بولا کرتے تھے یا اپنے کسی ہم خیال کو تھوڑی دیر بولنے کا موقع دیتے تھے۔علما کی کانفرنسوں میں تقریر نہیں کیا کرتے تھے، اس لیے جب ان کے اسٹیج پر اکابر علما تشریف رکھتے تو وہ ان سے گزارش کرتے تھے کہ آپ آرام فرمائیں تا کہ آزادی اور ہمت سے بول سکیں، ورنہ اکابر کے سامنے عقائد پر بولنا مشکل کام ہوتا ہے۔

لیاقت:

حقانی صاحب اردو پڑھ لیتے تھے اور اسی سے احادیث کا استدلال کرتے تھے۔پھر علما کو جمع کر کے پوچھتے تھے کہ اس میں کوئی خامی یا خرابی تو نہیں رہ گئی ہے؟ وہ خود لکھنے پر قابو نہیں رکھتے تھے تو کبھی اپنی بیوی سے اور کبھی دوسرے ساتھی علما سے لکھواتے تھے اور کتابی شکل میں چھپوا کر اسے فروخت کیا کرتے تھے اور وہ خوب بکتی تھیں۔

آپ ان کی کتابیں پڑھیے تو عام زبان میں ہیں، مگر ان میں روایتی مسائل بھی ہیں، عقائد کی بحثیں بھی ہیں، علمی معرکے بھی ہیں اور خوب ہیں۔ بڑی سے بڑی بات بھی وہ کہتے ہیں تو اپنے عوامی لہجے میں ادا کرتے تھے اور اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔شاید اسی لیے ان کے پیرو مرشد سے کسی مجذوب نے فرمایا تھا کہ 'جا تیرا گھوڑا سب سے آگے نکل جائے گا' اور واقعی وہ تنہا تھے ہزاروں میں چمکے۔

دعائے مغفرت:

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جوار رحمت میں جگہ دے اور دین کو فروغ دینے والے علما اور ائمہ کے ساتھ اٹھائے۔علما وصلحا اور اہل مدارس سے گزارش ہے کہ مولانا حقانی کے رفع درجات کے لیے دعا فرمائیں ایصال ثواب کریں اور دوسروں سے کرائیں۔

❑❑❑

ماخذ: 'دانشور' گورکھ پور۔۲۰۰۳ء

زندۂ جاوید مولانا محمد رضوان القاسمی

روزانہ سینکڑوں آدمی مرتے ہیں مگر جس کے مرنے پر سارا علاقہ کانپ جاتا ہے، اور ہزاروں آدمی تڑپ جاتے ہیں، اس کی موت آدمی کو زندہ جاوید بنادیتی ہے۔

مولانا محمد رضوان انھیں لوگوں میں سے تھے کہ ۱۳/ اکتوبر کو فالج کے ہاتھوں اللہ کو پیارے ہوگئے اور سارا حیدرآباد لرز اٹھا۔ وہاں سے دہلی، دیوبند، لکھنؤ، پٹنہ، دربھنگہ تک کے علما نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر انھیں درد دل کے ساتھ رخصت کردیا۔ آپ حیدرآباد کے علما وفضلا کی اگر پانچ افراد کی بھی فہرست تیار کریں، تو اس میں مولانا محمد رضوان صاحب کا نام ضرور لکھیں گے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے ۳۰/ برس پہلے جو سبیل السلام کا مکتب قائم کیا، آج ان کی جدوجہد سے ایک درسگاہ نہیں، بلکہ ایک علمی تحریک بن گیا جو بچوں کی تعلیم کا، ان کی تربیت کا انتظام کرتا ہے اور اس کے ساتھ انھوں نے فقہی مجلسیں کرکے سارے ملک سے علما وفقہا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔ اور تیسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ ہر سال کئی روزہ اجلاس کرکے علمی موضوعات پر اصحاب علم سے خطبہ دلواتے تھے، اور اس کا اجلاس مدرسہ میں یا جامع مسجد میں نہیں بلکہ حیدرآباد کے باغ عامہ میں کرتے تھے، جہاں شہر کے معزز حضرات، دانشور افراد، علما، ڈاکٹر، لیڈر اور اصحاب قلم ہوتے تھے، جو خالص علمی مباحث میں دینی معلومات پر داد دیتے تھے۔ پھر ان کو 'خطبات حیدرآباد' کے نام سے مولانا محمد رضوان صاحب ملک بھر میں تقسیم کرتے تھے۔ پھر وہ اپنے ادارے سے سہ ماہی پرچہ جاری کرکے اسلامی، دینی اور سیاسی مسائل پر روشنی پھیلاتے رہے۔

اس طرح ان کے سبیل السلام نے دارالعلوم رحمانیہ، معین الاسلام اور دارالعلوم حیدرآباد کو پیچھے چھوڑ کر پوری فضا کو گرمادیا تھا۔ افسوس تو ضرور ہے کہ وہ اس تحریک کو آگے لے جاتے

ہوئے گزر گئے مگر مجھے خوشی ہے کہ جتنی عمر ان کو ملی تھی، اس کا ایک ایک لمحہ وہ کسی بیمار کی صحت کے لیے نچوڑ کر اور خود سرخ رو ہو کر خدا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

(۲)

مولانا رضوان کے شاگرد، ان کے ساتھی اور ان کے استاد محترم مولانا برکت اللہ صاحب حسرت سے انھیں دیکھتے رہے اور وہ سب کو داغ مفارقت دے کر چلے گئے۔

دربھنگہ میں جس بچے کی پیدائش ہوئی تھی، اسے کون جانتا تھا کہ اپنے وقت کا عالم، فاضل، خطیب، صاحب قلم اور نظم وضبط کا فن کار ہوگا، لیکن وہ چلا گیا تو برسوں لوگ اس کے حالات، عزائم، کارنامے اور بچھائی ہوئی بساط کا جائزہ لیتے رہیں گے۔

فقہی کانفرنس میں اچانک میں پہنچ گیا تو ڈائس پر ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسپتال سے آئے تھے، چہرے پر بیماری کا اثر بھی تھا مگر بولنے میں، کانفرنس کے مختلف موضوعات میں حصہ لینے میں ان کو مطلق کوئی تکان نہیں تھی۔ میں نے ٹوک دیا کہ مولانا بیماری سے بہت لڑتے ہیں، تو مسکرا کر چلے گئے۔ ان کے دفتر میں لوگوں نے گھیرا تو ہنستے ہوئے بولے کہ ڈاکٹر بے وقوف ہوتے ہیں، انھیں بیماری کے تقاضے معلوم ہوتے ہیں، کام کے تقاضے وہ کیا جانیں؟

اس عزم وہمت کے ساتھ کام کرنے والا مولانا محمد رضوان خدا کے دربار میں مرد مجاہد کی طرح حاضر ہو گیا، جس کا وقت پورا ہو گیا اور کام نہیں پورا ہوا، قدرتاً دماغ کی رگ پھٹ گئی اور اس قدر خون نکل آیا کہ اسے کنٹرول نہیں کیا جا سکا اور ڈاکٹروں کی ساری کوششیں تھک کر چور ہو گئیں۔

(۳)

حیدرآباد میں ایک بزرگ حاجی محی الدین صاحب تھے، ان کے بچے تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے زمین لے کر ایک باغ لگایا، اور ایک لمبی چوڑی عمارت بنوادی، جو دومنزلہ تھی اور چاروں طرف پلڑ دے کر کھڑی کر دی گئی تھی۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ اس عمارت کے ایک حصہ میں مدرسہ کھول دو، اور کھول دیا گیا۔ اس کا ناظم ایک عالم صاحب کو بنایا گیا جو مسجد عامرہ کے خطیب، اور دارالعلوم دیوبند سے جلد ہی تشریف لے آئے تھے۔ ان ہی ناظم تعلیمات صاحب کا نام تھا مولانا محمد رضوان۔ پھر حاجی صاحب نے میری تلاش کروائی تو میں جمعیۃ علمائے ہند کی

لائبریری میں قرآن مجید کے ترجمہ شیخ الہند کو موجودہ زبان میں آسان کر رہا تھا۔حاجی صاحب میرے جدامجد حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فیض آبادی کے مرید اوران کے خلیفہ تھے،اورانھیں میں بچپن سے خوب جانتا تھا۔جب وہ ٹانڈہ سے ہمارے یہاں عمدہ شیروانی،ترکی ٹوپی پہنے ہوئے آتے تھے۔مگر حیدرآباد پہنچ کر شیخ وقت ہوگئے۔ان کے بلانے پر میں وہاں چلا گیااوردارالعلوم رحمانی کا صدر بنا کر بیٹھادیا گیا۔مہتمم صاحب کے صاحبزادے حکیم شمس الدین صاحب تھے،اس طرح میری پہلی ملاقات مولانا محمد رضوان قاسمی سے اسی مدرسہ میں ہوئی،اور دونوں کام کرنے لگے۔ناظم صاحب نے عربی شروع کرادی تھی،اورایک جماعت ہدایۃ النحو پڑھ رہی تھی،دوسرے سال وہ بچے کافیہ میں پہنچ گئے۔وہ آٹھ افراد تھے،جواوسط درجہ کے اچھے لڑکے تھے۔میں نے ان کو کافیہ پڑھا دیا،اور کہہ دیا کہ اب تمہیں کوئی روک نہیں سکتا۔چنانچہ ایک ندوہ سے عالم فاضل ہوا، بقیہ دیوبند وغیرہ سے فارغ ہوئے۔

اس سال کام کرنے میں میرااورمولانا محمد رضوان صاحب کا ساتھ خوب رہا۔حضرت حاجی صاحب اوران کے صاحبزادگان نے محسوس کیا کہ ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے،اوراس میں شہر کے خاصے لوگوں کوشامل کرلیا جائے۔چنانچہ ایک مجلس شوریٰ بن گئی،جن میں باہر کے نام مولانا رضوان صاحب نے بتائے،گھر کے لوگ تو تھے ہی،مسعود صاحب وغیرہ بھی تھے۔اس طرح مجلس شوریٰ نے مدرسہ کوسنبھال لیا۔آخر سال میں مہتمم صاحب اورصدر مدرس میں کشاکش ہوگئی تو شعبان میں میں نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کردیا کہ آئندہ میں حاضر نہیں ہوں گااور مدرسہ چھوڑ دیا،تو مولانا محمد رضوان القاسمی اور مولانا حسن صاحب جیسے علما نے بھی مدرسے کوچھوڑ دیا۔

دارالعلوم رحمانی چھوڑنے کے بعد مولانا محمد رضوان نے پہاڑی پر۲۶؍ایکڑ زمین خرید کر مکتب شروع کردیا،اورمجلس شوریٰ کے اہم اراکین کواپنے ساتھ لے کر سبیل السلام کو چلانے لگے،تو چند ہی سالوں میں وہ دارلعلوم بن گیا،اوراب کہنے میں تو دارالعلوم ہی نہیں جامعہ عربیہ بھی بن گیا۔اس میں مولانا کی جدوجہد،نظم،ضبط اوران کے رفقا کامخلصانہ تعاون بھی رہا،توایک محلّہ بھی بن گیا،اوراس میں کئی مسجدیں اورمخصوص انداز کی وسیع عمارتیں خوبصورت اورخوش وضع موجود ہیں۔

(۴)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں طرح طرح سے آتی ہیں، تو کسی کو قلم، کسی کو زبان، کسی کو انتظام، کسی کو علم، کسی کو ذکر، کسی کو احسان کی دولت سے نواز دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض ہستیوں کو خصوصیت کے ساتھ نوازا جاتا ہے۔ ان مخصوص افراد میں مولانا محمد رضوان بھی تھے۔ وہ اگر مسجد عامرہ کے خطیب تھے، تو دارالعلوم رحمانی اور سبیل السلام کی درس گاہوں کے اچھے مدرس اور بہترین ناظم بھی تھے اور بہت اچھے قلم کار بھی تھے۔ اس لیے حیدرآباد کے اخبار ''سیاست'' میں ہفتہ وار کالم بھی لکھتے تھے، اوران کی کتابیں اور مضامین بھی شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے ان کو اچھا علم دیا تھا، قوم کی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کران میں بھرا ہوا تھا۔

اس طرح انھوں نے اپنے لیے جنت کے مختلف دروازے کھلوا لیے تھے اور وہاں ان کا استقبال کر رہے ہیں ان کے علم، عمل اور اخلاص کے کرشمے۔

(۵)

مولانا محمد رضوان صاحب کو خدا نے آٹو میٹک دماغ دیا تھا، اس طرح ان کا علم کرشماتی بن گیا تھا۔ چنانچہ مولانا عمید الزماں صاحب نے اور ہم لوگوں نے ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی تنظیم قائم کی تو حیدرآباد سے آ کر انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ ان کی سوجھ بوجھ، بحث ونظر اور حرکت وعمل کا مشاہدہ کر کے فضلائے دیوبند نے ان کو نائب صدر بنا دیا، اور ہر نشست میں وہ اپنی صلاحیت کا لوہا منواتے تھے۔ وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر تھے، تو وہاں بھی ہر طرح کے علما وفضلا، دانشور اور وکلا موجود رہتے تھے، مگر بحث ونظر میں دخیل ہو کر لوگوں سے اپنے وجود کا احساس دلا دیا کرتے تھے۔ ان کو سننا بھی خوب آتا تھا اور بولنے کا فن بھی خدا نے خوب دیا تھا۔ بحث ونظر میں عام طور پر آواز بھی تیز ہو جاتی، بھویں چڑھ جاتی ہیں مگر مولانا محمد رضوان ان کمزوریوں سے واقف نہیں تھے۔

(۶)

حیدرآباد میں ایک کانفرس ہو رہی تھی، مختلف موضوعات پر لوگ اپنے اپنے خیالات پیش کر رہے تھے۔ ایک تجویز حکومت سے کسی مطالبہ پر پیش ہوئی اور مولانا محمد رضوان نے اس پر

تعارفی تقریر کی تو حکومت کی روش پر انھیں غصہ آ گیا۔ میں نے بحث ونظر میں اس قدر غصہ ہوتا کبھی نہیں دیکھا تھا، مگر دیکھا تو مولانا رضوان کی تیزی بڑھ گئی تھی، اور وہ پوری روانی سے اپنی بات کہہ رہے تھے، اور سوال کر رہے تھے۔ غصہ میں ان کی آواز تیز اور زبان رواں ہوگئی تھی۔ دوسری کوئی بات نہیں کی، مگر غصہ میں انھیں بلا رورعایت کے جو کہنا تھا، کہہ دیا، اس کی پرواہ نہیں کی کہ اس کا حکومت پر کیا اثر پڑے گا؟ جو حق سمجھتے تھے کہہ کر چپ ہو رہے۔

(۷)

حیدرآباد کے لیے وہ عام طور پر تیز رفتار ٹرین سے سفر کرتے تھے، لیکن اگر کبھی کسی ضروری کام سے وقت پر پہنچنے کا امکان نہیں رہتا تو ہوائی جہاز سے جا کر میٹنگ میں شریک ہوجاتے۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح کا سفر وہ شوق سے نہیں مجبوری اور ضرورت سے کرتے تھے، اور یہ ان کی بڑی خوبی تھی۔

(۸)

میں ۱۹۷۲ء میں وہاں گیا تو مولانا شادی شدہ تھے، اور ان کے کئی بچے تھے، لیکن ان کو ضرورت محسوس ہوئی تو بڑی خاموشی سے ایک حیدرآبادی لڑکی سے شادی کر کے ایک نہ شد دوشد کا نظارہ پیش کر دیا۔ مگر حتی المقدور دونوں کو راضی رکھتے تھے۔ مولانا صاحب اولاد تھے، اور ماشاء اللہ بچے ذہین ہیں، اور انھیں وہ سلیقہ مندی سے رکھا کرتے تھے۔ آنے جانے والوں کا انھیں ادب سکھاتے تھے۔ مجھے اعظم گڑھ کانفرنس میں ان کا ایک لڑکا ملا، اس نے تعارف کرایا، اور کہا کہ ندوہ (لکھنؤ) سے آیا ہوں، وہاں عالم کا کورس کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے کانفرنس کے موقع پر حیدرآباد میں دیکھا تھا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے، علم وعمل سے نوازے۔ آج ان بے چاروں پر یتیمی کا سایہ ہے مگر ان کے اردگرد ایسے لوگ موجود ہیں، جو ان شاء اللہ ان کو یتیمی کا داغ محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ پھر سبیل السلام میں اگر وہ اپنی صلاحیت لگا کر آگے بڑھ گئے تو بڑے مواقع بھی آگے بڑھنے کے، اپنے کو سنوارنے اور علم کو چار چاند لگانے کے ملیں گے، بشرطیکہ وہ اپنے کو حاکم بنا کر نہیں طالب علم بنا کر رکھیں۔ پھر علم شوق وجد جہد کے لیے آپ جو منزل بھی پسند کریں گے، وہ آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگی۔

(۹)

اہل علم، اہل مدارس سے گزارش ہے کہ مولانا محمد رضوان کے لیے ایصال ثواب کریں اوران کے کارناموں کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں، توان شاء اللہ جدوجہد کی دنیا میں پہنچ کر آپ عمل کی قوت سے لطف اندوز ہوں گے۔

❑❑❑

ماخذ: 'ترجمان دارالعلوم' دہلی ۔۲۰۰۴

وزیراعظم کا وحشیانہ قتل

۳۱/ اکتوبر کی صبح ۹/ بجے دو سکھوں نے انتقامی جنون میں ہماری وزیراعظم کو وحشیانہ طور پر قتل کر دیا، جس سے پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی، ساری دنیا دم بخود رہ گئی اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک ورق پلٹ گیا۔ لیکن کارخانہ قدرت اس قدر مستحکم، اتنا بے پرواہ اور ایسا منظّم ہے کہ اس میں بال برابر فرق نہیں پڑا۔ کیوں کہ یہی وقت ان کے جانے کا مقرر تھا، اور وہ چلی گئیں۔ اگر اس مظلومیت کے ساتھ نہ جاتیں تو دوسرا کوئی بہانہ ہوتا، مگر بہر حال وہ جاتیں اسی لمحہ جس لمحہ کو قدرت نے مقرر کر دیا تھا۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو جانا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ قدرت نے کام کا جو موقع دیا تھا، جتنی صلاحیتیں عطا کی تھیں، جیسی دماغی اور قلبی قوتیں دی تھیں، اسے کس طرح خرچ کیا گیا، تو آج ہمارے سامنے ساری دنیا گواہی دے رہی ہے کہ ہماری وزیراعظم نے اپنی عمر کا ایک ایک منٹ ملک کے انتظام میں، خوشحالی میں، امن وسکون میں اور ملک کی سالمیت، ترقی اور نام آوری میں خرچ کیا ہے، اور جب وہ گئیں تو ہندوستان کی سیاسیات، معاشیات اور اقتصادیات کو ایک رخ پر ڈال گئیں۔ اس لیے ان کے بعد آنے والوں کو صرف اسے سنبھال کر رکھنا ہے اور اس مشینری سے کام لینا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ وہ بہت سے مسئلہ کو تشنہ اور نامکمل چھوڑ گئیں، دیکھنا ہے کہ ان کے جانشیں اسے کہاں تک مکمل کرتے ہیں۔ ایسے مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ دستور ہند کے ایمان داری سے نفاذ کا مسئلہ ہے کہ جس سیکولر اسپرٹ میں دستور ساز اسمبلی نے دستور کو مرتب کیا تھا، وہی اسپرٹ ہندوستانی زندگی میں پیدا ہو جائے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہوگا کہ یہاں تمام کے تمام مذاہب کا یکساں احترام کیا جانے لگے، تمام فرقے برابر کے حقوق پا جائیں، امن وامان کے لیے ملک کا

کوئی طبقہ ترستا نہ رہ جائے، ملک کے ہر باشندے کو یکساں مواقع ملنے لگیں۔مگر یہ بات ابھی ہندوستان میں دور دور تک نہیں ہے۔اگر ہے تو یکجہتی کانفرنس تک ہے، بعض وزرا اور ممبران کی مجلس تک ہے۔حکومت کے عملے تک نہیں پہنچی ہے، اس کے امن فورس تک نہیں پہنچی ہے اور نظام حکومت تک نہیں آئی ہے۔اگر ہندوستان کی سالمیت عزیز ہے تو اس سنگین صورت حال کو بدلنا پڑے گا اور دستور کو زندگی میں نافذ کرنا ہوگا۔اس طرح ہم وزیر اعظم کے چھوڑے ہوئے کاموں کو مکمل کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں، ورنہ صرف ماتمی لباس پہن کر ان کا حق نہیں ادا ہوسکتا۔

❑❑❑

ماخذ:'الریاض' گورینی۔۱۹۸۴ء

تعارف

دارالعلوم رحیمیہ، رگھولی، گھوسی، ضلع مئو (یوپی)

دارالعلوم رحیمیہ، رگھولی عارف باللہ حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی کی یادگار میں ۷؍شوال ۱۴۰۹ھ میں مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی اور مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کے ہاتھوں قائم کیا گیا۔ جس میں عربی، فارسی، حفظ، تجوید وقرأت اور درجات پرائمری کی معیاری تعلیم دی جاتی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک معیاری تعلیم کا انتظام ہے۔

شعبۂ جات مدرسہ

(۱) شعبہ حفظ (۲) شعبہ پرائمری (۳) درجات فوقانیہ (۴) درجات عالیہ (عربی فارسی) (۵) مطبخ (۶) ہائی اسکول طلبہ وطالبات (۷) انٹرمیڈیٹ طالبات کا انتظام (۸) منی آئی ٹی آئی (الف) کمپیوٹر آپریٹر کورس) (ب) ایرکنڈیشن میکینک کورس (ج) سلائی سرٹیفکٹ کورس

عزائم اور منصوبے

☆ بچوں اور بچیوں کے آنے جانے کے لئے سواری کا انتظام

☆ **دارالتحفیظ** کی تعمیر

☆ بچوں کے پڑھنے کے لئے جرنیٹر کا انتظام

شعبہ نشر واشاعت

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی ضلع مئو یوپی

9450536786-9839985670